عشاق کے قافلے

20

سی آر اسلم

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

نام کتاب	.....	سی آر اسلم
مصنف	.....	شاہ محمد مری
موضوع	.....	سوانح
پہلی اشاعت	.....	2007
دوسری اشاعت	.....	2017
تعداد	.....	1000
قیمت	.....	300 روپے
پبلشر	.....	سنگت اکیڈمی
فون نمبر	.....	03003829300

ملنے کا پتہ:

سنگت اکیڈمی

مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ۔

فون:+92-81-2843358

Email:editor@sangatacademy.net

Web: www.sangatacademy.net/books

انتساب

زندگی طویل کرنے کی تدابیر کرنے والوں کے نام

اے خدا از عاشقاں خوشنود باد

رومیؔ

فہرست

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ	7
پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ	10
جوان ہوتا ہوا کسان بچہ	15
مہد سے لحد تک	18
سعدیؒ کی سعادت	20
شعور کی دہلیز، یونیورسٹی	22
جہانِ صحافت	24
کانٹوں کا ہار، سیاست	26
سٹوڈنٹ لیڈر	36
ٹریڈ یونین اِسٹ	38
''اسلامی'' جمہوریہ پاکستان	43
سلسلۂ ہتھکڑیوں میں جُت جانے کا	48
روس چین قبائلی جھگڑا	57
ستر کی دَہائی، بڑی دَہائی	59
پاکستان سوشلسٹ پارٹی	66
ہمبوئیں سلام	72
ایس ایس او	75
کوہِ ہندوکش پہ روشنی	79
سید مطلّبی فرید آبادی	91
اَسی کی دہائی، پیچھے ہٹنے کی دہائی	119
رفیقۂ حیات، سنگت سعیدہ اسلم	129
مزید مکتوبات	131
تیسری سوشلسٹ کانفرنس	136
میری لاہور منتقلی	139
بے بخت کی نکسیر.....پُھوٹی	144
سی آر اسلم اور بلوچستان	150
تصانیف	171
نیکی کرنے والا انسان	181
دو ہم عصروں کے تاثرات	197
وہ باب' جو اَب چھپ نہیں سکتا	201
سی آر اسلم تندرست رہیے!!	204
حوالہ جات	204
ضمیمہ 1: سیاسی رپورٹ 1973	207
ضمیمہ 2: سیاسی رپورٹ 1986	231

دوسرے ایڈیشن (2017) کا پیش لفظ

اولین ایڈیشن کی اشاعت کے بعد کے دس برسوں میں اس پورے خطے میں بھیانک تبدیلیاں آئیں۔

سی آر اسلم کا وطن افغانستان کے ساتھ بچوں کا کھیل کھیلتے کھیلتے بالآخر خود بچوں کے غیض وغضب کا شکار ہوگیا۔ کھیل کھیل میں 70 ہزار افراد کی جانیں گنوائیں، علاقے برباد ہوئے، آئی ڈی پیز، اور Rehabilitation جیسے نئے نئے الفاظ اپنے عقب میں دہشتناک ابواب لیے ہماری ڈکشنریوں میں درآئے۔ گڈ اور بیڈ، سیف ہیونز، اور، ڈُومور جیسے الم غلم آتے گئے۔ مست ومولائی حکمرانوں کو ہوش اُس وقت آیا جب اُن کے اپنے بچے شناخت کر کر کے APS میں قتل عام کا شکار ہوئے۔ خانہ جنگی گلیوں محلوں سے ہوتے ہوئے دفتروں، ایئر بیسوں تک پہنچی۔

گوادر کا لفظ بھی سینکڑوں نئی اصطلاحات اور نئے ماتموں کے ساتھ ڈکشنریوں میں شامل ہوا۔ تیل گیس، سونا، مرمر، کوئلہ، ساحل، وسائل، سی پیک، کیکڑے، کتے، بلیاں۔۔۔ آگ اور خون کا کھیل جاری ہے۔ بربادی ہماری قسمت میں بہت گہری اور موٹی کندہ ہے۔

اُدھر ایک اور مظہر سامنے آگیا۔ اقتدار، فیوڈل دائیں بازو سے بڑھ کر اب کھلم کھلا

دائیں بازو کے پڑھے لکھے مڈل کلاس ملی ٹنٹ لوگوں کے حوالے ہو چکا ہے۔ عدالت، جرگہ، اور پنچایت سے باہر باہر ہجوم کی عدالتیں عام ہو چکی ہیں۔ ایسی عدالتیں اب سولائزیشن سے چھپے ہوئے گوشوں تک محدود نہ رہیں، بلکہ اب یہ یونیورسٹیوں تک کھلم کھلا ٹی وی کیمروں کے سامنے روزانہ کی بنیاد پر منعقد اور برپا ہوتی ہیں۔

دوسرا تماشا یہ ہوا کہ فوک کہانی کے عین مطابق پڑوسی افغانستان، وسطی ایشیا کے ممالک، اور گوادر کے تربوز پہ ''چرواہے نے پیشاب کر دیا''۔ یوں اب یہ نہ پنجشیریوں کا شغریوں اور بلنگوئریوں کے کھانے کا رہا، اور نہ ہی پنج آبیوں کے لیے سویٹ ڈش رہا۔

اُدھر عرب سپرنگ نے پورے مشرقِ وسطیٰ کو اکیسویں صدی والے بھیانک اسلحہ کا جنگجاہ بنا ڈالا اور فرقوی نفرتوں کے دونوں امینوں، سعودی وایران کو پتہ ہی نہ چلا کہ نہ صرف اُن کے کرایہ دار ممالک قیامتِ صغریٰ میں گھر گئے بلکہ پورا خطہ اب کیڑے پڑا ایسا مردہ جانور بن گیا جس کی بدبو سے اُس کا تباہ کنندہ مغرب، خود ناک میں رومال ٹھونس کر بے ناک ہو چکا ہے۔ سارا مغرب گوگول کا کردار ''بے ناک'' ہو چکا ہے۔

پھر، وہاں دیکھیں تو چین اور روس گئے تو تھے انسانی ایجنڈا گندی نالی میں پھینکنے، مگر خود ہی پھسل کر نالی میں گر گئے۔ اب تو انہیں سڑاند کا نشہ ہو گیا ہے۔

چنانچہ آج دنیا وہ نہ رہی جو پہلے تھی۔ اب یہ باقاعدہ مارا ماری اِستان بن چکی ہے۔ انسانی کراہیں سپر پاورز کے لیے لوریاں بن چکی ہیں۔ معاش، معیشت اور معاشرے بحران کے گڑھے کی تہہ میں ہیں۔ انسانیت ذلت کے پیندے پہ۔

مختصر یہ کہ انتہا ہو چکی ہے تنزل کی، گراوٹ کی۔ اب مزید پستی کی کوئی جگہ نہیں رہ گئی۔ لہذا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے!۔ انسان کو دوبارہ اوپر ابھرنا ہے۔ فزکس کا قانون ہے یہ۔ مگر اِس ابھرنے میں کتنی تباہی مزید ہوگی، کون ناپ سکتا ہے؟۔ کتنا عرصہ لگے گا کس کے پاس جانچنے کی جنتری ہے؟۔ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے جانور بنے انسان نے دوبارہ اشرف بننا ہے۔ لولاکیت کی ارفع گلی میں کسی نشئی، کسی بھتہ خور کی گنجائش نہیں۔

یہ بھل صفائی تو ہو کر رہے گی۔ رجعت اور اُس کے اڈوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی اب سرمایہ داریت کی چوکھٹ میں مزید نہیں سما سکتی۔ اس صفائی کی مزاحمت اور ہل جُل کرنے والا دوبار برباد ہوگا۔

انتظار اُن ساعتوں کا.....!!

شاہ محمد مری

چھ جولائی 2017

پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ

سی آر اسلم!۔۔۔۔ یہ نام ہی ہمارے خطے کی نظریاتی تاریخ کا مین گیٹ ہے۔ سی آر اسلم محنت کرنے والوں کی تحریک کے 70 برسوں کی تاریخ کا نام ہے۔ یہ نام اُس پورے دور کا گواہ ہے جب ہم انگریز کے غلام تھے، پھر فیوڈلزم اور بونا پارٹزم کا شکار۔ اسی دوران دو عالمی جنگیں ہوئیں، اِن جنگوں میں روس اور اس کے بعد بیس دیگر ممالک سوشلسٹ ہو گئے۔ تقسیم ہند ہوئی، میکارتھی ازم آیا اور سیٹو سنٹو کی ذہنیت معاشرے کی جڑوں میں بیٹھ گئی۔

جب ہم سی آر اسلم کی کہانی کے ورق الٹتے ہیں تو یہ نہ صرف پاکستانی محنت کشوں کی تاریخ ہے بلکہ افغانستان، ایران، یورپ اور ہندوستان کی انقلابی تحریکوں سے وابستہ تاریخ بھی ہے۔ طویل عمری اور ایک استقامت بھری جدوجہد دو بڑی نعمتیں ہیں جو سی آر اسلم کو حاصل رہیں۔ زود فہمی کی بے کراں صلاحیت اِن کے علاوہ تھی۔ منکسر المزاجی اور رفاقت نبھائے رکھنے کی خصلت اسے دلوں میں جگہ پانے کی نعمت عطا کرتی رہی۔ عجز اور خیر خواہی سوشلزم کے ساتھ اس کی وابستگی کو استقامت دینے کی ضامن بن گئیں۔

اِس پورے خطے میں بالعموم اور بالخصوص پاکستان کی آج تک کی سوشلسٹ تحریک کے ہر موڑ پہ سی آر اسلم کی باغبانی والے نشان موجود ہیں۔

سی آر اسلم سے میری واقفیت 1972ء میں ہوئی تھی ۔تب وہ لیڈر بنا اور میں اس کا ورکر۔مگر پھر فوراً ہی اس نے لیڈر کے بجائے استاد کا روپ دھار لیا۔اور اتنی ہی تیزی سے ہم دونوں ساتھی بن گئے ۔گو کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ پارٹی لیڈری سے ریٹائرمنٹ لے چکا تھا، اپنی بزرگ سنی کے باعث دوروں پہ آنے جانے کے قابل نہیں رہا تھا،خط و کتابت کچھ زیادہ نہ رہی تھی،۔۔۔۔۔مگر سچی بات یہ ہے کہ جسمانی طور پر دہائیوں پہلے بچھڑا ہوا سی آر آج بھی لیڈر ہے،آج بھی استاد ہے،آج بھی ساتھی ہے ۔اُس کی زندگی میں مجھے جب بھی کوئی بہانہ ہاتھ آتا میں لاہور چلا جاتا،علم کے اس آستانے کو تعظیم دیتا،اس کے پاس بیٹھتا اور اچھی باتوں سے جیبیں بھر کر لوٹتا۔

بشر دوستی کے واحد ایجنڈے پر رواں دواں ''عشاق کے قافلے'' میں سی آر اسلم اس لئے بہت درخشاں ہے کہ اس کی کمٹ منٹ غیر متزلزل ،بہت مسلسل اور بہت گہری رہی ہے ۔اس نے سوشلزم کو اپنی عادات کا حصہ،اپنی اخلاقیات کا منبع اور اپنی زندگی میں اوڑھنے بچھونے کا مقام دیے رکھا۔اور اس پورے عرصے میں نہ سرکار اُسے بہلا سکی نہ سردار اُسے پھسلا سکا،نہ انڈر گراؤنڈی نے اس کے پیر باندھے اور نہ گوریلا گیری سے وہ متاثر ہوا۔وہ نہ پیسے پہ جھکا نہ خوف سے رام ہوا اور نہ پوزیشن وعہدہ سے گمراہ ہوا۔وہ زندگی بھر اپنی متعین کردہ راہ پہ چلتا ہی رہا۔بانوے برس جی کر وہ ایشیا میں غالباً سینئر ترین کمیونسٹ تھا۔کاز کے ساتھ ایسی وفاداری،ایسی استواری بہت بے مثال ہے۔

بہت سوچ سمجھ کر ایک نظریہ اختیار کرنے کے بعد اس فلاسفر و دانشور نے ایک سیاسی پارٹی بنائی ۔اس کی آبیاری کی خاطر جیلیں کاٹیں،انڈر گراؤنڈ رہا،اسے سینچا سنوارا،اسے پانی دیا بڑا کیا اور بھرپور بلوغت پر پہنچا کر اسے آنے والی نسلوں کے حوالے کر دیا۔اور پھر بہت دور سے اس کی رکھوالی کرنے کیلئے اپنا بڑھاپا وقف کر دیا۔ایک مکمل جمہوری انداز،ایک مکمل شریفانہ طرزِ عمل.....

سی آر اسلم بہت محنتی سیاسی ورکر رہا۔اس نے خود کو بہت وسیع المطالعہ رکھا اور انسانوں کے ایک وسیع حلقے کو متاثر کیا۔پاکستان میں کسی بھی ''جمہوری'' ادارے کی تشکیل و تنظیم کاری میں سی آر کی کاوش ضرور نظر آئے گی.....خواہ مزدوروں کی مترقی تنظیم ہو،کسان کمیٹی ہو،طلباء کی جماعت ہو،وکیلوں ادیبوں کی تنظیمیں ہوں ، یا عورتوں کی جمہوری عوامی تنظیم،سی آر ہی موسس ملے

گا۔آبادی کی اکثریت کی نمائندہ ان تنظیموں کی اخلاقیات،ان کے رویے،انکا طرزِ عمل سی آر اسلم کی عطا کردہ ہے۔

اسی طرح وہ کمیونسٹ نظریے کا ایشیا میں بلا مبالغہ سب سے بڑا مفسر و مبلغ تھا۔اس کی تحریریں اکٹھی کی جائیں تو جلدوں کی جلدیں تیار ہوں گی۔ٹام پین کی مانند وہ عام فہم انداز کی باتیں کرتا رہتا تھا،عام فہم زبان میں لکھتا رہتا تھا۔عام لوگ ہی اُس کا مخاطب تھے۔اُس کے باوجود کہ اس کے موضوعات ہمیشہ معیشت اور فلسفہ جیسے ثقیل شعبے رہے مگر اسے پڑھنے سمجھنے میں کسی لغت کسی ڈکشنری کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

چوہدری صاحب کمیونسٹ صحافت کا بھی مشاق ترین سپاہی رہا۔سرکار بڑھ بڑھ کر اس کے اخبار بند کرتی رہی اور سی آر بھیس بدل بدل کر نیا اخبار نکالتا رہا۔اس کی تحریریں کمیونسٹ اخلاقیات کی عکاس ہیں۔کوئی بڑے بول نہیں،کوئی ذاتیات نہیں،کوئی بلیک میلنگ نہیں،کوئی انتقامی کنکر بازی نہیں.....۔

لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ اپنی طبقاتی سیاست کے معیار کی مطابقت میں ہوتا تھا۔سی آر کی دوستیاں اور مخالفتیں ہمہ وقت اپنے کاز اور اپنے نصب العین کی بنیاد پر رہیں۔جب بھی اُسے لگا کہ کسی عزیز ترین دوست کے ساتھ مدبھیڑ اس کا فریضہ بن گیا تو پھر سی آر نے بھرپور حملے کے لیے اپنے دلائل کے سارے ہتھیار استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہ کیا۔سنجیدہ عالمانہ طریقوں،بالغ نظر نظریاتی تربیت،عمدہ ترین جدلیات کے بھاری مکّے ،مزاح کی تلواریں۔۔۔۔۔مگر ہمیشہ مدنظر رکھا کہ اُس مناقشے میں کوئی ہلکا پن نہ آئے ،کوئی ذاتیات شامل نہ ہو،کوئی جوابی کارروائی نہ ہو۔

ہمارا یہ ممدوح دوستیاں پالنے والا شخص رہا۔قابل بھروسہ دوست ،جاں نثار رفیق اور ملنسار انسان۔وہ ہزاروں شاگرد رکھتا تھا مگر اُس نے کبھی کسی کو خود سے چھوٹا،کم علم یا کم مرتبہ نہیں سمجھا۔وہ برابری اور جمہوری انداز میں بحثیں کرتا تھا،دلائل سنتا سناتا تھا اور سمجھتا سمجھاتا تھا۔وعدہ نبھاتا تھا۔سچ بولتا تھا،مدد کرتا تھا،ہمدردی کرتا تھا،نیکی کرتا تھا.....اور کر کے بھول جاتا تھا۔

ہم اچھے ہیں کہ جمہوری رویے کے دور میں، رفاقت ، کمٹ منٹ ، نیک نیتی ، سیکھنے سکھانے ، وفا.....یعنی سی آر اسلم کے دور میں جیے اور اس پر لکھتے بولتے رہے۔

یہ کتاب کئی سالوں سے ماہتاک ''سنگت'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی تھی ۔تا کہ حقائق جمع کرنے میں ،اور اسے زیادہ سے زیادہ جامع بنانے میں وقت مل سکے۔میرا ارادہ اس پہ ایک ضخیم کتاب لکھنے کا تھا ۔ بالخصوص اُس کے رفقا کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا ارادہ تھا۔مگر چونکہ اس چھوٹی سی کتاب پہ ہی چھ سات سال لگ گئے تو بڑی کتاب کتنے مزید برسوں کا تقاضا کرتی ۔اس لیے فی الحال یہی کچھ حاضر ہے۔دوسرے ایڈیشن کا موقع ملا تو اپنی خواہش پوری کر پاؤں گا۔ وگرنہ کاروان کا کوئی دوسرا سپاہی میرا یہ ارمان مکمل کر دے گا۔

میں اپنے دیرینہ رفیق جناب اسلم اعوان (اسلم ریڈیو) کا شکر گزار ہوں کہ اس نے کئی برس قبل پرانے عوامی جمہوریت، پارس اور آفاق کی جلدیں میرے حوالے کیں۔اس کے علاوہ سی آر اسلم صاحب کی لکھی ہوئی تمام کتابیں، پمفلٹ ،لیفلٹ اور کتابچے بھی سنبھال کر رکھے تھے۔جن سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ ملک اسلم اور محمد علی بھارا کتاب کے جلد چھاپنے پہ زور دیتے رہے۔ اُن کے ہمہ وقت اصرار نے اِسے کتابی شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔لاہور کے حمید (شاستری) کا شکریہ کہ اس نے ٹائٹل بنایا۔ وجاہت مسعود اور تنویر جہاں کی مہربانی کہ کتاب کی اشاعت کے آخری مراحل کی نگرانی میں ان کا بڑا عمل دخل ہے۔زاہد حسن مذکر مونث کی غلطیاں درست کرنے والے میرے نئے دوست ہیں۔

ملک الموت کو نہیں کوسوں گا کہ میں خود یہ تیار کتاب چوہدری صاحب کی زندگی میں نہ چھاپ سکا، اِس موقع پرستی میں کہ ان کے کچھ اور احباب کا تذکرہ شامل رہے۔اور مجھے پتہ چل گیا کہ لفظ ''ہے'' کو ''تھا'' سے بدل ڈالنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری

کوئٹہ، چھ جولائی 2007

سی آر اسلم

جوان ہوتا ہوا کسان بچہ

گرو نانک کا ھم وطن

سی آر اسلم ضلع شیخوپورہ کے شاہ کوٹ نامی قصبہ سے چار میل دور ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ سکول سرٹیفکیٹ میں اس کی تاریخ پیدائش 15 جنوری 1915 لکھی گئی ہے لیکن اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ ڈیڑھ دو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد کاشتکار تھا۔ اور ہندوستان والے پنجاب سے اُس وقت یہاں آیا تھا جب انگریزوں نے یہاں نہریں بنائیں۔ پہلی نہر لوئر چناب کی تھی جو 1890ء میں بنی۔ اسی پہ اُس کے والد کو 1898ء میں زمین ملی تھی اور وہ جلندھر سے شاہ کوٹ کے گاؤں کوٹ نظام دین آیا۔

سی آر اسلم کے والد کا نام حاجی محمد اولیا تھا۔ وہ پرائمری تک پڑھا ہوا تھا۔ کوٹ نظام دین میں ان کی پچیس ایکڑ زمین تھی جس پر حاجی صاحب کاشتکاری کرتا تھا۔ چودھری صاحب کی والدہ کا نام جیونڑیں تھا جو کہ مشرقی پنجاب کی رہنے والی تھی۔ وہ ناظرہ قرآن کے علاوہ اور کچھ پڑھی لکھی نہ تھی۔ (پتہ نہیں، سماجی شعور کا ڈگریوں والے علم سے کتنا تعلق ہوتا ہے!!)

سی آر اسلم کے تین بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن رحمت بی بی 1899ء میں پیدا ہوئی اور سو برس عمر پا کر 1999ء میں فوت ہوگئی۔ وہ گاؤں میں رہتی تھی۔ ایک اور بہن کا

نام میں نوٹ نہ کر سکا۔ بقیہ تین بہنوں کے نام بالترتیب زینب بی بی، ثریا بی بی اور ہاجرہ بی بی تھے۔ اب اس کی ساری بہنوں میں سے کوئی بھی حیات نہیں ہے۔

اس کے تین بھائیوں میں سب سے بڑے کا نام عنایت اللہ تھا، پھر حبیب اللہ تھا اور اس کے بعد سی آر صاحب خود تھا۔ اُس کا اصلی نام رحمت اللہ تھا۔ یہ تینوں نام ان کے خاندانی پیر نے رکھے تھے۔ پھر جب پیر فوت ہوگیا تو چوتھے بھائی کا نام سی آر کی والدہ نے خود رکھا، محمد حسین۔

اُس کے نام کی رحمت اللہ سے سی آر اسلم میں تبدیلی کے بارے میں پاکستان بھر میں اس کے دوستوں، شاگردوں، ساتھیوں اور پیروکاروں میں زبردست دلچسپی پائی جاتی ہے۔ بہت سے رومانی قصے، بہت سی قیاس آرائیاں رہی ہیں اس تبدیلی سے متعلق۔ اصل بات یہ ہے کہ ''سی'' سے چودھری بنتا ہے۔ ''آر'' رحمت اللہ کا نشان ہے۔ ''اسلم'' البتہ بہت دیر تک معمہ بنا رہا۔ تو اُس کی صورت یہ ہے کہ سی آر نے ایک زمانے میں شاعری شروع کی تھی۔ اردو شاعری کے لئے تخلص اس قدر ضروری ہوتا ہے جس قدر کہ درہِ بولان میں ٹرک کے ساتھ کلینر ضروری ہوتا ہے۔ سی آر چونکہ عمر بھر غالب کا دلدادہ رہا اس لیے وہ غالب کے وزن پہ تخلص رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی وزن پہ دو سلیبل والا ''اسلم'' تخلص رکھا۔ یوں وہ ہوا سی۔ آر۔ اسلم ۔۔۔۔۔۔ شاعری میں شہرت تو ہم نے نہ دیکھی البتہ نام اس کا پکا ہوا۔ (شاعری مارکس نے بھی کی تھی، ماؤزے تنگ نے بھی اور انکل ہو چی منہ نے بھی)۔

اس کا گہرا دوست اور ہمارا بابا، میر غوث بخش بزنجو اُسے صرف اسلم ہی کہتا تھا۔ بابا بزنجو کے علاوہ قیام پاکستان سے پہلے کے اس کے ساتھی ہرکشن سنگھ سرجیت اور محترمہ طاہرہ مظہر علی خان بھی اسے ''اسلم'' ہی پکارتے تھے۔ دوست اُسے صرف چودھری کہہ کر پکارتے تھے، کوئی سابقہ لاحقہ نہیں۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو خود کو اس پالیوشن سے بچائے رکھتے ہیں۔ پھر بھی چودھری صاحب کو اس طہارت پہ ''ماحولیات والے'' انعام نہ دیں تو یہ اُن کی کنجوسی ہے۔ چنانچہ سی آر اسلم نہ چیئرمین کہلایا، نہ معمر رہنما، نہ بزرگ سیاستدان۔ وہ نہ گریٹ لیڈر ہوا اور نہ ہی گریٹ ٹیچر۔ بس سی آر اسلم، یا چودھری صاحب۔ میاں محمود تو اس کے نام کا آخری ''صاحب'' بھی چرا لیتا تھا۔ صرف

چودھری بولتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اس بغیر زین پلھانٹر کے چودھری کے ساتھ ''جی'' کا اضافہ کر کے اپنے تئیں تلافی کر جاتا تھا۔مگر سی آر ان باتوں سے بہت بلند اور بے پرواہ ہی رہا۔حتیٰ کہ کامریڈ تک نہ کہلوایا جو ہر لحاظ سے اس کا استحقاق تھا۔

سی آر اسلم کے بھائی بہنوں میں سوائے اُس کے اپنے' کوئی اور سیاست کی طرف نہ گیا۔اسی طرح سوائے اُس کے، باقی سارے بہن بھائی حاجی بن گئے۔اس کا ایک بھائی حبیب اللہ سلیم وائسرائے سیکریٹریٹ میں تھا، پہلے اسسٹنٹ سیکرٹری پھر ڈپٹی سیکرٹری فارن آفس اور پھر سیکرٹری فارن آفس ہو گیا۔ پاکستان بنا تو وہ کراچی میں فارن آفس میں بحیثیت سیکرٹری متعین تھا۔ ریٹائر ہو کر وہیں کراچی میں رہا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔اس کی اولاد بھی وہیں کراچی میں ہے۔ ایک بیٹا امریکہ میں ہے، دوسرا بیٹا' منان لیاقت نیشنل ہسپتال کراچی میں فزیشن ہوا کرتا تھا۔

اس کا دوسرا بھائی حافظ عنایت اللہ لاہور میں ٹیچر تھا۔سی آر اسلم اپنے اسی بھائی کی بدولت لاء کرنے لاہور آ سکا تھا۔ وہ بھی وفات پا چکا ہے۔سی آر سے چھوٹا بھائی ڈاکٹر محمد حسین قمر لاہور میں رہتا ہے۔ وہ فوج میں تھا او دوسری جنگ عظیم میں بقول چودھری صاحب ''روس فتح کرنے'' گیا تھا۔ یہی وہ جنگ تھی جس میں دوسرا بھائی یعنی سی آر اسلم روس کے ساتھ کھڑا تھا۔ (نظریات بھائی کو بھائی کے خلاف کھڑا کرنے کی بڑی توانائی رکھتے ہیں)۔مگر اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب ہمیشہ چوہدری صاحب کا خیال رکھتا تھا۔ وہ اُس کا حامی اور مددگار رہا۔

علم کا طالب، مہد سے لحد تک

چودھری صاحب کے اپنے گاؤں میں سکول نہیں تھا۔سکول ساتھ والے گاؤں میں تھا۔اس گاؤں کا نام نظام پورہ تھا مگر لوگ اسے ''نکودر'' کہتے تھے۔ وہ پیدل وہاں جاتا تھا کچی پہلی پڑھنے کے لئے۔سکول کا ایک واقعہ وہ ہمیشہ سنایا کرتا تھا کہ انگریز ڈپٹی کمشنر سکول کے دورے کیلئے آیا۔اس نے طلبہ سے پوچھا کہ کیا سکول میں کوئی کھیل بھی کھیلا جاتا ہے؟۔جواب نفی میں ملنے پر اس نے ہدایت کی کہ فٹ بال کھیلنے کا انتظام کیا جائے۔۔۔۔سی آر کو اسی زمانے سے فٹ بال کھیلنے کی ایسی عادت پڑی کہ پھر بعد میں وہ گاؤں کی گلیوں میں بھی ننگے پاؤں فٹ بال کھیلا کرتا۔(1)

پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ ''مڈل سکول شاہ کوٹ'' میں داخل ہوا۔ وہ پیدل چار میل سفر کر کے سکول جاتا تھا۔اسی مڈل سکول سے اُس نے آٹھ جماعتیں پاس کر لیں اور پھر میٹرک کے لئے ''گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ ہل'' میں داخل ہو گیا۔ جہاں وہ بورڈنگ ہاؤس یعنی ہوسٹل میں رہتا تھا۔یہیں اُسے محمد اقبال نامی استاد اور نیم شہری ادیبوں سے آس پاس کی دنیا، اس کے متعلق خبروں اور سیاسی حالات کی شُد بُد ہوئی۔ یہ اس کے تازہ بہ تازہ ذہن میں نظریہ کی اولین تخم ریزی تھی۔اس نے 1930ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔

سی آر اسلم جب بھی لڑکپن کی بات کرتا تو خود کو خاصا بے ضرر بچہ قرار دیتا تھا۔ایسا بچہ جو ماں

باپ کا کہا مانتا ہو اور جسے بہت کم ڈانٹ پڑتی ہو۔

یہی وہ زمانہ تھا جب 1929ء میں سرمایہ داری نظام میں زائد پیداوار کا بحران شروع ہوا تھا اور 1930ء تک یہ بحران ساری دنیا پر چھا گیا۔ کارخانے بند ہو گئے، مزدور بیکار ہو گئے اور تجارت ٹھپ ہو گئی۔ 1933، 34 میں امریکہ، جرمنی اور اٹلی میں بے روزگاری کے خاتمے جیسے نعروں کے تحت نئی قیادتیں برسر اقتدار آئی تھیں۔

ہندوستان سمیت سرمایہ داری سے وابستہ ساری دنیا بری طرح اس بحران کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس بحران کی سب سے بڑی زد کاشتکاروں پر پڑی۔ زرعی اجناس کی قیمتیں گر گئیں۔ ہندوستان میں گندم کا بھاؤ ایک روپیہ فی من کی حد تک گر گیا۔ کاشتکار زرعی اجناس فروخت کر کے برٹش گورنمنٹ کا مالیہ تک ادا نہ کر سکتے تھے۔ وہ اس مالیہ کی ادائیگی کے لیے ساہوکار کے ہاں اپنی زمین گروی رکھ کر قرضہ لینے پر مجبور تھے۔

اسی بحران کے تھپیڑے حاجی محمد اولیا کے خاندان پہ بھی پڑے۔ اس کے دو بڑے بیٹے اس وقت لاہور کالج میں پڑھ رہے تھے۔ کاشتکار باپ نے دونوں بیٹوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے اور سرکار کا مالیہ ادا کرنے کے لئے ساہوکاروں سے قرضہ لیا اور اپنی محبوب زمین کا کچھ حصہ گروی رکھا۔ سی آر اسلم کی مہربان مگر مجبور ماں نے اسے کاشتکاری میں باپ کا ہاتھ بٹانے کے تلخ احکامات دے دیے۔ اس امید بھرے وعدے پہ کہ جب پیسے کی دیوی مہربان ہو گی اور مالی حالات سدھر جائیں گے تو تمہیں کالج میں داخل کرا دیں گے۔

سعدیؒ کی سعادت

اس طرح یہ کم سن نوجوان اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر عملاً کسان بن گیا اور فصلات کی کاشت اور دیکھ بھال میں والد کا ہاتھ بٹانے لگ گیا۔ وہ اس زمانے میں ''کہوئی'' نامی گندم کاشت کرتے تھے۔ سی آر اسلم اپنی زندگی کے آخر تک آج کے ترقی یافتہ بیج پر اسی دیسی گندم کو ترجیح دیتا رہا۔ اسی زمانے میں وہ ''کاٹھا'' نامی گنا کاشت کرتے تھے۔ جس میں بقول چودھری صاحب مٹھاس آج کے گنے سے کئی گنا زیادہ ہوا کرتی تھی۔ وہی ان کی زمین کے لئے موزوں ہوتا تھا۔ اب تو ملٹی نیشنل کے ہیڈ ماسٹر نے ڈنڈے کے زور سے ہماری زمینوں کو ''کان پکڑو'' کرایا ہوا ہے اور ہمیں زبردستی پکی کچی فصلات اگوانے پہ لگایا ہوا ہے۔ اور یوں حاصل کردہ پیداوار کسی بیکار مصنف کے ناولوں کی طرح مقدار میں تو بہت زیادہ ہو چکی ہے مگر ان میں عقل بدھ، مغز، قوت اور ذائقہ نام تک نہیں ہوتا۔ زمین کی کوکھ سکرات میں پڑ جاتی ہے، ماحولیات سکتہ میں ہے اور زہر ہمارے رگ و خوں میں سرایت کر چکی ہے۔

اس کسان بچے کو البتہ پڑھنے کا جنون تھا۔ گھر میں بھائیوں کی چند کتابیں انگریزی میں موجود تھیں۔ کاشتکاری میں سے فرصت کے وقت وہ ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ انہی کتابوں میں تفکر و دانش کے امام حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی معرکتہ الآرا کتاب ''گلستان'' بھی تھی۔ اس آفاقی

شہرت رکھنے والی کتاب کی تعریفیں تو ایشیاء کے ہر دیہات میں کی جاتی تھیں اور اب بھی ہر اچھا باپ اپنی اولاد سے سعدی کے ساتھ دوستی لگانے کی آرزو رکھتا ہے۔

سی آر اسلم کے گاؤں سے ایک میل دور دوسرے گاؤں میں ایک معلم بچوں کو فارسی پڑھاتا تھا۔ اپنی والدہ سے اجازت لے کر سی آر بھی ہر روز صبح کے وقت اس گاؤں جاتا تھا، گلستان پڑھنے۔ گلستان اس لائق ہے بھی کہ اس کی خاطر ایک میل پیدل جایا جائے اور ایک میل کی واپسی والی مسافت طے کی جائے۔ سردی ہو یا گرمی حضرت سعدی کا یہ شیدائی دوسرے گاؤں جاتا اور گلستان پڑھتا۔ چودھری صاحب نے سعدی کی دوسری عظیم کتاب ''بوستان'' بھی پڑھ لی۔ اور جس نے گلستان و بوستان اس کشٹ و توجہ سے پڑھ رکھے ہوں وہ عالم تو ہوگا ہی!! ۔ سی آر فارسی بولنے بھی لگا اور لکھنے بھی۔ مجھے یاد ہے کہ موت سے چند روز قبل بھی گلستان بوستان کا نام سنتے ہی اس کی بوڑھی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ وہ گلستانِ سعدی کو ایک عظیم اور شاندار کتاب گردانتا تھا جو فارسی نثر کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ سعدی نے مختصر حکایات کی شکل میں اپنی سیاحت، تجربات اور مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ نثر کی روانی میں جا بجا موزوں اشعار جڑے ہیں جو تحریر کا حسن دوبالا کر دیتے ہیں۔ سی آر کے بقول ایک ایک لفظ امر ہو گیا ہے سعدی کا' اور رہتی دنیا تک انسان اس سے فیض حاصل کرتا رہے گا۔

سی آر اسلم نے فیض کے اس چشمے تک عبدالحکیم نامی استاد کے ذریعے رسائی حاصل کی تھی۔ (میرے ماوند والے عبدالحکیم کا نام عبدالکریم تھا۔ سی آر ''حکیم'' کا مرید تھا تو میں ''کریم'' کا۔

شعور کی دہلیز، یونیورسٹی

سی آر اسلم نے اپنے اس شفیق استاد عبدالحکیم ہی کے کہنے پر منشی فاضل کا امتحان دینے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے لاہور کے ایک کتب فروش سے منشی فاضل کے کورس کی کتابیں منگوالیں اور زبردست انداز میں پڑھائی شروع کر دی۔

سی آر اسلم بہت اچھا ریڈر رہا۔ وہ بہت جلد اور بہت آسانی کے ساتھ بات کے مغز کو پہنچ جاتا تھا اور پھر اسی بات کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ اپنے انداز میں بیان بھی کر سکتا تھا۔

اس نے 1931ء میں منشی فاضل کا امتحان دیدیا۔ اس امتحان میں سی آر اسلم سب سے کم عمر امیدوار تھا۔ اس نے اچھے نمبروں سے منشی فاضل پاس کر لیا۔

بالکل اسی طریقے سے اس نے ایف اے انگلش کی کتابیں منگوالیں، خوب جی لگا کر انہیں پڑھا اور زبردست تیاری کے ساتھ 1932 میں ایف اے پاس کر لیا۔ علم کے لیے موجیں مارتی طلب سے حصولِ علم کے راستے میں موجود سارے بند ٹوٹتے گئے اور علم کا یہ پیاسا جام پہ جام پیتا رہا۔ 1934 میں سی آر اسلم نے بی اے انگلش کا امتحان پاس کر لیا۔

علم کا دیوتا آگے یوں اُس پہ مہربان ہو گیا کہ اس کے بڑے بھائی کو لاہور کے ایک ہائی سکول میں انگلش ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ اس نے بھائی کو بھی لاہور بلوالیا اور یونیورسٹی لاء کالج میں

داخل کروادیا۔ اس طرح سی آر اسلم 1936 میں ایل ایل بی پاس کر کے وکیل بن گیا۔ اسی وکالت نے عمر بھر اس کا پیشہ بننا تھا' روٹی مہیا کرنا تھی اور سیاست کی بھاگ دوڑ کا کرایہ خرچہ دینا تھا۔ یہیں پہ حمید نظامی سے دوستی ہوئی جو کہ گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ ہل میں اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا اور اِن دنوں اسلامیہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی وساطت سے عبدالستار نیازی، معراج خالد اور دیگر دوستوں سے شناسائی پیدا ہوئی جو کہ اسلامیہ کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے سامنے واقع عرب ہوٹل ادبی حلقوں کی بیٹھک کی جگہ تھی۔

جہانِ صحافت

چودھری جی وکیل تو بن گیا مگر مقدروں نے صحافت کی زندگی بھی اس کے منور ماتھے پہ لکھ دی تھی۔ ہوا یوں کہ انہی دنوں چودھری صاحب کا ایک استاد ملک چراغ دین محکمہ تعلیم کی ملازمت ترک کر کے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے لاہور آفس کا انچارج بنا تھا۔ اس استاد کو چونکہ یہ علم تھا کہ بالآخر سی آر اسلم کو سیاست ہی کرنی ہے اس لئے اس نے سی آر کو سمجھایا کہ سیاست کے لئے صحافت کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ اُس کے کہنے پر سی آر اسلم نے اُس ادارے میں کام کرنا شروع کیا۔ گو کہ یہ کام تھوڑی دیر تک ہی جاری رہا۔

اس دور میں ''احسان'' نامی اخبار نکلنا شروع ہوا۔ سی آر اسلم اور اس کے دوست حمید نظامی اس میں لکھنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنا اخبار نکالا جائے۔ (2) چنانچہ انہوں نے ایک ہفت روزہ کا ڈکلیریشن لے لیا۔ اُس وقت تک وہ کمیونسٹ نہ تھا صرف ترقی پسند تھا۔ علامہ اقبال کی حد تک جو کہ اس زمانے میں نوجوانوں کو کمیونزم کی طرف دھکیلنے کا پہلا زینہ تھا۔ (کتنا دلچسپ ہے کہ ماما عبداللہ جان جمالدینی، ڈاکٹر خدائے داد اور سائیں کمال خان شیرانی سے لے کر سی آر اسلم تک میرے تمام اساتذہ علامہ اقبال سے متاثر تھے۔

چنانچہ چودھری صاحب نے اقبال کی ''بانگِ درا'' ٹٹولی اور اس میں سے ''نوائے

وقت'' کا نام منتخب کر کے اپنے ہفت روزہ پر رکھ لیا۔ سی آر اسلم کا کہنا ہے کہ وہ خود ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا اور ہفت روزہ اخبار ''نوائے وقت'' کا اپنے نام سے ڈکلیریشن لے لیا۔ مگر اتنے سچے سُچے لوگ تھے کہ ''نوائے وقت'' کا نام استعمال کرنے کی اجازت کے لئے دونوں دوست علامہ اقبال کے پاس گئے اور اُس کی اجازت کے بعد ہی بیڈن روڈ سے اخبار جاری کر دیا۔

انہوں نے اخبار کا پہلا پرچہ علامہ کو پیش بھی کیا۔ علامہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا مجھے ہر ہفتے بھیجا کرو، میں آرا دیتا رہوں گا۔(3)

کانٹوں کا ہار، سیاست

یاغستان

سی آر اسلم اور حمید نظامی نے دو سال تک اس ہفت روزہ کو چلایا۔ یہ اُن کی جوانی کا عجیب رومانٹک دور تھا۔ ریلوے روڈ پر واقع دو کمروں پر مشتمل دفتر کا نام فکرِ اقبال نے ''یاغستان'' رکھوا دیا تھا۔ یہاں میاں شفیع (م ش) آتا تھا، عبدالستار نیازی آتا تھا، ڈاکٹر مبشر حسن کا بھائی ڈاکٹر شبر آتا تھا۔ الغرض یہ ادیبوں، شاعروں، اور دانشوروں کے اکٹھ، اجتماع، اور مباحثہ کا اڈہ تھا، بورڈ لگا تھا: ''یاغستان''۔

یاغستان کرائے کی جگہ تھی۔ یار دوست دو دو، چار چار روپے آپس میں جمع کر کے ادا کیا کرتے تھے۔ بلوچستان میں لٹ خانہ تحریک والے بھی یہی کام کیا کرتے تھے اور ایسے ہی منتشر ہونا تھا اُس نے بھی۔

دونوں دوستوں کو لکھنے کا جنون تھا۔ نشانہ انگریزی سرکار ہوا کرتی تھی۔

کیا موجوں، پھلانگوں اور چھلاووں کا زمانہ رہا ہوگا وہ!

یوں 1936۔37 تک حمید نظامی سے مل کر وہ نوائے وقت چلاتا رہا۔ مگر نظامی، اقبال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فکرِ اقبال جس کو چپک گیا، وہ اُس سے بہ مشکل ہی جان چھڑا سکا۔ چنانچہ نظامی

صاحب کو ''مجاہد، مومن، خودی، کاشغر، سارا جہاں ہمارا، اور شاہین'' جیسی اصطلاحاتِ اقبال نے میجک سٹون کی طرح جکڑے رکھا۔ اقبال کی روشن فکری ایک خاص حد تک جا کر ہنگامی بریکیں لگاتی ہے اور وہ انسانی ارتقاء کے راستے پر ناقابل عبور رکاوٹ بن جاتا ہے۔

مگر سی آر خوش قسمت نکلا کہ اُس نے یہ زنجیریں چھناکے کے ساتھ توڑ دیں اور وہ اقبال کی شاعری کے ترقی پسند حصے کو سمیٹے آگے بڑھتا گیا۔ اس نظریاتی و سیاسی اختلافات نے بالآخر دونوں کی صحافتی جوڑی توڑ ڈالی اور سی آر اسلم نے پرچہ نظامی کے حوالے کر دیا۔ جس نے پرچے کو ڈیلی بنا دیا تھا اور خود کو مسلم لیگ کے گڑھے میں پایا۔ اُس کے بعد تو فرشتے نے بعد میں زندگی بھر کیلئے سی آر اسلم اور نوائے وقت کی حتمی، مستقل اور تلخ لڑائی لکھ دی تھی۔ ایک شخص روشن خیالی، جمہوریت، آزادیِ نسواں اور سوشلزم گاتا رہا اور دوسرا کوڑے، جیلیں، شاہی قلعے، رجعت اور ضیاء الحق بڑبڑاتا رہا۔

بین الاقوامی سیاست میں یہ ایک بہت بھیانک دور تھا۔ 1934ء میں دنیا کے اندر ایک زبردست تبدیلی آئی۔ جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آیا۔ ٹوتھ برش جیسی مونچھوں اور سواستیکا کے نشان کی علامت والا یہ ڈکٹیٹر اصل میں ایک غیر ماہر مزدور تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں حصہ لینے کے بعد معمولی درجے کا جاسوس بنا اور سیاسی پارٹیوں کی جاسوسی کرتا کرتا خود نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز (نازی) پارٹی میں شامل ہوا۔ اس دائیں بازو کی پارٹی کو مضبوط کرتے کرتے 1933ء میں وہ جرمنی کا چانسلر بن گیا۔ اور پہلا وار اس نے کمیونسٹوں پر کر دیا۔ انہیں غیر قانونی قرار دے کر اگلے الیکشن میں واضح اکثریت حاصل کر لی اور صدر اور چانسلر دونوں عہدوں کو اکٹھا کر کے ان پہ براجماں ہوا۔ آریائی نسل کی برتری کو اپنا ہتھیار بنا کر اس نے کمیونسٹوں اور یہودیوں کی بھیانک پٹائی شروع کر دی۔ اُدھر اٹلی میں اُس سے ایک سال پہلے ہی اس کا ایک اور بھائی بند اقتدار ہتھیا چکا تھا۔ یہ مسولینی تھا، اور اس کی بھی رگ رگ میں کمیونسٹ دشمنی بھری تھی اور اس نے بھی مخالفوں کے قتلِ عام میں ذرا بھی پس وپیش نہ کیا تھا۔

اس نئی صورتحال کے بارے میں دنیا بھر میں دانشوروں میں بحثیں شروع ہو گئیں۔

اس زمانے میں لاہور شہر میں یہ بحث مباحثے عرب ہوٹل میں ہوا کرتے تھے۔ جہاں چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری اور دیگر کئی عالم فاضل لوگ آ کر بیٹھتے تھے، وہیں پہ شعر و شاعری کی محفلیں سجتیں، سیاسی موضوعات چھڑتے اور فلسفہ پہ بحث و مباحثے ہوتے۔

یہیں پہلی بار سی آر اسلم نے فاشزم کا نام سنا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ فاشزم سرمایہ داری کے ارتقاء کی اگلی سطح ہے، کچھ کہتے تھے کہ نہیں، یہ ملٹری سرمایہ داری ہے اور سرمایہ داری اپنی آخری منزل تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے بعد سوشلزم آئے گا۔ گویا سی آر اسلم اب اپنی زندگانی کے فیصلے کن موڑ پہ پہنچ چکا تھا۔ فاشزم اور سوشلزم کی بحثیں اُسے ''زندگی بھر کا اپنا آئندہ کا لائحہ عمل'' متعین کرنے میں زبردست طور پر مدد دے رہی تھیں۔

ایک اور واقعہ نے بھی سی آر اسلم کے شعوری ارتقاء پر زبردست اثر ڈالا۔ ایشیا بھر کے دانشوروں پہ سب سے زیادہ اثر ڈالنے والا یہ واقعہ 1936ء میں یورپ میں رونما ہوا۔ ہوا یوں کہ 1936ء میں سپین میں الیکشن ہوئے جن میں سوشلسٹ پارٹی جیت گئی۔ اور اس کی حکومت بن گئی۔ مگر، ہٹلر اور مسولینی نے سپین میں سوشلسٹ پارٹی کی اس جیت کو فاشزم کی شکست گردانا۔ انہوں نے سوشلسٹ حکومت کے خاتمے کے لئے سپین کے ایک فوجی افسر جنرل فرانکو کو سپین پہ حملہ کر کے اس سوشلسٹ حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے اکسایا۔ ان کا یہ نظریاتی کزن، سپین کی شمالی افریقہ کی ایک نوآبادی میں متعین تھا۔ دونوں حکومتوں نے دبا کر اس کی مالی مدد کی، اسلحہ اسکے منہ، ناک اور کانوں میں ٹھونسا، اور اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ چنانچہ وہ فوج لے کر آ گیا اور سپین پر حملہ کر دیا۔ طویل خانہ جنگی میں سپین بلوچستان بنا۔ دھرتی 'خون سے لت پت ہو گئی۔

اس حملے نے یورپ بھر کے دانشوروں کو چونکا دیا۔ اُن دانشوروں میں آئن سٹائن (سائنس دان) تھا' جیومیٹری کے زاویوں کے ذریعے خانہ جنگی کی تباہ کاریوں پر شدید طنز کرنے والا مصور پکاسو تھا۔ نوبل انعام یافتہ ناول نگار رومن رولاں تھا، برلبِ مرگ سرمایہ داری کے کھوکھلا پن پہ ڈھیر ساری کتابیں لکھنے والا کرسٹوفر کاڈویل تھا، فاکس تھا جان کارن فورڈ تھا، نوبل انعام یافتہ امریکی ناول نگار ہیمنگوے تھا' جارج آرویل اور پبلو نرودا تھے۔

ان سب نے آئین سٹائن کی پہل کاری میں ایک کانفرنس بلائی۔اس کانفرنس نے دنیا کے سارے دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ امن' آزادی' جمہوریت اور سوشلزم کو بچانے کے لئے ایک بین الاقوامی بریگیڈ بنالیں اور سپین کی سوشلسٹ حکومت کو فاشزم کے خونی پنجوں سے بچانے کے لئے عملی طور پر لڑنے سپین جائیں۔

چنانچہ انٹرنیشنل بریگیڈ بنالیا گیا اور یہ بریگیڈ سوشلسٹ حکومت کو بچانے کے لئے لڑنے سپین چلا گیا۔ یہ انٹرنیشنل بریگیڈ دنیا بھر میں مزدور طبقے کی تاریخ میں بھائی چارے کی سب سے بڑی مثال تھا۔سوشلزم کو بچانے کی اس جنگ میں 53 ممالک سے 30 ہزار افراد جا کر لڑنے کو حاضر ہو گئے.....اور لڑنا صرف لڑنا نہیں ہوتا' مرنا بھی ہوتا ہے۔

ان 30 ہزار رضا کاروں میں 1448 کینیڈا کے باشندے تھے،9 ہزار فرانس کے، 5 ہزار جرمن و آسٹرین، 3 ہزار پولینڈ ،تین ہزار اٹلی کے ، 2800 امریکی، 1800 برطانوی،1600 بلجیم کے ،1660 یوگوسلاویہ کے اور،1500 افراد چیک تھے۔ انکی بھاری اکثریت کمیونسٹوں پر مشتمل تھی جن میں اولمپک پیمانے کے 200 اتھلیٹ تھے۔

سینکڑوں پروفیسر، ٹیچر، اخبار نویس، شاعر اور ادیب ان میں شامل تھے۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ تاریخ کے اندر اس جنگ سے زیادہ لٹریچر کسی بھی جنگ میں تخلیق نہ ہوا۔ایک اندازے کے مطابق 40 ہزار سے زیادہ ٹائٹل خلق ہوئے۔اسے ''شاعروں کی جنگ'' بھی کہا جانے لگا۔اس جنگ نے شاعروں، ادیبوں اور آرٹسٹوں کی ایک پوری نسل کو انسپائر کیا۔امریکی ملٹری تاریخ میں پہلی بار ایک سیاہ فارم افسر ''اولیور لاء'' نے جنگ میں سفید فام فوجوں کی قیادت کی۔

یہ لوگ بڑی بے جگری سے لڑے،اور بہت سے نامور لوگ فاشزم کے ہاتھوں جنگ میں مارے گئے.....مگر اس سب کے باوجود سوشلسٹ حکومت نہ بچ سکی اور جنرل فرانکو جیت گیا،سوشلزم کو شکست ہوئی۔(سوشلزم یعنی ترقی اور شعور کی فتح وشکست کا سلسلہ ہمیشہ انسانی تاریخ کا حصہ رہا ہے۔سوشلزم دشمنوں کے ہاں جشن برپا کر دینے کی حد تک مرتا جاتا ہے مگر پھر جشنِ جہاں جگانے ایک بار پھر جی اٹھتا ہے)۔

انٹرنیشنل بریگیڈ اور اس کی شکست کے اس واقعہ پر یورپ میں سب سے زیادہ بحث مباحثے ہوئے۔ ہندوستان میں بھی۔ بالخصوص یونیورسٹیوں میں زیرِتعلیم طالب علموں پر تو اس کے گہرے اثرات پڑے۔اسی زمانے میں ہندوستان کے چند نوجوان وہیں یورپ یعنی انگلستان میں زیرِتعلیم تھے۔سجاد ظہیر، ڈاکٹر مُلک راج آنند وغیرہ۔ وہ بھی ان حالات سے متاثر ہوئے،کمیونسٹ بنے اور ملک واپس آ گئے۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی پر ابھی پابندی تھی۔اور کمیونسٹ زیرِزمین کام کر رہے تھے۔کمیونسٹ پارٹی نے ان نوجوانوں کی مدد سے تین تنظیمیں قائم کیں:

1.....دانشوروں ،شاعروں، ادیبوں اور پروفیسروں پر مشتمل تنظیم '' پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن'' جس نے کہ لٹریچر پہ اثر ڈالنا شروع کیا.....شاعری پہ، ناول پہ، افسانہ تنقید پر اور حتیٰ کہ فلم پر بھی۔۔ایم اے او کالج کے پرنسپل محمود الظفر ، اس کی بیگم معروف مصنفہ رشیدہ جہاں، فیض احمد فیض اور ایم ڈی تاثیر پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن میں شامل ہو چکے تھے۔

2.....آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن.....تاکہ سٹوڈنٹس کو سوشلزم پڑھایا جائے اور سوشلسٹ مطالبات کے اوپر اُن کی تحریک قائم کی جائے۔ اس سے قبل طالب علموں کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ اس تنظیم کی شاخیں تقریباً ہر صوبے میں کالجوں کے اندر قائم ہوئیں۔جس کے صدر وی وی گری ،سیکرٹری جیوتی باسو اور نائب سیکرٹری مظہر علی خان تھے۔

3.....آل انڈیا کسان سبھا.....مزدوروں کی تنظیم تو پہلے موجود تھی لیکن کمیونسٹوں نے اب کسانوں کی تنظیم بھی قائم کر دی۔ کسان سبھا 1936ء میں قائم ہوئی۔ کسانوں نے جلسے کرنے شروع کر دیے جن میں سے چودھری صاحب کو دو جلسے یاد تھے: ایک لائلپور اور دوسرا خود اس کے اپنے گاؤں کے قریب شاہ کوٹ میں، جسے دیکھنے سی آر بھی گیا تھا۔ وہ اس وقت طالب علم تھا۔ وہاں اس جلسے میں اس نے سیف الدین کچلو، صاحبزادہ محمود علی وغیرہ کی تقریریں سنیں۔ان تقریروں کے بڑے موضوعات میں جاگیرداری کا خاتمہ، ملک کی آزادی کا حصول اور کسانوں کے حقوق کا حصول شامل تھے۔

جیسے کہ ذکر ہوا کہ مذکورہ بالا 8-1936 کے واقعات سے دنیا کا کوئی حصہ اور کوئی شہری مرکز لاتعلق نہ رہ سکا۔ لاہور بھی ان مباحثوں کے بگولوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور وہاں بھی دانشوروں، طالب علموں اور کسانوں کو منظّم اور متحرک کرنے کا کام شروع ہوا۔ گو کہ اس وقت تک سی آر اسلم کا کسی کمیونسٹ سے رابطہ نہیں ہوا تھا لیکن طالب علموں اور دانشوروں میں ہونے والی بحثوں سے سوشلزم کے نظریات کا شعور اُسے ضرور حاصل ہوا اور کارل مارکس، اینگلز اور لینن کے ناموں، ان کے افکار، اور کاموں سے شُد بُد حاصل ہوئی۔

چنانچہ لاہور میں طالب علموں کی تنظیم بنی۔ مظہر علی خان اس تنظیم کا سیکرٹری تھا۔ اس طرح سوشلزم کے بارے میں براہ راست بحثیں چل پڑیں۔ سی آر اسلم لاء کالج کا طالب علم تھا۔ وہ یونیورسٹی لائبریری کا ممبر بنا۔ وہاں اس نے انگلش لٹریچر پڑھا۔ لائبریری میں اس نے تلاش شروع کر دی کہ سوشلزم پر کوئی کتاب ملے۔ انگریزوں کے دور میں مشکل تھا کہ وہ سوشلزم پر کوئی کتاب آنے دیتے۔ البتہ اسے وہاں دو چھوٹی چھوٹی کتابیں ملیں : ایک کارل مارکس کی کتاب Wage,Labour And Profit تھی، اور دوسری لینن کی لکھی State And Revolution۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ اس نے یہ دونوں کتابیں پڑھیں، بحثوں میں حصہ لیا اور سوشلزم کے بارے میں اس کی آگاہی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہم پہلے ذکر کر چکے کہ اُن دنوں ترقی پسند اور جمہوری لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے سامنے واقع عرب ہوٹل تھا۔ سی آر اسلم بھی وہاں جایا کرتا تھا۔

اسی دوران 1939 میں اُسے مرکزی حکومت کے محکمے ''سی ایم اے'' میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ وہ پہلے لاہور اور پھر کراچی میں نوکری کرنے لگا۔ اسی محکمے کی ملازمت کے سلسلے میں وہ متھرا اور کلکتہ سمیت کئی علاقوں میں رہتے رہتے بالآخر کانگرہ ویلی میں پالم پور کے مقام پر کچھ عرصہ مقیم رہا۔ یہیں اوائل 1940 میں اس کی ملاقات اُس علاقے کے مشہور کمیونسٹ رہنما کامریڈ ہزارہ سنگھ سے ہوئی۔ اور وہیں اُس کی راہنمائی میں اُس نے زیرِ زمین کمیونسٹ پارٹی کی ممبر شپ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اب آزادی، جمہوریت اور سوشلزم کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا جائے

۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے کچھ عرصہ بعد یہ نوکری چھوڑ دی اور پارٹی کی ہدایت پر ایف سی کالج میں ایم اے اکنامکس میں داخلہ لے لیا۔

چنانچہ سی آر اسلم 1940ء میں انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن گیا۔ اس وفاداری کو استواری کے ساتھ اور کُل وقتی طور پر زندگی بھر کے لیے، سی آر اسلم کی شناخت بننا تھا۔

دوسری عالمی جنگ

1939ء میں ہٹلر اور مسولینی نے اپنے ایک اور نظریاتی ''پاتھاری دار'' جاپان کے تو جو کی کو اپنے ساتھ ملایا اور انسانیت کے قتل عام کی گلوبلائزیشن کر دی۔ یوں، عالمی فاشزم کے قیام کے لئے دوسری عالمی جنگ چھیڑ دی۔ دو سال سے کم عرصے میں انہوں نے سارے یورپی ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ 1940ء سے 1942ء تک کی تباہی اور بربادیوں نے دنیا کے تمام انسان دوست اور امن خواہ طاقتوں کو بری طرح مجروح کر دیا۔ اور ہٹلر باقی ملکوں میں بھی اپنے دوست احباب تلاش کرنے لگا۔ ایران اور ہمارے بلوچستان پر تو اُس کے براہ راست اثرات پڑ رہے تھے کہ انگریز کے خلاف لڑنے والے کچھ لوگوں کو جرمن فاشزم اسلحۂ ٹریننگ، اور پروپیگنڈہ لٹریچر، بھیج رہا تھا۔ آپ اس بات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایران میں ہٹلری جاسوسی کا نیٹ ورک پورے ملک میں پھیل چکا تھا اور تودہ پارٹی کے دستاویزات میں یہ بات درج ہے کہ 1941ء کے پہلے آٹھ ماہ کے دوران مختلف ذریعوں سے گیارہ ہزار ٹن فوجی سامان ایران میں منتقل ہو چکا تھا اور اسے خفیہ جگہوں پر ذخیرہ کر لیا گیا تھا۔ نازیوں نے ساری ایرانی سطح مرتفع میں بہت سی نمایاں شخصیات کو بھی اپنی طرف کر لیا۔ پورے خطے میں بہت سی فاشسٹ پارٹیاں بن گئیں جنہوں نے بہت سے لوگوں بالخصوص نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف کھینچا۔

22 جون 1941ء کو ہٹلر اور مسولینی کی نازی اور فاشسٹ فوجوں نے مزدوروں کے وطن سوویت یونین کی ایک ہزار میل سرحد پر پچاس لاکھ فوجیوں، ہزاروں ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے شب خون مارا اور ہٹلر نے سوویت یونین کو تین سے چھ ہفتے تک فتح کرنے کی بڑ، ہانک دی۔ اس

نے آسٹریا، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، رومانیہ، لٹویا، لتھوانیا اور فرانس پر مختصر سے عرصے میں ہاتھ صاف کرنے کا مزہ جو چکھ لیا تھا!!۔ مگر اس گھمنڈ میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ سماج کے ایک ایسے نئے انسان پر چڑھ دوڑا ہے جس نے زار بادشاہ جیسی طاقت اور دیگر سامراجی و فاشسٹ قوتوں کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

اُس وقت ہمارے خطے میں بھی بہت سے انگریز دشمن لوگوں نے ہٹلر کی چھ ہفتوں کے دعوے پہ شادیانے بجائے تھے۔ لیکن ساری دنیا میں سوشلزم کے دوستوں کے عزائم بلند تھے کہ ہٹلر اور مسولینی اپنے لاؤشکر سمیت پاش پاش ہو کر رہیں گے۔ سی آر اسلم بھی انہی بڑے انسانوں میں شامل تھا۔

سی آر اسلم اپنے نظریات کے زیر اثر زیادہ دیر تک ملازمت پہ نہ رہ سکا اور اُسے خیر باد کہہ دیا۔ اس نے اپنی پیاری زندگی کو اتنے اچھے انداز میں گزارا کہ بقول آسٹروسکی ''ضائع شدہ برسوں کے لئے اذیت ناک پشیمانی نہیں اور نہ ہی ایک حقیر اور ذلیل ماضی' کی جلا ڈالنے والی شرمندگی''۔ وہ بہت اطمینان سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے پوری زندگی اور پوری توانائی، دنیا کی عمدہ ترین کاز کے لئے دے دی۔ یہ کاز بنی آدم کو آزاد کرنے کی لڑائی کا کاز ہے اور اس میں ہمہ وقت جت کر سی آر اسلم نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ کارآمد اور یادگار بنا دیا۔

چنانچہ، سوویت یونین پر ہٹلری فاشزم کی یلغار کے موضوع پر زبردست بحثیں جاری تھیں۔ سوشلزم کے گھٹنے ٹیک دینے کی پیشن گوئیوں کے حق اور مخالفت میں دلیلیں دی جا رہی تھیں۔ فاشسٹ فوجوں کی طرف سے 22 جون 1941ء کو سوویت یونین پر حملہ کے ساتھ سیاسی صورتحال بڑے پیمانے پر بدل چکی تھی۔ اس لئے کہ دنیا بھر میں کمیونسٹ سوویت یونین کے دوستوں، کمیونسٹ پارٹیوں اور آزادی پسند لوگوں کے ہاں اب سب سے بڑی آرزو اور مقصد سوشلسٹ حکومت کی بقا تھی۔ دنیا بھر کے ترقی پسند، امن خواہ اور مزدور دوستوں نے اس حملہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اگر فاشسٹ قوتیں دنیا کو زیر کرنے میں کامیاب ہوتیں تو انسانی نسل کیلئے کوئی امید نہ رہتی۔ مزید برآں سوشلسٹ سوویت یونین پوری دنیا کی قومی آزادی کی تحریکوں کا واحد دوست تھا، اس

لیے بھی اس کی بقا ہماری آزادی کی تحریک کیلئے اہم تھی۔ اس لیے روشن فکر انسانیت نے اس سوشلسٹ ریاست کے دفاع اور انسانیت کو فاشسٹ غلامی سے نجات دلانے کو اپنا فریضہ جانا تا کہ اپنی آزادی کے کاز کو مضبوط کیا جا سکے۔

لہٰذا اب یہ ''سامراجی جنگ'' نہ رہی۔ سوویت یونین پر حملہ کے بعد یہ فاشزم کے خلاف ''عوامی'' جنگ بن گئی۔ چنانچہ دنیا کے کمیونسٹوں نے اسے عوامی جنگ قرار دیا اور عوام سے اپیل کی کہ اپنی آزادی اور بہبود کی خاطر فاشزم کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کریں (4)۔ 29 جون 1941 کو جس طرح بلوچستان کے صدر مقام کوئٹہ کے میکموہن پارک میں یہاں کے کمیونسٹوں' کامریڈ عبدالکریم شورش، ملک سید محمد شفیع اسدی، سردار گربچن سنگھ، محمد حسین عنقا، غوث بخش بزنجو، شمیم، سردار جیت سنگھ اور محمد حسن نظامی نے انٹی فاشسٹ جلسہ کر کے سوویت یونین پر حملہ کو دنیا کے محنت کشوں کے قلعہ پر حملہ قرار دیا گیا' اسی طرح دنیا بھر میں کمیونسٹوں نے سامراج کے خلاف لڑنے کی اپنی جدوجہد اور پالیسی کو موخر کر کے صرف اور صرف فاشزم کو مار گرانے کی پالیسی اپنائی۔ چنانچہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی جو اس وقت خلاف قانون تھی، نے بھی اسی پالیسی کے تحت سامراجی برطانوی سامراج کیخلاف لڑنے کے بجائے اب اسی استعماری فوج میں بھرتی ہو کر ہٹلر کے خلاف جنگ میں شرکت کرنے کی مہم شروع کی۔ کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے کے تحت محمد دین تاثیر نے ریڈیو میں نوکری کر لی۔ فیض احمد فیض اور مظہر علی خان باقاعدہ فوج میں بھرتی ہوئے۔

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی اس نئی پالیسی کے پیشِ نظر اکتوبر (یا نومبر) 1942 میں برطانوی سامراج نے کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ختم کر دی۔ یعنی عملی طور پر 1942 میں کمیونسٹ پارٹی قانونی طور پر کام کرنے لگی اور ہر جگہ پارٹی دفاتر کھل گئے۔ سی آر اسلم کے لاہور میں ،اِس پارٹی کا دفتر 114 میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ دوسرے کمیونسٹوں کی طرح سی آر بھی دفتر آنے جانے لگا۔ پابندی اٹھنے کے دو تین سال کے اندر پارٹی کے ممبروں کی تعداد چند ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئی۔ (5)

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ یہاں کے سارے کمیونسٹوں نے ہٹلر کے خلاف جنگ کو عوامی

جنگ قرار دے کر برطانیہ کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ بلوچستان میں بھی ایک ''والنٹیر کور'' بنایا گیا۔ کمیونسٹوں کے علاوہ جو لوگ آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، وہ یہ اہم نکتہ سمجھ نہ سکے۔ خان عبدالصمد خان اچکزئی جیسا بڑا سیاستدان بھی یہاں پھسل گیا اور اس نے کامریڈ عبدالکریم شورش پر انگریز ایجنٹ تک کا لیبل لگا دیا۔

ملک میں ہر جگہ بابو شورش جیسے سر پھرے لوگ یہی نعرہ لگاتے پھرتے تھے کہ ''روس کی جنگ ہماری جنگ، روس کی جنگ عوامی جنگ''۔ لیکن سب سے بڑی پارٹی یعنی کانگریس کو روس وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی اُسے سوشلزم سے کوئی غرض تھا۔ لہٰذا یہ اس کا مسئلہ ہی نہ تھا کہ برطانوی سامراج جرمن ہٹلریت کیخلاف سوشلسٹ روس کا اتحادی بن چکا ہے۔ وہ ہر صورت میں برطانیہ کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سوچ کے اس بڑے فرق کی بناء پر کمیونسٹوں اور کانگریسیوں میں ہمیشہ آپسی جھگڑے فساد بپا رہتے تھے۔ اور ہمارے پاکستانی مولویوں کی طرح کانگریسی بھی ہمیشہ کمیونسٹوں کیلئے غداری، کافری اور روسی ایجنٹی کا فتویٰ جیب میں لیے پھرتے تھے۔

انڈونیشیا میں سوئیکارنو، ہندوستان میں گاندھی، پٹیل وغیرہ بھی یہ مضحکہ خیز نعرہ دے رہے تھے کہ ''دشمن کا دشمن، اپنا دوست''۔ گویا ہٹلر اُن کا دوست ٹھہرا۔ اس پورے خطے میں کمیونسٹوں اور بالخصوص ہو چی منہ جیسے مہان انسانوں نے البتہ یہ کہا کہ ''دشمن کا دشمن ہمارا دوست نہیں ہوسکتا''۔

سی آر اسلم نے آزادی اور سوشلزم کی تحریک میں حصہ لینے کے فیصلے کی تکمیل کے لئے کارل مارکس کی تحریروں کا علم حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ چونکہ مارکسزم کا علم حاصل کرنے اور سمجھنے کیلئے اکنامکس کا علم ضروری تھا، لہٰذا اس نے 1941 میں ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس نے یونگ ہال ہوسٹل نیلا گنبد میں رہائش اختیار کی اور پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اکنامکس میں پڑھائی شروع کردی۔ اُن دنوں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کمیونسٹ لٹریچر دستیاب نہیں تھا۔ یہ کتب ممنوع ہونے کے باعث لائبریریوں میں نہیں ملتی تھیں۔ آخر ایک دن بھاٹی گیٹ لاہور کے ایک دکاندار کے پاس برطانیہ سے کتابوں کا ایک کنٹینر آیا تو اس میں مارکس کی شہرۂ آفاق کتاب ''کیپٹل'' بھی شامل تھی۔ سی آر اسلم نے دیکھتے ہی خرید لی اور خاصا عرصہ اس سے استفادہ کیا۔ (6)

سٹوڈنٹ لیڈر

سی آر اسلم آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پنجاب کا صدر منتخب ہوا۔ وہیں ایم اے کی کلاس میں کمیونسٹ پارٹی کے دوسرے ممبر طلبا بھی موجود تھے۔ سی آر اسلم نے پنجاب کے طلباء کو منظّم کرنے اور انہیں آزادی، جمہوریت اور سوشلزم کے نظریات سے آگاہی دینے کیلئے پنجاب بھر کے کالجوں کے دورے کیے اور طلباء کو منظّم و متحرک کیا۔ اس نے یونیورسٹی میں پارٹی سے وابستہ سٹوڈنٹس کے سیل بنا دیے۔ وہ یونیورسٹی میں پارٹی لیڈروں کے لیکچر بھی کروایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس کے لیڈر کا نام اجے کمار گھوش تھا جو سینٹرل کمیٹی کا رکن تھا اور لاہور میں پارٹی کی راہنمائی کرتا تھا۔ اس کامریڈ سے سی آر کی ملاقاتیں اُس وقت سے جاری تھیں جب وہ لاہور میں ایڈورڈ روڈ پر روپوشی کی حالت میں رہتا تھا۔ اسی کی ملاقاتوں نے تو سی آر کو بہت کچھ سکھایا تھا۔ پھر دادا فیروز الدین منصور بھی تھا جس سے سی آر اسلم کی اکثر و بیشتر ملاقاتیں رہتیں اور اس طرح اس کی تربیت ہوتی رہتی۔ (7)

چودھری صاحب نے ایم اے اکنامکس اس لئے پڑھا کہ مارکسزم سیکھ سکے۔ اس کا مقصد چونکہ پورا ہوگیا اور پڑھائی ہوگئی تو اس نے فیصلہ کیا کہ امتحان کیا دینا؟۔ ڈگری کا حصول تو اس کا مقصد نہ تھا۔ مگر کامریڈ اجے کمار گھوش نے اُسے بلا کر کہا کہ امتحان دینا ضروری ہے۔ چنانچہ سی آر نے امتحان دے کر پاس کرلیا۔

یہاں وہ کیپٹل بھی پڑھ چکا۔ اس نے ایرڈ اولڈ کی کتاب History Of Economic Thoughts بھی پڑھ لی جو اُسے بہت اچھی لگی۔ مارکسزم پہ اس کی نظر میں یہ بہترین کتاب تھی۔

پاکستان بننے سے چند سال پیشتر (1942 تا1947) تک کا زمانہ اس کا طالب علمی کا زمانہ تھا۔

پارٹی نے اپنے نظریات اور پالیسیوں کی عوام میں تشہیر کے لیے ہندوستان کی اہم زبانوں میں ترجمان اخبارات کا اجرا کیا۔ پارٹی ممبروں اور ہمدردوں کو ہدایات دی گئیں کہ وہ ملکی سیاست میں پارٹی کے نقطہ نظر کو عوام میں پہنچانے کے لیے پارٹی اخبارات زیادہ سے زیادہ فروخت کریں۔ سی آر اسلم باقی ممبروں کی طرح لاہور کی سڑکوں گلیوں میں ہاکروں کی طرح اخبار کی اہم سرخیوں کو بآواز بلند پڑھتے ہوئے ''نیا زمانہ''، ''پیپلز ایج'' وغیرہ فروخت کرتا تھا۔

ٹریڈ یونین میں

ایم ایم اکنامکس پاس کرنے کے بعد سی آر اسلم نے فیصلہ کیا کہ وہ پارٹی کا کل وقتی کارکن بن کر اپنے گاؤں جائے گا اور وہاں کسانوں میں کام کرے گا۔ گویا وہ کسان فرنٹ پہ کام کرنے کے لئے ذہن بنا چکا تھا۔ مگر اُس کے استاد کامریڈ اجے کمار گھوش نے اُسے بلا بھیجا اور اس کمیونسٹ کو کسانوں کی بہ نسبت زیادہ انقلابی طبقہ' یعنی مزدوروں میں کام کرنے پر قائل کرلیا۔ یوں چودھری صاحب کسان کمیٹی بنانے کے بجائے مزدور یونینوں کے قیام میں جت گیا۔ اس کی ڈیوٹی ریلوے کے مزدوروں میں لگ گئی۔ اُس زمانے میں ریلوے ورکرز یونین، ہندوستان کے منظّم مزدوروں کے ہراول کی حیثیت رکھتی تھی۔ سی آر اسلم نارتھ ویسٹرن ریلویز ورکرز ٹریڈ یونین میں کام کرنے لگا۔ اس نے خوب محنت کی اور جلد ہی 1948 تک وہ اس ریلوے ورکرز ٹریڈ یونین نارتھ ویسٹ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ اس کا صدر مرزا محمد ابراہیم تھا اور نائب صدر فیض احمد فیض۔ پارٹی نے ایف سی کالج میں انگریزی کے پروفیسر ایرک سپرین سے بھی استعفےٰ دلوایا اور وہ بھی پارٹی کا ہول ٹائمر بن گیا۔ اس طرح یہ دونوں تعلیم یافتہ ہول ٹائمرز مرزا ابراہیم کے ساتھ ریلوے یونین میں کام کرنے لگے۔ وہ مزدوروں میں سیاسی تعلیم دیتے اور ریلوے کے علاوہ اور بھی جو لوگ پارٹی کے نزدیک آجاتے، اُن کے سٹڈی سرکل لیا کرتے تھے۔

یوں سی آر اسلم نے سیکھ لیا کہ ٹریڈ یونین دراصل دو چار آنے کی لڑائی نہیں بلکہ یہ بنیاد ہے کہ آپ طبقاتی کشمکش کو سمجھیں اور طبقات اور استحصال سے پاک معاشرہ کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ اور یہی جدوجہد دراصل سیاسی جدوجہد ہے جو محنت کشوں کو اس جابرانہ نظام سے آزاد کرسکتی ہے۔ اُس زمانے ہی سے سی آر اسلم نے ہمیشہ مزدور اتحاد پر زور دیا تاکہ آجروں کی یلغار کے خلاف جدوجہد کی جاسکے۔

دوسری عالمی جنگ، 1945ء میں ختم ہوئی۔ پہلے یورپ میں اور اس کے بعد جاپان والی جنگ بھی ختم ہوگئی۔ ہٹلر اور گوئرنگ نے کمیونزم کو دبانا چاہا تھا، سویت یونین کو مٹانا چاہا تھا لیکن ہوا یہ کہ یہ لوگ نہ تو کمیونزم کو دبا سکے اور نہ سویت یونین کو مٹا سکے اور نہ دنیا کو اپنا غلام بنا سکے۔ انہوں نے الٹا اپنا نقصان کیا، اپنے ملک کا نقصان کیا اور تختۂ دار اور قبر کے سوا کہیں جگہ نہ بنا سکے۔ نازی جرمنی کی قیادت میں فاشزم کی فوجی شکست اور جنگ میں سوویت یونین کی طرف سے ادا کیے گئے کردار نے دنیا میں نظریات کے میدان میں طبقاتی قوتوں کو سوشلزم کی وکالت کرنے والوں کے حق میں کردیا۔ اور بہ یک وقت پوری دنیا میں سامراجی قوتیں کمزور ہوئیں۔ ان تبدیلیوں سے توانائی لے کر ایشیا بھر میں طاقتور قومی آزادی کی تحریکیں ابھریں۔ ہندوستان جو کہ برطانوی ایمپائر کی وسیع ترین نوآبادی تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں برطانوی حکمرانی کے خلاف زبردست انقلابی ابھار پیدا ہوا۔ کسانوں، مزدوروں اور طلبا کی ہڑتالیں اور عوامی جدوجہد شروع ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر کمیونسٹ پارٹی نے انٹرنیشنل فریضے کی تکمیل کے بعد خود اپنے وطن میں جاری اپنی جدوجہد کو از سر نو منظّم کرنا تھا..... غلامی کی حالت میں سب سے بڑی جدوجہد تو آزادی کی جدوجہد ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ ہوا کہ چونکہ اس جنگ میں سوویت یونین نے کامیابی حاصل کی اور دنیا میں سوویت یونین اور سوشلزم کا اثر کافی بڑھا ہے اور یہ اثرات یہاں ہندوستان میں بھی بڑھے ہیں لہٰذا اب ہمیں ہندوستان میں انقلاب کیلئے تیاری کرنی چاہیے۔ انقلاب کی اس تیاری کے لیے آغاز ہندوستان میں ریلوے ہڑتال سے کیا جائے۔ اس کے علاوہ کسانوں کی کانفرنسیں منعقد کرنے اور انہیں متحرک کرنے کا کام کرنا تھا۔

چنانچہ پارٹی نے آل انڈیا ریلوے مینز فیڈریشن بنائی جس کا صدر وی وی گری بنا، مرزا ابراہیم نائب صدر اور جیوتی باسواس کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ ریلوے کی ملک گیر ہڑتال کی تیاری کے لیے چودھری صاحب نے مرزا ابراہیم کے ساتھ پشاور سے دہلی اور کراچی سے کوئٹہ تک کے دورے کئے تاکہ ریل کے مزدور ہڑتال کی تیاری کریں اور دیگر مزدور جس جس شہر میں ہوں وہ ان کا ساتھ دیں (سی آر کے یہ ملک گیر دورے زندگی بھر اس کا مقدر بنے جب تک کہ اس کی بڑھتی ہوئی عمر نے اس مقدس فریضے سے اُسے روک نہ لیا)۔

کسانوں کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ وہ اپنی کانفرنسیں کرنا شروع کردیں۔ اور جب مزدور ہڑتال کردیں تو کسان بھی میدان میں نکل آئیں اور تھانوں، حکومتوں پر قبضہ کرتے جائیں۔ چنانچہ کسانوں کی کانفرنسیں ''دھاکہ تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ کیرالا میں ایک کانفرنس ہوئی، ایک پنجاب میں جیابگا کے مقام پر ہوئی۔ ایک لدھیانہ میں ہوئی۔ اسی طرح ایک کانفرنس سی آر اسلم کے علاقے شاہ کوٹ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت بھی اس نے ہی کی تھی۔ (کس قدر ڈائنامک شخص تھا۔ مزدور کے جلسے، کسانوں کی کانفرنسیں، مارکسزم کا مطالعہ۔۔۔۔۔۔۔)۔

کمیونسٹوں کی آزادی کی تحریک کی یہ حکمت عملی بڑی کامیابی سے جاری تھی کہ اس دوران ایک اور واقعہ ہوگیا جس نے اس سارے پروگرام کو بدل کر رکھ دیا۔ ہوا یہ کہ 1945 میں انگلستان میں الیکشن ہوئے جن میں جنگ کا ہیرو چرچل ہار گیا۔ لیبر پارٹی جیت گئی اور اس کا لیڈر ایٹلی وزیراعظم بنا۔ اس نے وزیراعظم بنتے ہی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ ''ہم نے آج سے ہندوستان کو آزاد کردیا۔ اور ہم جمہوری اور پرامن طریقے سے وہاں کی سیاسی پارٹیوں کو اقتدار منتقل کرنے کیلئے ایک کیبنٹ مشن ہندوستان بھیج رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم وہاں الیکشن کرائیں گے''۔ چنانچہ یہاں سی آر اسلم کی کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کرلیا کہ ریلوے ہڑتال اب نہ کی جائے اس لئے کہ آزادی مل رہی ہے۔

پارٹی نے فیصلہ کیا کہ برطانیہ کے اس اعلانِ آزادی میں کمیونسٹ رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ اسی لئے ایٹلی کے اس اعلان پہ پارٹی نے ریلوے کی ہڑتال ملتوی کردی اور سارا زور کسان فرنٹ

پر لگا دیا۔ بڑی بڑی کسان کانفرنسیں بنگال، تری پورہ اور کیرالہ میں ہوئیں۔ پنجاب میں بھی تین چار کانفرنسیں ہوئیں۔ کسان تحریک پہ سارا زور اس لیے لگایا گیا کہ جب آزادی آئے گی تو جاگیرداری کیخلاف ایک قوت موجود ہو۔

فروری 1946 میں برطانوی کیبنٹ کا وفد آ گیا۔ بمبئی میں ان کے تینوں وزیروں نے گاندھی، نہرو، جناح، پٹیل، راج گوپال اچاریہ اور لیاقت علی سے بات چیت کی اور انہیں اقتدار منتقل کرنے کی یقینی دہانی کرائی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ آئین ساز اسمبلی ہو، اور وہ آئین بنائے کہ ہندوستان کے تین زون ہوں ایسٹرن، ویسٹرن اور سینٹرل زون۔ انہی زونوں پہ مشتمل اس کی یونین بنائی جائے۔ بقیہ آئین ہندوستان کے عوام خود بنائیں۔ ان کی یہ تجویز تسلیم کی گئی مگر لیڈر لوگ اقتدار کی بانٹ پہ آپس میں متفق نہ ہو سکے۔ وزیراعظم کے عہدے کے لئے نہرو کی بات ہوئی، لیاقت علی کا نام وزیرخزانہ کیلئے تجویز ہوا، مگر جھگڑا گورنر جنرل کے عہدے پر رہا۔ نہرو کا خیال تھا کہ راج گوپال اچاریہ کو یہ عہدہ ملے، جبکہ جناح صاحب خود گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔۔۔۔ جھگڑا چلا۔

سی آر اسلم کی کمیونسٹ پارٹی نے تحریک چلائی کہ گاندھی جناح ملیں۔ یہ ایک اچھی خاصی زوردار تحریک تھی، جس کے نتیجے میں ملاقات تو ہوئی مگر ناکام رہی۔ ایک بار پھر وہی تحریک ''ملو، ملاقات کرو'' (لگتا ہے کمیونسٹوں کی بائبل میں ''ملو، ملاقات کرو'' کی اہمیت سب سے زیادہ ہے)۔ دونوں پھر ملے مگر پھر ناکام رہے۔ تب انگریز نے انہیں لندن بلایا۔ وہاں بھی طے نہ ہو سکا کہ پہلا گورنر جنرل کون بنے۔ تب انگریز نے ویول کو واپس بلایا اور اس کی جگہ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا۔ اس نے آتے ہی اعلان کیا کہ ہم نے برطانوی ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا' ایک پاکستان اور دوسرا ہندوستان۔ چھ سو سے زائد چھوٹی بڑی آزاد ریاستوں کو آزادی ہوگی کہ وہ چاہیں تو دونوں میں سے کسی کے ساتھ مل جائیں، چاہیں تو آزاد رہیں۔

چنانچہ ہندوستان کی سرزمین پر سے برطانوی سامراج کا سیاسی تسلط جو ڈیڑھ سو برس سے قائم تھا ختم ہوا اور ممالک آزاد ہوئے۔ برصغیر کی آزادی اس عوامی جدوجہد کا نتیجہ تھی جو مختلف شکلوں میں کی گئی اور جس میں آزادی کے ہزاروں متوالوں نے اپنی جانیں قربان کیں، ہزاروں

لاکھوں نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور آزادی کی خاطر انسانیت سوز مظالم برداشت کئے۔ عوام کی سامراج دشمن جدوجہد بالآخر کامیاب ہوئی اور سامراج کو ہندوستان سے نکلنا پڑا۔ اِدھر مغرب کی طرف 14 اگست 1947 کو حکومت قائداعظم کو ملی۔ 14 اگست کو کراچی کے پلٹن میدان (جو پولو گراؤنڈ کے نام سے جانا جاتا ہے) میں انتقالِ اقتدار کی تقریب میں پارٹی کی طرف سے کامریڈ جمال الدین بخاری، سی آر اسلم اور مرزا ابراہیم شریک ہوئے۔ دلچسپ ہے ناں! تقسیمِ ہند کے وقت لوگ لوٹ مار کر رہے تھے۔ کلیم میں زمینیں اور دکان ہتھیا رہے تھے اور یہ پاک انسان اعلیٰ ترین سیاست کر رہا تھا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان

بلاشبہ اجے کمار گھوش کی لیڈری میں بھی سی آر نے اپنی زندگی کے بہت اہم فیصلے کیے مگر اس نے اُس زمانے میں (اور بعد میں بھی) دادا فیروز الدین منصور سے بھی بہت اثر لیا۔ وہ بہت ہی دلچسپ شخص تھا۔ زبان میں لکنت والا فیروز الدین ایک غریب محنت کش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ بھی سی آر اسلم کے ضلع شیخوپورہ سے تھا۔ گو کہ وہ ایک نواحی گاؤں میں رہتا تھا مگر اس کا والد اہل وعیال کی گزر بسر کے لیے شیخوپورہ میں درزی کا کام کرتا تھا۔

فیروز ہائی سکول کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آ گیا اور مشن ہائی سکول رنگ محل میں داخلہ لے لیا۔

جب 1920 میں انگریزوں کے ظلم و جبر سے تنگ آ کر ہندوستان کے آزادی پسندوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور ہجرت کر کے افغانستان جانے اور وہاں فوجی تربیت لے کر انگریزوں کے خلاف مسلح لڑنے کی تجویز پیش کی تو بے شمار آزادی پسند نوجوان پہلے سرحد اور پنجاب سے، اور پھر یوپی وغیرہ کے کئی شہروں سے خفیہ طور پر افغانستان پہنچنا شروع ہو گئے۔ فیروز الدین منصور بھی انہی نوجوان میں سے ایک تھا۔ ابھی تک اُس نے میٹرک بھی نہ کیا تھا۔

وہ پہلے افغانستان اور وہاں سے سوویت روس پہنچا اور ''ایشین یونیورسٹی آف کا لونیل

پیپلز'' میں داخل ہوا۔ اس کی عمر 17 برس تھی۔ وہاں غلام ملکوں کے نوجوانوں کو انقلاب کی تربیت دی جاتی تھی اور مارکسزم پڑھایا جاتا تھا۔ فیروز الدین منصور سوشل سائنسز اور مارکسی نظریاتی تعلیم کے چار ماہ کے اس کورس کے بعد ہندوستان کے عوام کی سیاسی آزادی اور مزدوروں کسانوں کی معاشی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنے 1922 میں روسی ذرائع سے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے چترال پہنچا۔ مگر وہیں گرفتار ہوا اور پشاور لایا گیا۔ پشاور کمیونسٹ کیس میں اُسے ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ سزا بھگتنے کے بعد وہ شیخوپورہ پہنچا۔ گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔

1924 میں وہ پھر سے پنجاب کے مزدوروں کسانوں میں کام کرنے لگا۔ 1926 میں وہ کمیونسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کا اہم رکن بنا۔ (8)

تقسیم سے پہلے تک تو کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل تیجا سنگھ سنتنتر تھا۔ اس کے ساتھ اہم لیڈروں میں سورن سنگھ جوش، سرجیت سنگھ اور دادا فیروز الدین منصور تھے۔ اگست 1947 میں تقسیم کے وقت ہندو اور سکھ کامریڈ ہندوستان چلے گئے۔ بعد میں CPIM کے جنرل سیکریٹری ہرکشن سنگھ سرجیت، سی آر کو یاد کرتا تھا اور اس کو پیغام بھجواتا تھا کہ ''سی آر کو میری طرف سے پیغام دینا کہ بٹوارے کے وقت پارٹی دفتر 114 میکلوڈ روڈ کی چابی میں نے اُسے دی تھی، اب میں آؤں گا تو وہ چابی میں نے واپس لینی ہے''۔ (یہ دونوں دوست اپنی طویل عمر کے آخر تک اپنے آدرشوں پہ قائم دائم رہے)۔

برصغیر جنوبی ایشیا کی آزادی کے صرف پانچ ماہ بعد فروری 1948ء میں کلکتہ میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی۔ اس میں اردگرد کی پارٹیوں کے نمائندے بھی آئے۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی، چین، برما، انڈونیشیا اور فلپائن کی پارٹیوں کے نمائندے بھی اس کانگریس میں موجود تھے۔ اس کانگریس کیلئے مندوبین کی تفصیل یوں ہے: پنجاب سے ایرک سپرین، مرزا ابراہیم اور سی آر اسلم۔ صوبہ سرحد سے محمد حسین عطا۔ اور صوبہ سندھ سے جمال الدین بخاری۔

کانگریس میں سی آر اسلم اور مرزا ابراہیم شریک نہ ہو سکے، اس لیے کہ ریلوے مزدوروں نے اپنے مطالبات کیلئے ہڑتال کا نوٹس دیا ہوا تھا۔ سی آر اسلم جو یونین کا جنرل سیکرٹری تھا اس کو منظّم

کرنے میں لگا ہوا تھا اور اسی ہڑتال کے نتیجے میں مرزا ابراہیم گرفتار ہو چکا تھا(9)۔

اس کانگریس میں پاکستان کے لئے الگ پارٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ دوسرا فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ ملک کے دونوں بازوؤں میں کافی فاصلہ ہے اس لیے مشرقی پاکستان کیلئے الگ پارٹی ہو اور مغربی کیلئے الگ۔

اس فیصلے کے مطابق پاکستان کی الگ کمیونسٹ پارٹی وجود میں لائی گئی جو پاکستان میں پہلے سے موجود اور نقل مکانی کر کے پاکستان آنے والے پارٹی ممبران پر مشتمل تھی۔ سید سجاد ظہیر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مغربی پاکستان میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں لائے۔ چنانچہ سید سجاد ظہیر مغربی پاکستان آیا۔ سید سبط حسن اور مرزا اشفاق بیگ بھی اس کی مدد کرنے اُس کے ساتھ آئے۔ چنانچہ پارٹی کی پہلی سنٹرل کمیٹی قائم ہوئی۔ جنرل سیکرٹری سجاد ظہیر بن گیا۔ سنٹرل کمیٹی کے ارکان میں فرنٹیئر سے محمد حسین عطا، سندھ سے سوبھوگیان چندانی، جمال الدین بخاری۔ اور پنجاب سے سی آر اسلم اور مرزا ابراہیم شامل تھے۔ بلوچستان سے گو کہ میر غوث بخش بزنجو 1937 سے کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا مگر پارٹی کا اُس سے شروع دنوں میں رابطہ نہ ہو سکا۔ اس سے پہلا رابطہ سوبھو صاحب کا ہوا اور پھر بزنجو صاحب نے بابو عبدالکریم اور دیگر ساتھیوں سے مل کر بلوچستان کمیٹی بنالی۔ سید مطلبی فرید آبادی پاکستان بننے پہ یہاں آ گیا اور کسان کمیٹی بنانے کے کام میں لگ گیا اور بعد میں پارٹی کے اخبار کا ایڈیٹر رہا۔

پنجاب میں مسلم لیگ نے تنظیمی طور پر کمیونسٹ پارٹی کو چلنے نہ دیا۔ لیڈروں کارکنوں کی گرفتاریاں، کمیونسٹ پریس اور اخبارات کی بندش اور کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر کو سربہ مہر کرتے رہنا گویا ایک طرح کا وطیرہ بن گیا۔ زیر زمین سیاسی کام کرنا از حد ضروری تھا۔ ہر ہر لیڈر اور کارکن کے بے شمار کوڈ نام ہوا کرتے تھے۔ سی آر اسلم کا ایک کوڈ نام ''اختر'' تھا، اور ایک ''عزیز'' تھا۔ ضیاء الحق دور میں جب ایجنٹ کنٹرول لسٹ بنا تو اس میں سی آر اسلم کے دو تین کوڈ نام بھی درج ہو گئے (10)۔

پارٹی نے 1948ء میں عوامی تنظیمیں بنالیں۔ اس بات کا ذکر بھی لازم ہے 1948 والی فروری کانگریس میں دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین جمع ہوئے تھے۔ ان میں فیصلہ ہوا کہ اب

سوشلزم سوویت یونین کی شکل میں مضبوط ہو گیا۔ باقی دنیا ابھی چونکہ غلامی میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اسے آزادی ابھی لینی ہے۔

حصولِ آزادی اور مسلح جدوجہد ہمیشہ سے یار بیلی رہے ہیں۔ چنانچہ دنیا بھر میں ان نو آبادیاتی سامراجی ممالک کیخلاف آزادی کی مسلح جنگیں شروع ہو گئیں۔ فلپائن، انڈونیشیا، ملائشیا، برما..... ہر جگہ لوگ اٹھے، گوریلا دستوں پر مشتمل مسلح عوامی افواج بنالیں اور ٹوٹ پڑے بدیشی آقاؤں کے محلات پہ..... مگر تاریخ کا ستم یہ، کہ کامیابی ایک جگہ پہ بھی نہ ہو سکی۔ ہندوستان کو چونکہ آزادی مل گئی تھی اس لئے گوریلا گیری کی ضرورت ہی نہ تھی۔ چنانچہ یہاں اپنے طریقے کے مطابق کام کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہاں تو تقدیر ایک اور طویل، کٹھن اور بور کرنے کی حد تک صبر آزما جدوجہد کا فیصلہ لکھ چکی تھی۔ یہاں کے سی آر اسلموں کو پارٹی پر پابندیاں لگتے رہنے، ایوب خانوں، یحیٰ خانوں، بھٹوؤں کے سیٹوؤں اور سنٹوؤں ضیاء الحقوں اور مشرفوں کے نزول کو بھگتنا تھا۔

1948ء میں پارٹی نے جو پروگرام دیا، اس کے سات بنیادی نکات تھے۔ (بدقسمتی کہ ہم آج بھی اُسی شیطانی نظام کے خلاف انہی سات نکات کی قوالیاں پیٹ رہے ہیں)۔

1- جاگیرداری ختم کر کے زمین مزارعوں میں بانٹ دی جائے۔

2- بنیادی اور بھاری صنعتیں پبلک سیکٹر میں قائم کی جائیں۔

3- سائنسی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور یونیورسٹی تک تعلیم مفت دی جائے۔

4- ملک کی خارجہ پالیسی ''سب سے دوستی اور کسی سے نہ دشمنی'' کی بنیاد پر استوار ہو۔

5- پاکستان میں وفاقی پارلیمانی نظام قائم ہو اور وفاق میں موجود صوبوں کو خودمختاری کی بنیاد پر اختیارات دیئے جائیں۔

6- ریاستوں اور قبائلی علاقوں کو ملحقہ صوبوں میں شامل کیا جائے۔

7- ملک میں تمام بولی جانے والی زبانوں کو ترقی دی جائے اور پرائمری تک تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔

کمیونسٹ پارٹی نے 1948ء میں پاکستان کسان کمیٹی منظّم کی اور سندھ میں وہاں کی

ہاری کمیٹی میں حیدر بخش جتوئی سے مل کر ہاریوں کی تحریک چلائی۔ سی آر اسلم اس عمل کا روحِ رواں ٹھہرا۔ پنجاب کے جاگیرداروں نے 1949 میں کسانوں کو وسیع پیمانے پر بے دخل کرنا شروع کر دیا تو کسانوں کے حقِ مزارعت کی حفاظت اور انہیں زمینوں پر بحال کرانے کے لیے کمیونسٹ پارٹی نے کسانوں کو منظّم کرنے کی تحریک چلائی۔ اسی تحریک میں کچھ ایسے نام ابھرے جنہوں نے مستقبل میں سی آر اسلم کے اچھے کامریڈوں کی حیثیت میں زندگی گزارنا تھی۔ یہ تھے : عطاء اللہ جہانیاں، عبدالعزیز قاصر، میاں رب نواز چاون، میاں محمد نواز چاون، صوفی اللہ داد، غلام محمد ہاشمی اور دست محمد بھچر۔ اسی تحریک کے نتیجے میں مزارعوں کے حقِ مزارعت کی تحفظ کیلئے 1951 میں قانون بنا دیا گیا۔

کمیونسٹ پارٹی ہی کی قیادت میں 1948ء میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ ترقی پسند جمہوری ادیبوں اور شاعروں نے شعروادب کی دنیا میں بلند نظری، بلند کرداری اور انسان دوستی کی شمعیں روشن کیں۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک' گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، مراد ساحر، شیخ ایاز، ابراہیم جویو، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، احمد راہی اور حبیب جالب نے شعروادب کے ذریعے' امن' آزادی' ترقی اور محبت کا پیغام دیا۔ فلمی دنیا میں فیض احمد فیض، شمیم اشرف ملک، حمید اختر، شریف متین، احمد راہی، ریاض شاہد، علاؤ الدین، طالش، عنایت حسین بھٹی اور حبیب جالب نے فلمی کہانیوں، نغموں، اداکاری اور ہدایت کاری کے ذریعے بلند نظری اور بلند کرداری کے جھنڈے گاڑ دیے۔

سلسلہ ہتھکڑیوں میں جُت جانے کا

1948 سے 1951 تک کے تین سال کمیونسٹ پارٹی کا ابتدائی دور تھا مگر اپنی کارکردگی اور سیاسی اثر ورسوخ کے اعتبار سے یہ پارٹی کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔

سی آر اسلم اپریل 1948 میں پہلی بار ''آزاد وخودمختار'' پاکستان میں مزدوروں کی ٹریڈ یونین حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی پاداش میں گرفتار ہوکر سینٹرل جیل لاہور پہنچا جہاں سے اسے میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا۔ پھر تو جیل وریل کے ساتھ سی آر اسلم کا معاشقہ ایسا زور پکڑتا رہا کہ رانجھے کو سانجھ مل گئی۔ پاکستان کی تمام حکومتوں نے کمیونسٹوں کے خلاف سخت گیر پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں کو توڑنے کے لیے متوازی تنظیمیں کھڑی کی گئیں۔ مذہب کی آڑ لے کر سوشلسٹ نظریات پر حملے کئے گئے۔

1950 کی دھائی سے پاکستان کی داخلی اور خارجی سیاست پر امریکی سامراج کی گرفت مضبوط ہونے لگی۔ چنانچہ دوطرفہ سمجھوتوں کے علاوہ پاکستان سیٹو اور سنٹو میں شامل ہوا۔

1951ء میں پارٹی پر بھرپور حملہ کیا گیا اور پارٹی کے اکثر کارکنوں اور ہمدردوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ تین سال بعد راولپنڈی سازش کیس والا کربلائی دور شروع ہونا تھا۔ جہلم کے لال خان جیسے سُچے موتی جو پکڑے گئے سو پکڑے گئے بقیہ کے دکھ کون ناپ سکتا ہے جنہیں دہشت اور

خوف و ہراس کی فضاء میں کام کرنا تھا، لوگوں کو منظّم کرنا تھا' انہیں شعور دینا تھا اور پارٹی منظّم کرنا تھی۔ بہادر سی آر اسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی مہم میں جت گیا اور کسی نہ کسی طرح خیر اور نیکی کا چراغ روشن کیے رکھا۔ 1952 میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں سی آر اسلم نے دھرم پورہ سے حصہ لیا تھا۔

چودھری صاحب نے 1950 میں شادی کر لی۔ (شریف آدمی کو اندازہ ہی نہ تھا کہ ایک سال بعد تو پھر اس پر قیامت برسنی تھی)۔ وہ 1951 میں شاہی قلعہ لاہور کا مہمان تھا جہاں کی تواضع اور مہمانداری اپنی بہیمانہ تشدد اور سادیت پسندی کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اسی عرصہ میں مچھ جیل سے رہائی کے بعد 1953 میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل سجاد ظہیر کو ملک بدر کیا گیا۔ تب پارٹی کانفرنس منعقد کی گئی، پارٹی کو از سر نو منظّم کیا گیا اور فیروز الدین منصور کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔

1954 کی دوزخی جولائی میں کمیونسٹوں پر سرکار ٹوٹ پڑی۔ پاکستان کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ دفاتر سربہ مہر، گرفتاریاں، چھاپے، پیشیاں، جاسوسیاں۔۔۔۔24 جولائی کو سی آر کو فیروز الدین منصور، مرزا ابراہیم، لال خان، سبطِ حسن، حسن عابدی، حمید اختر، رؤف ملک اور عبدالغنی سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ سنٹرل جیل خواہ لاہور کا ہو یا مچھ کا، دُھر پھٹے منہ۔ سی آر اسلم کو لاہور والی جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

خود میں نے تو اسے شطرنج کھیلتے نہیں دیکھا مگر اُس کے جیل کے دوست اسے شطرنج کا شوقین بتاتے تھے۔ پتہ نہیں کس دوست نے کہیں لکھا یا بتایا کہ سی آر اسلم شطرنج بھی گلی ڈنڈا کی طرح کھیلتا۔ اندھا دھند چالیں چل کر سامنے والے سے ہار جاتا۔ یہ دلچسپ بات بھی کہ وہ اس 1954 والی جیل میں زیادہ تر سبط حسن کے ساتھ شطرنج کھیلتا۔ جو کھیلنے سے قبل خوب سوچتا اور پھر چال چلتا۔ اور ظاہر ہے کہ سی آر ہی ہار جاتا۔

ایسا بے فکرا شخص اپنے نظریات پر کس قدر پکا اور مستحکم رہا حیرت ہوتی ہے!۔

اسے جنوری 1955 تک وہیں کے کھٹمل، اور پسو سہنے تھے۔ پھر تو زندگی بھر انڈر گراؤنڈی

والی کمیونسٹی کرنی تھی۔ سی آر نے مگر، اپنے کمیونزم کو زیرِ زمین کبھی نہ کیا، نام اور جھنڈے بگاڑ بگاڑ کر وہ کمیونزم کی ہر صورت پذیری تشکیل دے کر کرتا رہا۔۔۔ یونانی مائتھالوجی اور ہندوستانی مائتھالوجی میں وفاداری کے دیوتا کی خالی آسامی سی آر اسلم کو نہ دی گئی۔۔۔۔۔ بہت بری بات!!

کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ہی کسان کمیٹی، طلبا تنظیم، ترقی پسند مصنفین کی انجمن اور جمہوریت پسند خواتین کی انجمنوں کو بھی ممنوع قرار دیا گیا اور ان تنظیموں کے راہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔

اب چونکہ کمیونسٹ پارٹی کے نام سے سیاسی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے دوسرے ذرائع استعمال کرنے پڑتے تھے۔ چنانچہ راستہ یہ نکلا کہ سی آر اسلم اور اس کے ساتھیوں نے ملٹی کلاس پارٹی میں رہتے ہوئے طبقاتی تنظیموں کو دوبارہ منظّم کرنا شروع کر دیا۔ مزدوروں میں کام کرو، کسانوں کی کمیٹیاں زندہ رکھو، اور رسالہ نکالو۔

اپریل 1963 میں جناب سی آر اسلم کی قیادت میں مغربی پاکستان کے کسان کارکنوں کا ایک وسیع کنونشن خانیوال میں منعقد ہوا جس میں مغربی پاکستان کی سطح پر از سر نو کسان کمیٹی کو منظّم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کانفرنس میں جن مطالبات کو بنیاد بنا کر جدوجہد شروع کی گئی ان میں جاگیرداری کا خاتمہ کر کے وڈیروں اور زمینداروں سے حاصل کردہ زمین بلا معاوضہ مزارعوں اور چھوٹے مالک کسانوں میں تقسیم کرنا، سرکاری زمین کی نیلامی بند کرنا، اور یہ زمین مزارعوں اور کم مالک کسانوں کو بلا معاوضہ دینا، چھوٹے مالکان کو مالیہ سے مستثنیٰ قرار دینا وغیرہ شامل تھے۔

اسی اثنا میں 1967 میں اس نے ایک ٹریڈ یونین کانفرنس لاہور میں منعقد کر کے پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کو دوبارہ زندہ کیا۔ اسی طرح ویسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں بنالی۔

واضح رہے کہ پارٹی نے 1948 سے 1954 تک یکے بعد دیگرے ''جہاں نما، سحر، سازِ نو اور نیا وطن'' نامی ہفت روزے نکالے۔ لیاقت علی خان کا مکّا کسی اور کو خیر کیا لگتا، کمیونسٹوں پر البتہ خوب برسا۔ اس کافر ذہنیت نے پارٹی کا کوئی اخبار دو ماہ سے زیادہ تک نہیں چلنے دیا اور وہ ہر ایک کو

بند کرتا رہا۔اسے تو جماعت اسلامی کا اعزازی بانی سربراہ قرار دیا جانا چاہیے تھا۔

1954 کی پابندی کے بعد بھی کمیونسٹوں نے بہرطور ہفت روزہ اخبارات جاری رکھے۔ پہلے ہفت روزہ ''آفاق'' (محنت ایڈیشن)' پھر چنگاری ہفت روزہ نگار، ہفت روزہ ''پارس'' کی صورت میں پارٹی ترجمان اخبارات نکلتے رہے۔ یہ سب اخبارات پہلے سے چل رہے تھے، سی آر انہیں کرائے پر حاصل کرتا تھا۔

چونکہ کمیونسٹ پارٹی کے نام سے سیاست نہیں ہوسکتی تھی اس لیے سی آر'لال خان اوران کے دوسرے یاروں نے ''بھیس بدل بدل کر وصل یار'' والی تاریخ بناڈالی۔سی آر اسلم جاگیرداری مخالف اور سامراج دشمن جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے مولانا بھاشانی کے ساتھ عوامی لیگ میں جا گھسا۔اس کی قیادت میں مغربی پاکستان کے جاگیردار شامل نہ تھے بلکہ مشرقی پاکستان کی مڈل کلاس زیادہ تھی .....لیکن مڈل کلاس بھی تو موقع پرست ٹولہ ہوتی ہے۔سی آر اسلم اس پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا۔

جب1956 میں انگریزی سامراج نے نہر سویز پر چڑھائی کی تو یہ نام نہاد لبرل جمہوریت کی علمبردار عوامی لیگ جواُن دنوں حسین شہید سہروردی کے روپ میں برسرِ اقتدار تھی اپنے روایتی حلیف سامراج کے ساتھ جا کھڑی ہوگئی۔اور سہروردی نے یہ بیان دے دیا کہ زیرو+زیرو=زیرو۔لہٰذا انگریز نے نہر سویز پر حملہ کر کے ٹھیک کیا۔

سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ بلوائی گئی کہ پارٹی لیڈر کے اس بیان پر بحث کر کے درست لائن اپنالی جائے مگر سہروردی اوراس کے ساتھی نہ مانے۔ چنانچہ سی آر اوراس کے سامراج دشمن ساتھی میدان میں نکل پڑے اورشہر شہر برطانوی حملے کی مذمت کے لئے جلوس نکالنے شروع کر دیے۔نتیجہ یہ کہ مشرقی پاکستان کے مولانا بھاشانی اور مغربی پاکستان کے سی آر اسلم ساتھیوں سمیت عوامی لیگ سے نکال دیے گئے۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی کمیونسٹوں پر تو افتاد پڑی ہی تھی لیکن مسلم لیگ میں انگریزوں اورامریکیوں کے مفادات اور جاگیرداروں کی اقتدار کیلئے رسہ کشی کے نتیجے میں آئے روز نئے نئے

گروپ اورنئی نئی پارٹیاں بننے لگیں۔مہاجروں کی آبادکاری پر اختلاف کے نتیجے میں مسلم لیگ سے میاں افتخارالدین نے پنجاب کے کچھ ساتھیوں سمیت الگ ہوکر آزاد پاکستان پارٹی بنالی تھی۔

چودھری صاحب 1957 میں ڈھاکہ کانفرنس میں اپنے دوسرے رفیقوں لال خان' خواجہ رفیق' میاں محمود رحمٰن مولوی' عبیداللہ' خواجہ مظہر' اسلم ریڈیو' اور سید سبط الحسن ضیغم کے ساتھ شرکت کے لیے وہاں چلا گیا۔اور وہاں نیشنل پارٹی بنی جس میں سرحد کے خدائی خدمتگار، بلوچستان کے روشن خیال لیڈران خان عبدالصمد اچکزئی اور غوث بخش بزنجو، اور سندھ کے عبدالمجید سندھی، عثمانی، جی ایم سید اور حیدر بخش جتوئی شامل تھے۔کچھ عرصہ بعد اسی نیشنل پارٹی میں عوامی لیگ سے نکالے گئے، مولانا بھاشانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آن ملا تو اس ملک گیر بڑی سامراج دشمن پارٹی کا نام نیشنل عوامی پارٹی ہوگیا۔سارے کسان، مزدور، طلبا اور ترقی پسند دانشور نیپ میں چلے گئے اور اپنے پروگرام کے حصول کی جدوجہد میں لگ گئے۔ بھاشانی صدر تھا، محمود الحق عثمانی جنرل سیکرٹری۔اورسی آر اسلم پنجاب کا صدر منتخب ہوگیا اور کام جاری رہا۔1956 کا آئین بن چکا تھا، اور مسلم لیگ نے 1958 میں الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا۔الیکشن کی تیاری شروع ہوئی۔

نیشنل عوامی پارٹی، قیوم کی سربراہی والی مسلم لیگ، اور سہروردی کی عوامی لیگ بڑی بڑی پارٹیاں تھیں۔ نیپ جاگیردار دشمن تھی، سامراج مخالف تھی، سیٹو سنٹو کے خلاف تھی، آزاد خارجہ پالیسی کے حق میں تھی، ملک میں جمہوریت چاہتی تھی' صوبوں کی بحالی اور صوبائی خودمختاری چاہتی تھی، منصوبہ بند صنعتی ترقی چاہتی تھی اور پڑوسیوں کے ساتھ دوستی چاہتی تھی۔

انہی نکات کی بنیاد پر وہ الیکشن میں کود گئی۔الیکشن میں کام کے دوران عوامی لیگ بھی بہت سی باتوں میں متفق نظر آئی۔ پاکستانی سرکار اوراس سرکار کے سردار امریکہ نے دیکھا کہ الیکشن میں نیپ اور عوامی لیگ جیت جائیں گی اوران کے لئے بڑا مسئلہ ہوگا اور روس کے خلاف ان کا قائم کردہ محاذ ختم ہوجائے گا۔

لہٰذا ایوب کے ذریعے 7 اکتوبر 1958 میں مارشل لاء لگوادیا گیا۔ سیاست غیر قانونی قرار دی گئی، ساری پارٹیوں پر پابندی لگادی گئی اور لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔سی آر اسلم پھر

جیل میں ۔اوراس بار مرزا ابراہیم،اور فیروز الدین منصور کے ساتھ شاہی قلعہ لاہور میں ۔

واضح رہے کہ اگر 1958 کے انتخابات ہو جاتے تو اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی کوئی حکومت بھی امریکی سامراج کے اثرات کے خاتمے اور جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کے مطالبات کو نظر انداز نہ کرسکتی تھی۔ایوب مارشل لا کے سیاسی اور معاشی اسباب یہی تھے۔(11)

اِسی سیاسی پس منظر میں ایوب کو عوامی بے چینی کو دور کرنے کیلئے 1959 میں زرعی اصلاحات کا اعلان کرنا پڑا۔ان زرعی اصلاحات کے ذریعے حدِ ملکیت کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا۔ تاہم زرعی معیشت کا بنیادی ڈھانچہ جوں کا توں قائم رہا۔ان زرعی اصلاحات کی رو سے حدِ ملکیت پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی فی کس رکھنے کی اجازت دی گئی۔ 250 ایکڑ نہری یا 500 ایکڑ بارانی زمین عزیز و اقارب کو منتقل کرنے کی اجازت تھی۔ پچاس ایکڑ نہری، باغ یا سٹڈ فارم کے نام پر رکھنے کی اجازت تھی۔

1960 میں ایوب خان نے سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھالی۔

کسی الیکشن، اور اُس کے نتیجے میں ایک آئینی قانونی ادارے کی موجودگی کے بغیر ہی 1962 میں ایک آئین مسلط ہوا۔اس ایوبی آئین کے خلاف ایک زبردست تحریک کا آغاز ہوا ۔ایک طرف پارلیمانی جمہوری آئین کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اور دوسری طرف محنت کش طبقات سیاسی طور پر متحرک ہوئے۔سی آر اسلم پھر میدانِ سیاست میں موجود تھا۔

اپریل 1963 میں اُس نے ایک بار پھر کسانوں کی تنظیم بنانے کے لئے پانچے چڑھائے۔اس نے ملک کے کونے کونے کے دورے کیے، جلسے کیے،جلوس نکالے اور کانفرنسیں منعقد کیں۔1963 میں سیاست سے پابندیاں ہٹیں۔ڈھاکہ میں نیپ کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں پارٹی کو بحال کرنے کا فیصلہ ہوا۔سی آر کو دوبارہ پنجاب پارٹی کا صدر بنادیا گیا۔اور وہ پھر سوشلزم کا پرچم تھامے پارٹی کو چلانے آگے بڑھنے لگا۔

ایوب خان کے مارشل لا میں روشن فکری کی تحریک کو پارٹی کی بندش کے بعد اور بھی بڑے دھچکے لگے۔ایک تو یہ ہوا کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو ضبط کرلیا گیا۔ پاکستان ٹائمز، امروز جیسے

مقبول روزنامے چھن گئے، اور رسالہ لیل و نہار مارشل لا کی بھینٹ چڑھا۔دوسری افتاد یہ پڑی کہ معروف سیاسی کارکن حسن ناصر کو پولیس کی حراست میں ہلاک کردیا گیا جس نے کراچی کے کامریڈز کو باہم اس طرح تقسیم کردیا کہ وہاں زندگی بھر دوبارہ متحدہ کمیونسٹ پارٹی کبھی نہ بن سکی۔

1964 میں نیشنل عوامی پارٹی نے جنرل ایوب کے مقابلے میں فاطمہ جناح کو صدارت کے لئے امیدوار نامزد کیا اور اُس کے تمام ورکر اور ہمدرد زور شور سے فاطمہ جناح کے لیے کام کرنے لگے۔

نیشنل عوامی پارٹی اپنے کردار اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے عجیب مکسچر پارٹی تھی۔ شیر، بکری، آدمی، کلہاڑی، درخت سب کچھ کو یکجا کردیا گیا تھا۔اس کثیر الطبقاتی ملغوبے میں ہر گروہ اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتا تھا اور نیپ کی عمومی سامراج دشمنی، ون یونٹ کے خاتمے اور جمہوریت کے قیام کے علاوہ کسی اور نکتے پہ ایک طبقے کا دوسرے سے اتفاق نہ تھا۔اس بڑی متحدہ محاذ والی پارٹی کے اندر طبقاتی سیاست زور و شور سے جاری تھی۔سی آر بائیں بازو کا ترجمان تھا۔اس نے 1964 کے ماہ نومبر میں سائنٹفک سوشلزم کی وضاحت' تشریح اور تشہیر کی مہم کا آغاز ''آفاق محنت ایڈیشن'' لاہور سے شروع کیا۔پھر ''پارس'' لائلپور اور ''نگار'' لاہور کے مالکان سے ہفتہ وار تعاون لیا ۔اور ایک زبردست قسم کی نظریاتی لڑائی لڑی۔

خیبر پختونخواہ صوبہ میں ایک گروہ نے تو 1968 میں کسان کمیٹی، ٹریڈ یونین وغیرہ میں کام کرنے والوں کے لیے راستہ بند کر کے نیپ کو جاگیردار و سرمایہ دار طبقے کے رجعت پسند مفادات کے تابع بنانے کی کوشش کی۔(پارس لائلپور، یکم اپریل 1968)۔اس شمارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ 16-17 مارچ نیپ کے اجلاس میں ولی خان نے تین گھنٹے تک اس قرارداد کی حمایت کی کہ نیپ کا کوئی کارکن کسانوں اور محنت کشوں کی تنظیموں کو نہ بنائے گا نہ ان میں کام کرے گا۔نہ ہی کسانوں اور مزدوروں کی تنظیموں کا کوئی رکن نیپ کا رکن رہ سکے گا۔

وہاں مردان میں صوبائی پارٹی کی کونسل کی میٹنگ ہوئی جس میں نہ صرف یہ کہ افضل بنگش کو جنرل سیکرٹری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا بلکہ بانگ دھل نیپ کے دروازے کسان کمیٹی اور

طبقاتی انجمنوں میں کام کرنے والے کارکنوں کے لیے مستقلاً بند کر دیے گئے۔ (پارس 15 اپریل 1968)۔ شگاف تو موجود تھا، اسے وسیع تر ہوتے رہنا ہی تھا۔ اس لیے کہ سی آر اسلم کے ساتھی تو کام ہی دوستونوں پہ کر رہے تھے: 1۔ سامراج دشمنی، 2۔ جاگیردارانہ نظام دشمنی۔

اور جب آپ جاگیرداروں کے نظام کو گرا دینے کی بات کرتے ہو تو کسانوں میں کام کرنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ ہم پارس لائلپور 29 اپریل 1968 میں یہ لکھا دیکھتے ہیں:

''سب سے پہلے ہمیں پاکستان میں سامراجی اثرات سے نجات اور جاگیرداری زرعی نظام کے خاتمے کی جدوجہد کرنی چاہیے''۔

اچھا یہ جو ہم سمجھتے رہے کہ نیپ بھاشانی سوشلسٹ پارٹی اُس وقت بنی جب بھاشانی نے ''اسلام علیکم'' کہا تھا، تو یہ بات غلط ہے۔ معاملہ بالکل الٹ ہے۔ یہ ڈویلپمنٹ بہت دلچسپ تھی۔ ہم مزید پڑھتے ہیں کہ 24 جون 1968 کے پارس میں لکھا ہوا ہے:

''پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں نیپ کے اندر جو جدوجہد جاری تھی وہ نظریاتی قیادت سے تعلق رکھتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا نیپ کی نظریاتی لیڈر شپ وہ لوگ کریں گے جو پیٹی بورژوا یا سرمایہ دارانہ آزاد خیالی کے مبلغ ہیں، یا وہ لوگ کریں گے جو ملک میں مزدور کسان طبقہ کے نظریات کے مبلغ اور سوشلزم کے سچے علمبردار ہیں۔ یہ جدوجہد ایک حد تک جیتی جا چکی ہے کہ اس وقت نیپ کے وہ عناصر جو کسان مزدور کے نام سے خائف اور نام نہاد سرمایہ دارانہ آزاد خیالی کے فریفتہ ہیں پارٹی سے الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس جدوجہد کی صحیح کامیابی صرف اسی وقت ممکن ہے جب خود کسان اور مزدور تحریکیں مضبوط ہوں اور نیپ کی ریڑھ کی ہڈی کا کام کریں''۔

ایک ہفتے کے بعد یکم جولائی 1968 کو پارس نے میر غوث بخش بزنجو کو 14 سال قید اور پانچ ہزار روپے جرمانہ کی سزا کے حکم کی خبر شائع کی اور تفصیلاً اس سزا کی غلطیوں کو بیان کیا۔

سی آر اسلم جولائی 1968 کو نیپ مغربی پاکستان کی جنرل کونسل اجلاس میں صدر بنا، اور میاں شاہین شاہ جنرل سیکرٹری۔ کونسل نے سامراج دشمن جاگیردار دشمن پروگرام کی بنیاد پر متحدہ محاذ کی تشکیل کے امکانات معلوم کرنے کے لیے کمیٹی بنائی۔ نیز پاکستان میں مزدوروں کسانوں اور

درمیانہ طبقہ، انقلابی دانشوروں اور پیٹی بورژوا طبقہ کے عوام کے اشتراک عمل سے سوشلزم کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دینے کا اعلان کیا۔ (پارس لائلپور 15 جولائی 1968)۔

اس موقع پر ایک عجیب بات ہوئی۔ میں آپ کے سامنے 25 دسمبر 1968 کا ''نگار'' اخبار رکھتا ہوں۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ: ''جھنگ نیپ کے کارکنوں کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے نیپ بھاشانی کا نام تبدیل کر کے پاکستان سوشلسٹ پارٹی رکھنے کا مطالبہ کیا گیا''۔ سات ماہ بعد (26 جولائی 1969) کو ''پارس'' میں یہ ٹکڑا چھپا: ''نیپ نے جب اپنے منشور میں سوشلزم کی حمایت کی شق درج کی تو اس وقت سے دوسرا گروہ بے چین ہو گیا تھا اس لیے کہ وہ عملی سیاست میں سرمایہ دارانہ جمہوریت سے ایک قدم بھی آگے جانے کو تیار نہ تھا''۔ پھر بالآخر 1969 سے خواجہ محمد رفیق کے نام پہ ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' کا ڈیکلریشن مل گیا جو باقاعدگی سے چھپنے لگا۔ 1969 سے لے کر سی آر اسلم کی وفات 2007 تک یہ اخبار سیاسی کارکنوں کی کم و بیش دو نسلوں کی سیاسی تربیت کرتا رہا۔

سی آر اپنے سیاسی کارکنوں سے رابطے کے لیے دورے بھی کرتا تھا اور جگہ جگہ ایک آدھ دن رہ کر ورکرز کی تربیت بھی کرتا تھا۔ مگر ہفت روزہ عوامی جمہوریت تو گویا اس کی سیاست کے لیے ناف کی رگ تھی۔

اس کے بعد تو بقیہ پوری زندگانی ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' سی آر کی توجہ کا مرکز رہا۔ سی آر اسلم نے ہزاروں نظریاتی، سیاسی، فلسفیانہ اور معاشی مضامین لکھے جو ابھی تک کتابی شکل نہ پا سکے۔

اس کی کچھ شائع شدہ کتابوں کے نام یہ ہیں: علم المعیشت، پاکستان میں سوشلسٹ تحریک کا جائزہ، جدید نوآبادیاتی نظام، نیشنل ازم کے کئی چہرے، ''عالم اسلام روبہ زوال کیوں ہے'' علامہ اقبال میری نظر میں'' پاکستان میں طبقات اور طبقاتی کشمکش، اکتوبر انقلاب، پاکستان میں سوشلزم کا راستہ اور ''مسئلہ کشمیر..... جنگ اور امن''۔

روس چین قبائلی جھگڑا

یہاں ایک اور بدقسمتی منتظر تھی۔ روس چین آپسی مخالفت شروع ہوگئی۔ ہوا یوں کہ چیکو سلواکیہ میں دنیا بھر کے کمیونسٹوں کی مشہورِ زمانہ کانگریس ہوئی جس میں چینی بھی تھے اور روسی بھی۔ وہیں ان دونوں پارٹیوں کا اختلاف ہوگیا۔ چینیوں نے تجویز پیش کی کہ کمیونسٹ چونکہ کھلے عام آپس میں نہیں لڑتے اس لیے ہم دونوں پارٹیاں بھی کھلے طور پر نہیں لڑیں گی۔ مگر خروشچیف نہیں مانا اور برسرِ عام اختلاف کیا۔ سی آر اسلم کے دوستوں کو فوراً سمجھ آ گئی۔ اور انہوں نے روس چین جھگڑے میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور مارکسزم لینن ازم کے اصولوں کے مطابق ہی کام کرتے رہنے پہ ڈٹے رہے۔ سی آر اسلم کی نظریاتی اصابت کا یہ عالم تھا کہ وہ بیجنگ اور ماسکو کی تقسیم کی غلط بحث میں نہیں الجھا۔ اس کی زیرِ ادارت (1968 چلنے والے اخبار ''پارس لائٹ پور'' میں جگہ جگہ اس بات کا اعادہ موجود ہے کہ پارٹی روس چین جھگڑے میں نہ الجھے گی اور اپنی آزاد پالیسی پر چلے گی۔ اور وہ آزاد پالیسی تھی سامراج دشمنی اور فیوڈلزم مخالفت۔ اسی لیے نیپ بھاشانی میں رہتے رہتے 1970 کے الیکشن کے بعد جب اس نے خانیوال کنونشن میں اپنی پارٹی (پاکستان سوشلسٹ پارٹی) بنالی تو اس کے منشور کے دیباچے میں بھی یہی تحریر تھا کہ ''روس چین اختلاف موجود ہے اور وہ دونوں بڑی پارٹیاں ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ نہیں جائیں گے اور یہاں کے حالات کے مطابق کام کریں گے۔ ہم

کون غلط ہے کون صحیح ہے، کے چکر میں نہیں پڑیں گے''۔ بس ''پارس'' کے ایک اہم ٹکڑے پر، اور اہم اپنا یہ چیپٹر ختم کریں گے۔

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح بنگالی مشرقی پاکستان کی زبان ہے بالکل اسی طرح سندھی پشتو بلوچی اور پنجابی بھی علاقائی زبانیں ہیں۔ ہماری حکومت خوشی سے یا مجبوری سے ایک طرف تو بنگالی کو اردو کی طرح قومی زبان کا مرتبہ دینا قبول کرتی ہے جو ہر لحاظ سے درست ہے مگر دوسری طرف مغربی پاکستان کی زبانوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی اور اسی ڈگر پر چل رہی ہے جو اُسے اپنے پیشرو حکمرانوں سے ترکے میں ملی ہے۔ علاقائی زبانوں کے پھیلنے پھولنے میں رکاوٹ ڈالنا یا ان کی سرپرستی سے اغماز برتنا ان تہذیبوں کا گلہ گھونٹنا ہے جو ان علاقوں کے عوام کی ہزار ہا سال کے ارتقا میں پروان چڑھی ہیں''۔ اُس وقت کے پارٹی ترجمان ''نگار'' میں ون یونٹ کے خاتمے کے حق میں چار مدلل و جامع مضامین موجود ہیں۔

ستر کی دَھائی، بڑی دَھائی

لاڑکانہ ورنہ تھانہ

ایوب خان کے سکرات کو ذوالفقار علی بھٹو نے اُس سے علیحدہ ہوکر اور اپنی پیپلز پارٹی بنا کر مختصر کر دیا، مگر اس طرح کر کے اُس نے نظام کو بچا لیا۔ بائیں بازو کے ورکرز کو اپنے اندر کھپانے کی ہر دور میں منظّم کوششیں کی گئیں۔ اُس زمانے میں یہ کام بھٹو کے ذمے لگا۔ چُن چُن کر بڑھاپے کے لرزتے دانتوں کی مانند لڑکھڑانے والے ورکروں اور لیڈروں کو اس نے اپنی پارٹی کی عمارت کی اینٹیں بنانا شروع کر دیا۔ بہت ہی کینہ پرور شخص تھا وہ۔ کوئی اخلاقیات، رواداری اُس میں نہ تھی۔ اپنی ذات کے ساتھ وفاداریوں میں وہ کلیسا کے پوپ جیسا تھا: ''جو دوسرے کی پارٹی میں جائے غدار ہے اور جو ہماری پارٹی میں آئے وہ نو عیسائی ہیں''۔ یہ بتاتے چلیں کہ اُس نے جب پارٹی کے قیام کی خاطر لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر میٹنگ رکھی، تو سی آر اسلم کو بھی بلا لیا۔ وہ وہاں چلا تو گیا مگر کمرے سے باہر بیٹھا رہا۔ بھٹو خود آ کر اسے اندر لے گیا۔ بھٹو نے پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کیا، تاہم اصرار کے باوجود سی آر اسلم اُس میں شامل نہ ہوا۔ بعد میں اسے وزارت کی پیشکش ہوئی۔ مگر یہ تو ایسی ہی مضحکہ خیز پیشکش تھی جیسے بلوچ روایتوں سے ناآشنا اویس غنی جیسا چھوٹا شخص بڑے اکبر بگٹی کو ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کرے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ انقلاب کے متوالے جوق در جوق دائرۂ بھٹو میں داخل ہونے لگے۔۔۔۔۔۔اور اسے اقتدار دلا کر بہت بے عزت ہو ہو کر وہاں سے نکلتے رہے۔ آسمان میں لکھا تھا کہ اِن ''انقلابیوں'' نے نہ بھٹو اور ملّا کو ثر نیازی کی دام زلف سے باہر آنا تھا، اور نہ اِن لفاظ و موقع شناس پیپلی لال بخشوں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا۔۔۔۔۔۔بھٹو کو ثر نیازی کے فلسفہ کی سفید چھڑی تھامے، امامت کو ضیاء الحق تک بحفاظت پہنچا کر تاریخ کے پھندے پہ چڑھ گیا اور پیپلز پارٹی کے لیفٹ والے بے قراری و بے سمتی کے جنگل میں ہاتھ کی لکیریں سُدھانے سلجھانے' ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔سی آر سلامت ایمان کے ساتھ زندگی کی آسائشوں سے محروم و بے نیاز دو سے تین بننے کی جدوجہد میں جتا رہا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس

جمہوری حقوق کے لیے عوام الناس کے بپھر جانے کے نتیجے میں سرکار نے گھٹنے ٹیک دیے اور 1969 کا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ایوب چلا گیا، اور ایک عدد اور مارشل لا کے ساتھ یحییٰ خان آیا۔ اس نے جلد انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔

ان انتخابات میں مزدوروں کسانوں اور پسماندہ طبقات کو اپنے مخالف طبقہ کے امیدواروں کے بجائے اپنے طبقہ کے امیدواروں کو منتخب کرنے کا شعور اجاگر کرنے کے لیے ایک ملک گیر کسان کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز ہوئی۔ سی آر اسلم اپنے رفیق خاص میاں محمود کے ساتھ گھر سے نکلا اور قریہ قریہ گاؤں گاؤں جا کر پارٹی کارکنوں، کسانوں، مزدوروں اور نوجوانوں کو متحرک کیا۔ اُس نے شاہ عنایت کے عظیم نعرے ''جو کھیڑے وہی کھائے'' کو اس کانفرنس کا نعرہ بنا دیا۔ اُس کے تخلیقی ذہن نے ''چلو چلو ٹوبہ چلو'' کا زبردست نعرہ دیا۔ جلسہ جلوس، اخبار، پمفلٹ پوسٹر ہر جگہ اس نعرے نے تجسس و دلچسپی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس شخص نے جس طرح اس تاریخی کسان کانفرنس کی تیاری، انتظامات اور انعقاد میں راہنمائی کی وہ اُس کی سوانح عمری کا ایک سنہرا باب ہے۔

23 مارچ 1970 کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مقام میں ایک بڑی کسان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بے شمار انسانوں نے حصہ لیا۔ لاہور سے ٹوبہ ٹیک سنگھ تک ایک خصوصی ''کسان ٹرین'' چلی جس پر نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی کے سربراہ مولانا بھاشانی نے سفر کیا۔ اور راستے میں ہر ریلوے سٹیشن پر کسانوں سے خطاب کیا۔ یہ بائیس سال میں کسانوں کی پہلی بہت بڑی ریلی تھی جس کے لیے کمیونسٹ کارکنوں نے گاؤں گاؤں جا کر اس کسان کانفرنس کی اہمیت سمجھانے اور انہیں جوق در جوق اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے تیار کیا تھا۔

اس کانفرنس میں انجمن ترقی پسند خواتین، لسبیلہ کسان کمیٹی، اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے وفد محترمہ کنیز فاطمہ کی قیادت میں، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے وفد فیض بلوچ کی قیادت میں، ہفت روزہ لیل ونہار کے وفد فیض احمد فیضؔ اور انیس ہاشمی کی سربراہی میں شامل ہوئے۔ اسی طرح رسول بخش پلیجو، میر محمد تالپور اور دیوان روچی رام کی قیادت میں سندھ کے کسانوں، طالب علموں اور سیاسی گروہوں کے وفد شریک ہوئے۔ بلوچستان سے کسانوں کے دو وفود آ گئے۔ ایک روہڑی کے راستے خالد خان کی قیادت میں اور دوسرا ڈیرہ اسماعیل خان کے راستے عبدالرحیم مندوخیل کی قیادت میں۔ ان دو وفود کے علاوہ محمد رحیم خان، عبداللہ خان، خان محمد، محمد رفیق، ابراہیم، عبدالاحد، انور خان، کرم خان اور صاحب خان بھی بلوچستان سے کانفرنس میں پہنچے۔

یہ دو لاکھ انسانوں کا اکٹھ تھا۔ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد اور سماج میں اس کے اثرات جاننے کے لیے ہم 19 اپریل 1970 کو سی آر اسلم (مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے صدر) کی لاہور پریس کانفرنس کے اقتباسات یہاں نقل کرتے ہیں:

''ہمارے نزدیک ملک کو خوراک اور پوشاک میں خود کفیل بنانے، دیہات کے عوام کی غربت افلاس، بے روزگاری اور دوسرے معاشی و سماجی مسائل کو حل کرنے اور معاشی اور سماجی برائیوں سے نجات دلانے اور صنعتی ترقی کے لئے راستہ ہموار کرنے کے لیے، مغربی پاکستان میں معاشی مسائل کو حل کرنے اور مغربی پاکستان کے موجودہ زرعی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک زمینوں سے وڈیروں، بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی

ملکیت ختم نہیں کی جاتی اور سرکاری اراضی صرف بے مالک ہاریوں اور کسانوں کو نہیں دی جاتی اور چھوٹے مالک کسانوں پر سے مالیہ کا بوجھ ختم نہیں کیا جاتا، ہمارے دیہات کے 85 فیصد عوام غربت سے نجات نہیں پا سکتے۔ زرعی خام مال کی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ملک معاشی لحاظ سے ترقی کر سکتا ہے اور نہ عوام خوشحال ہو سکتے ہیں اور ملک طاقتور اور مضبوط نہیں بن سکتا۔

''پاکستان میں جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی اس اہم اور بنیادی مسئلے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ ملک کی 85 فیصد آبادی زراعت میں لگی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم غلہ کی کمی کو دور نہیں کر سکے۔ اور دوسری طرف دیہاتی عوام کی غربت کم ہونے کے بجائے پہلے سے بڑھ گئی ہے اور وہ محنتِ شاقہ کے باوجود فاقوں سے دوچار ہے۔ اور زندگی کی معمولی سے معمولی آسائش سے بھی محروم ہے۔ اس احساس محرومی نے انہیں مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ شہری عوام، طلبا، اور دانشوروں پر زرعی مسائل کی اہمیت واضح کی جائے۔ ان کو دیہات کے کھیت مزدوروں، مزارعوں، ہاریوں، چھوٹے مالک کسانوں، درمیانے مالک کسانوں اور دیہی دستکاروں کی مشکلات اور مسائل سے روشناس کرایا جائے۔ اور مغربی پاکستان کے کسانوں کو بیدار کیا جائے، ان میں اپنے مسائل کو حل کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان کی خود اعتمادی کو ابھارا جائے اور ان میں اپنے حقوق کو حاصل کرنے کا شعور پیدا کیا جائے۔ تاکہ وہ دوسرے محنت کش عوام کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم، آزاد، جمہوری اور خوشحال پاکستان کی تعمیر کے لیے سرگرم عمل ہوں۔

''اس وقت جبکہ ملک میں آئین ساز اسمبلی کے قیام اور انتقالِ اقتدار کا چرچا ہو رہا ہے۔ ملک کی 85 فیصد آبادی کو جگانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ دبے اور کچلے ہوئے کسان سینہ تان کر میدان میں آ جائیں اور جاگیرداروں، اجارہ دار سرمایہ داروں اور امریکی سامراج کے ہم نواؤں کی ہر قسم کی سازش سے پاکستان کو بچائیں۔

''اس کسان کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کسانوں کے طبقاتی شعور کو بڑھا کر انہیں

طبقاتی تنظیم میں مجتمع کر کے طبقاتی جدوجہد کی راہ دکھا کر مفاد پرست وانتشار پسند عناصر کی پھیلائی ہوئی گمراہی، تعصّبات، تنگ نظری اور خودغرضی سے انہیں بچایا جائے''۔

مالی وسائل کی کمی کے باوجود اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے ایک لاکھ ہینڈ بل اور پچاس ہزار پوسٹر شائع کر کے دیہات میں تقسیم کیے گئے تھے۔ یہ ہینڈ بل و پوسٹر اس کے علاوہ تھے جو ضلعی کسان کمیٹیوں نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر دیہاتوں میں تقسیم کیے تھے۔ اس کے علاوہ کارکنوں نے دیہات کے دورے کیے۔ سینکڑوں جلسے اور میٹنگیں کیں۔ ہر بستی اور گاؤں میں کسانوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کی خبر پر خوشی کا اظہار کیا۔ اور اس میں شریک ہونے کے لیے مغربی پاکستان کے کونے کونے سے کسان آئے۔ وہ لال جھنڈے اٹھائے سرخ ٹوپیاں پہنے عزم و اتحاد کا پیکر نظر آتے تھے۔ ان کے چہروں پر خود اعتمادی چھلکتی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں تابناکی پائی جاتی تھی۔

اس بھرپور کانفرنس نے یہ واضح کر دیا کہ مفاد پرستوں کا گٹھ جوڑ، اور محلاتی سازشیں مسائل کو حل نہیں کر سکتیں۔ انہیں محنت کشوں کی متحدہ جدوجہد ہی حل کر سکتی ہے۔ اس کانفرنس نے جس میں ہر صوبے سے کسان آ کر شریک ہوئے تھے یہ ثابت کر دیا کہ صوبائی تعصّبات، ذات برادری، رنگ و نسل کی تمیز سامراج، جاگیرداراور اجارہ دار سرمایہ دار پیدا کرتے ہیں۔ اور محنت کشوں کا اتحاد اس تفریق اور تمیز کو مٹاتا ہے۔

کانفرنس میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ سرکاری اراضی صرف بے مالک مزارعوں، ہاریوں اور چھوٹے مالکوں میں تقسیم کی جائے۔ اراضی کی حد ملکیت سوا ایکڑ مقرر کی جائے۔ اور باقی اراضی کا مالک مزارعوں کو بنایا جائے۔ ساڑھے بارہ ایکڑ تک کے مالکان کا مالیہ معاف کیا جائے۔ مالیہ انکم ٹیکس کی بنیاد پر تشخیص کیا جائے۔ آبیانہ کم کیا جائے۔ پیشہ وارانہ ٹیکس منسوخ کیا جائے۔ بے دخلیاں بند کی جائیں۔ طبقاتی نمائندگی کا اصول تسلیم کیا جائے۔ سامراجی سرمایہ ضبط کیا جائے۔ امریکی سامراج کی سازشوں اور مداخلت کو ناکام بنایا جائے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس نے اعلان کیا کہ ''ریاستی اقتدار پر قبضہ جاگیرداروں، سرمایہ

داروں اور سامراج کے ہم نواؤں کا رہا ہے۔ یہ طبقے اب پھر برسر اقتدار آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ریاستی اقتدار کے اصل مالک یعنی ملک کے عوام اس سے آج تک محروم ہیں۔ اب وہ بیدار ہو گئے ہیں اور ریاستی اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ استحصالی طبقے انہیں کہہ رہے ہیں کہ اس کے لیے الیکشنوں کو کام میں لاؤ۔ جب عوام کہتے ہیں کہ طبقاتی نمائندگی دو تو یہ طبقے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کیا عوام خاموشی سے اقتدار سے محرومی قبول کر لیں؟۔ اور اپنے جمہوری حق سے دست بردار ہو جائیں اور اس کے لیے جدوجہد نہ کریں؟''

واضح رہے کہ دسمبر 1970 میں الیکشن ہونے تھے۔ اِس کانفرنس نے انتخابی ماحول ہی کو بدل کے رکھ دیا۔ وہ یوں کہ فوراً ہی بڑی سے بڑی رجعتی اور زرعی اصلاحات کو کفر قرار دینے والی سیاسی جماعتوں نے بھی اپنے منشور میں زرعی اصلاحات کا ذکر شروع کر دیا۔

پیپلز پارٹی نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کی نفسیات کو خوبصورتی سے پڑھ کر اپنی لفاظی کے سارے دراسی کی مطابقت میں کھول دیئے۔ اور اپنی الیکشن مہم تقریباً انہی نقاط پر چلائی۔ تاریخ کا مذاق دیکھیے کہ کانفرنس ہم نے کی، کانفرنس کے نتیجے بھٹو نے چُنے۔ عوام نے بھاری اکثریت سے اس پارٹی کو ووٹ دیئے اور وہ بادشاہ بنا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ محنت ہمارے نظریات والے کرتے ہیں اور ہماری محنت کا پھل جاگیرداروں کی پارٹیاں کھاتی ہیں۔ وہ کتنے چالاک اور ہم کس قدر معصوم۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کا صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی تھا۔ قصور گردیزی نائب صدر، سی آر اسلم جنرل سیکرٹری اور میاں محمود احمد اس کا فنانشل سیکرٹری تھا۔ سردار شوکت علی، میاں شاہین شاہ، خالد خان، عابد حسن منٹو، راؤ مہروز اختر، چودھری فتح محمد، میاں عارف افتخار، جمال خان بلوچ، اور کنیز فاطمہ مجلس عاملہ کے ممبران تھے۔

اسی دوران عام انتخابات کے لیے پارٹی نے امریکی قرضوں کی ضبطی، زمین کی حد ملکیت محدود کرنے اور اجارہ دار صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا پروگرام دیا۔ سی آر بطور جنرل سیکرٹری پارٹی کے اس موقف کو بڑے متحرک انداز میں ملک کے کسانوں اور محنت کشوں میں پہنچانے کی تگ ودو کرتا رہا۔

الیکشن میں عوامی لیگ سب سے بڑی پارٹی کے بطور کامیاب ہوئی مگر ملٹری ،ملا اور فیوڈل کے تکون نے اقتدار کی منتقلی میں رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کیں۔سی آر اسلم منتخب پارٹی یعنی عوامی لیگ کو اقتدار کی فوری منتقلی کا سب سے بڑا حامی تھا۔

اسی دوران مشرقی پاکستان پر فوجی ایکشن ہوا جس کی سی آر اسلم نے زبردست مخالفت کی۔نتیجہ یہ ہوا کہ بنگلہ دیش الگ ہوگیا۔

بہرحال بقیہ پاکستان پر بھٹو اور اس کی پیپلز پارٹی تخت نشین ہوئے۔ابھی کسان کانفرنس کے اثرات باقی تھے۔چنانچہ بھٹو نے یکم مارچ 1972 کو زرعی اصلاحات کا حسبِ ذیل اعلان کیا:

1- حدِ ملکیت 150 ایکڑ نہری یا 300 ایکڑ بارانی ہوگی۔

2- اگر کوئی زمیندار کسی وجہ سے اپنی زمین کسی وارث کو نہ دے سکا ہو تو وہ اب بھی حکومت کی اجازت سے ایسا کر سکے گا۔

3- بڑے افسروں کو انعام و اکرام میں دی گئی اراضی میں 100 ایکڑ نہری رقبہ رکھنے کی اجازت ہوگی۔

4- فوجی افسروں کو انعام و اکرام میں دی گئی اراضیات ان زرعی اصلاحات سے مستثنیٰ ہوں گی۔

ان زرعی اصلاحات کے باوجود جاگیردارانہ بنیاد جوں کی توں موجود رہی۔اس سے طبقاتی رشتوں میں کوئی فرق نہ آیا تاہم حدِ ملکیت کے تعین میں کمی اور بلا معاوضہ کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا ہے جس سے پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ بلا معاوضہ ملکیتی تصور کا تقدس بھی ختم ہوگیا۔(مگر یہ جاگیردار طبقہ اس قدر ہشیار اور مضبوط ہے کہ عملی طور پر کوئی بڑی تبدیلی نہ آئی)۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی

پاکستانی فیوڈلز کے پیدا کردہ سیاسی بحران نے جہاں پورے ملک کی جغرافیائی ہیئت بدل ڈالی، وہیں اِن حالات سے پیدا شدہ نتائج نے سی آر اسلم کی سیاسی اور انتظامی ذمہ داریوں میں صفتی تبدیلی مسلط کردی۔ہوا یوں کہ جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی تقریباً یقینی ہوگئی تو 9 دسمبر 1970 کو اُس کی پارٹی کے مرکزی صدر مولانا بھاشانی نے مغربی پاکستان، اُس کی سیاست چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی سے قطع تعلق کرلیا اور خود کو مشرقی پاکستان تک محدود کرنے کا اعلان کردیا جسے اب مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننا تھا۔بقیہ پارٹی میں یک دم بحران پیدا ہوا۔

مگر میدان میں سی آر اسلم، میاں محمود احمد، ملک محمد علی بھارا، نور محمد چوہان، ملک محمد اسلم ،اسلم اعوان، خواجہ رفیق، ہیرا پہلوان اور دیگر سینکڑوں باشعور اور کمٹڈ لوگ موجود تھے۔لہذا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے 1971 کے 23 مارچ کو ہر سال کی طرح ایک ملک گیر کسان کانفرنس، خانیوال میں منعقد کی گئی۔بنگلہ دیش الگ ہونے کے بعد بقیہ رہنے والے پاکستان بھر سے تقریباً 25 ہزار کسان یہاں جمع ہوئے۔اس کانفرنس نے زرعی اصلاحات کے بشمول کاشت کاری کے سیکٹر میں کسانوں کے حق میں مطالبات کی قراردادیں منظور کیں۔ٹوبہ ٹیک سنگھ کی 1970 کی کسان کانفرنس کے بعد یہ دوسری بڑی کسان کانفرنس تھی جس میں سیاست، کسان مسائل اور ثقافتی

معاملات پہ بڑی تفصیل سے توجہ دی گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ سوشلسٹ پارٹی کسان کانفرنسوں ہی کے ذریعے بنی اور انہی کسان کانفرنسوں کے ذریعے قائم رہی۔

سی آر اسلم کا کمال یہ تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے تسلسل میں وہ خانیوال، چنی گوٹھ، کھاریاں ٹانڈا، نارنگ شاہ آباد (چارسدہ) سے گجرانوالہ) تک کسان کانفرنسیں منعقد کرتا رہا۔

اسی خانیوال کسان کانفرنس کے اختتام پر 23 مارچ کی رات کو سیاسی ورکروں کی ڈیلیگیٹ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں 300 مندوبین نے حصہ لیا۔ اس کانفرنس نے نیشنل عوامی پارٹی کے مغربی پاکستان حصے کا نام پاکستان سوشلسٹ پارٹی رکھا۔ پارٹی کو منظّم کرنے کے لیے مرکزی آرگنائزنگ کمیٹی کا چناؤ کیا گیا اور سی آر اسلم کو اس کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ ڈیلیگیٹ کانفرنس نے آرگنائزنگ کمیٹی کے ذمے یہ فریضہ بھی سونپا کہ وہ پارٹی کا آئین و منشور بنائے، اضلاع کے دورے کرے اور ایک سال کے اندر اندر پارٹی کا کنونشن منعقد کرائے۔

سی آر اسلم نے اپنے دیگر ساتھیوں سمیت بے پناہ محنت کی۔ وہ پارٹی پروگرام پھیلاتا رہا اور 19 فروری 1972 کو لاہور میں چار سو مندوبین پر مشتمل سوشلسٹ ورکرز کانفرنس منعقد کروائی۔ کانفرنس میں سی آر اسلم نے سیاسی اور تنظیمی رپورٹ پڑھی۔ زرعی اور لیبر رپورٹس پڑھی گئیں اور بحث مباحثے کے بعد انہیں منظور کیا گیا۔ آئین و منشور کی منظوری دی گئی۔

تیرہ نکاتی منشور میں سامراجی سرمایہ اور سامراجی قرضوں کو ضبط کرنے، گماشتہ صنعتوں بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینے، اشتراکی، افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکی ممالک سے تعلقات بڑھانے، بھاری بنیادی صنعتوں کو اولیت دینے، جاگیرداری و سرداری نظام ختم کرنے، روزگار رہائش تعلیم و علاج کی ضمانت دینے، تحریر و تقریر، اجتماع اور فکر و رائے اور تنظیم سازی کی مکمل آزادی، تمام قوموں کا حقِ خودارادیت تسلیم کرنے ان کے معاشی سیاسی حقوق کی ضمانت اور زبان و ثقافت کی ترقی کے مواقع فراہم کرنے، عورتوں کو معاشی سیاسی اور سماجی حقوق کی برابری کی ضمانت دینے، ملک کی خارجہ پالیسی کی ناوابستگی، سائنسی بنیادوں پہ مفت، لازمی و مادری زبانوں میں تعلیم دینے اور قبائلی علاقوں کو ان کے صوبوں میں شامل کرنے جیسے امور شامل تھے۔

کانفرنس میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی سمیت عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا۔ سی آر اسلم پارٹی کا صدر اور عابد حسن منٹو جنرل سیکرٹری منتخب ہو گیا اور میاں محمود احمد پارٹی کے گڑھ یعنی پنجاب کا جنرل سیکرٹری بن گیا۔ مرکزی کمیٹی میں بلوچستان سے عبدالرحیم خان شامل تھا جبکہ صوبہ خیبر پختونخوا سے عبدالوحید، عبدالرزاق، ذاکر اللہ اور میاں شاہین شاہ شامل تھے۔ سندھ سے کنیز فاطمہ تھی اور پنجاب سے چودھری بشیر احمد، خواجہ محمد رفیق، رحمٰن مولوی، سٹیفن، سید مطلبی فرید آبادی، غلام نبی بھلر، غلام ربانی، چودھری علی محمد، مہربان شاہ، محمد علی بھارا، شیخ قیوم، شوکت بلوچ، چودھری فتح محمد، چودھری فرزند علی، نور محمد چوہان، قیس سلیمی، غلام حیدر اور بشیر جاوید مرکزی کمیٹی کے ممبر چنے گئے۔

پیپلز پارٹی کا جادوئی اقتدار تھا، لیفٹ کے نعروں، اور نعرے باز، دونوں پر اُس کا قبضہ تھا۔ اور بھٹو اتنا خود پرست تھا کہ اپنے مقابل کسی کو برداشت نہ کرتا تھا۔ اور توڑ جوڑ میں ہر طرح کا حربہ استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ ایسے حالات میں سُچی طبقاتی سائنسی الگ سیاست بہت مشکل تھی۔

مگر سی آر اسلم فولادی اعصاب کے ساتھ لگا رہا۔ سی آر اسلم کا کمال یہ تھا کہ وہ مسلسل کسان کانفرنسیں منعقد کرتا رہا۔ اسی طرح لاہور کراچی، کوئٹہ پشاور اور گجرانوالہ میں لیبر کانفرنسیں کر کے اِن طبقات میں پارٹی کے اثر کو بڑھانے کا کام کیا گیا۔

سی آر اسلم پاکستان میں ''سوشلزم کا راستہ'' متعین کرتے وقت مارکسسٹ پارٹی کو مضبوط کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ اس پارٹی کو مزدور طبقے سے رابطہ قائم کرنے اور مزدور طبقے کی ٹریڈ یونین بنانے اور ان کے معاشی مطالبات کی جدوجہد میں ان کی رہنمائی کرنے کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ وہ کسانوں کو کسان کمیٹیوں میں منظّم ہو کر جدوجہد کرنے کی تعلیم دینے کے کام کو بہت اہم سمجھتا رہا۔ کسانوں اور مزدوروں کو پارٹی کے جھنڈے تلے لانے پر بہت زور دیتا تھا۔

سی آر کی پوری زندگی اس بات پہ گزری کہ مزدور طبقہ کو بورژوا پارٹیوں کی قیادت سے الگ کیا جائے۔ وہ یہ کام روشن فکر دانشوروں کے ذمے لگاتا ہے۔ وہ دانشوروں کی تنظیم بنانے کی

اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھا۔طلباء اور عورتوں کی تنظیمیں بنانے کا کام کرتا رہا۔

سی آر اسلم پارٹی کارکنوں میں جدلیاتی اور تاریخی مادیت کے علم اور طبقاتی کشمکش کے شعور کو عام کرنے کو اچھا معاشرہ قائم کرنے کے لیے اہم قرار دیتا تھا۔سی آر اسلم خالی خولی نعروں کے سخت خلاف رہا۔ وہ نچلے طبقات کے نظریات سے لیس ہو کر متحرک ہونے کی وکالت کرتا رہا تا کہ ایک منظّم اور شعوری جدوجہد ہو۔وہ نظریے اور عمل کے اتحاد کو بہت اہم گردانتا تھا۔(12)۔

اگلے سال ٹھیک 23 مارچ کو تیسری کسان کانفرنس منعقد کی گئی۔اس بار یہ کانفرنس چنّی گوٹھ ضلع بہاولپور میں منعقد ہوئی اور ہر سیاسی اکٹھ اور پہل کاری کی طرح اس کانفرنس میں بھی سی آر اسلم کی راہنمائی کے علاوہ اس کی دن رات کی طبعی محنت بھی شامل تھی۔

سی آر اسلم دورے کرتا تھا،سٹڈی سرکلیں چلاتا تھا، پمفلٹ پوسٹر چھپواتا تھا' پارٹی سے متعلق عوامی تنظیموں کی انتظام کاری میں حصہ لیتا تھا،ملک بھر میں پھیلے ہزاروں کارکنوں سے باقاعدہ خط وکتابت کرتا تھا،دیگر لیفٹ پارٹیوں کے راہنماؤں اور کارکنوں سے بحثیں کرتا تھا اور پارٹی کے ہفت روزہ اخبار عوامی جمہوریت کا زیادہ تر کام بھی کرتا تھا۔نظریاتی وفکری مضامین سے مزین یہ ہفت روزہ اپنی باقاعدہ اشاعت کے لیے مالی وسائل کا تقاضا بھی کرتا تھا۔تحریریں بھی اسے چاہیے ہوتیں اور اس اخبار کو قاری بھی چاہیے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔اور یہ سارے کام اسی ایک شخص اور اس کی بنائی ہوئی ٹیم کے دم قدم سے ہوتے رہے۔سی آر جیسے ہمہ پہلو محنتی سیاسی راہنما کا ثانی پورے ایشیا میں نہ ہوگا۔

اُدھر، پاکستان کی پارلیمنٹ نے میر غوث بخش بزنجو کی موجودگی میں 1973 کا آئین بنایا۔جس میں ایک محدود حد تک صوبائی خودمختاری کا مسئلہ بھی طے کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

تاہم بلوچستان کی حکومت توڑنے اور سرحد اور بلوچستان میں اقلیتی پیپلز پارٹی کی حکومت بزورِ بازو قائم کرنے سے 1973 کے آئین پر اعتماد ٹوٹا اور صوبائی خودمختاری کا مسئلہ اور شدت سے ابھرا۔

23 مارچ 1974 کو پھر کسان کانفرنس منعقد ہوئی۔اب کے یہ کانفرنس ٹانڈا ضلع کیمبل

پور میں ہوئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب فیوڈل سوشلزم نے پری فیوڈل سوشلزم کو دبوچنا چاہا۔جمہوری راستہ نہ ملا تو فوجی طریقہ استعمال کیا اور ایک زبردست لڑائی ہوئی۔بلوچستان میدانِ جنگ بنا۔سی آر اسلم اور اس کے ساتھی سرداری نظام کے بدترین دشمن ہوتے ہوئے بھی بلوچستان میں فوج کشی کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے ششک نظام،سرداروں کی پرائیویٹ جیلوں اور دیگر ظلم وتشدد کی مخالفت بھی جاری رکھی مگر بھٹو کی بے وقوفی اور فوج کی کارروائیوں کیخلاف بھی زبردست جدوجہد کی۔بلوچستان میں فوج کشی کے خلاف لگاتار لکھنے کی پاداش میں اس کا، پارٹی کا،اور سوشلزم کا سب سے بڑا ہتھیار یعنی عوامی جمہوریت چھن گیا اور 18 ستمبر 1973 کو اخبار پر پابندی لگ گئی۔عدالت میں مقدمے بنے،سی آر اور اس کے ساتھی پیشیاں بھگتتے رہے اور سی آئی ڈی کی پہرے داری جاری رہی۔اخبار کا پبلشر اور ہمارا پیارا بہادر ساتھی خواجہ رفیق جیل جاتا رہا آتا رہا۔بلوچ قوم کے ان بے غرض دوستوں کو سلام ہو۔

سی آر اسلم کے تخلیقی ذہن نے فوراً متبادل کا انتظام کیا۔یہ چھلاوا شخص ان پابندیوں ،نگرانیوں، پیشیوں اور قید وبند کے درمیان بھی عوام سے کمٹ منٹ اور اپنا سماجی فریضہ ادا کرتا رہا۔ کہاں کہاں سے فنڈ کی بھیک مانگتا رہا،کس کس کا تب کے پیر چھوتا رہا اور کس کس پریس کی منتیں کرتا رہا۔۔۔۔۔اور پھر''صرف پارٹی ممبران کیلئے'' لکھ کر پارٹی کا''خبرنامہ'' یا پھر''سرکلر'' چھاپتا رہا جو ہو بہو''عوامی جمہوریت'' جیسا ہوا کرتا تھا۔سی آر اپنے چاک گریبان اور چھید بھرے دامن کے ساتھ سوشلزم کا چراغ بجھنے سے بچانے میں کامیاب رہا۔

''عوامی جمہوریت''بعد میں عدالتی حکم پر دوبارہ شروع ہوا۔

سی آر اسلم اپنے رسالے،سرکلر اور سٹڈی سرکلوں کی پتلی سی رضائی کے ذریعے پاکستان کی نحیف سوشلسٹ تحریک کو موسموں کی شدت سے بچاتے رہنے کا عمل جاری رکھے ہوئے تھا کہ 1974ء میں سوویت پارٹی نے اس سے ملنے کی ضرورت محسوس کی۔سی آر اپنے نظریات کی بناء پر راندۂ روزگار،اس کا پاسپورٹ ضبط تھا،غیر ملکی سفر پر پابندی تھی۔۔۔۔۔۔سوشلزم نے کیا کیا

امتیازات بخش رکھے تھے!۔

سوویت یونین کے دباؤ میں بھٹو نے پاسپورٹ واگزار کیا اور سی آر اسلم سوویت کمیونسٹ پارٹی کے دوستوں سے مذاکرات کرنے چلا گیا۔

وہاں کی سنٹرل کمیٹی سے اس کی بات چیت ہوئی جہاں اس نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا کہ چین سے بھی دوستی ہے اور سوویت پارٹی سے بھی۔ سی آر نے چین روس اختلافات کے بارے میں ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے کھل کر اپنا موقف بیان کیا۔ انہوں نے روسی یا چینی ہونے سے انکار کیا اور انہیں بتایا کہ اس کے ملک کا نام پاکستان ہے، روس یا چین نہیں۔ وہ پاکستانی محنت کش تحریک سے وابستہ ہے اور پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا سربراہ ہے۔ سی آر اسلم نے اپنی بین الاقوامیت پسندی کی وضاحت کی۔ سوویت پارٹی نے اس کے موقف کو درست مان لیا اور دونوں پارٹیوں کے مابین خوشگوار تعلقات کا ایک نیا باب کھلا۔ سی آر اسلم کی سوشلسٹ پارٹی کو بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کی ایک معتبر اکائی جانا جانے لگا۔ وفود کے تبادلے ہوتے رہے۔ طالب علموں، ٹریڈ یونین کارکنوں' اور کمیونسٹوں کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے اندر باقاعدگی آ گئی۔ سی آر نے چین روس اختلافات میں نہ صرف چینی روسی بننے سے انکار کیا بلکہ ایک کمیونسٹ ہونے کے ناطے جہاں تک ممکن ہوا، ان اختلافات کو کم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ چنانچہ جب چینی کمیونسٹ پارٹی نے دنیا میں اپنی الگ انٹرنیشنل بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ویتنامی اور کیوبن دوست اس سے ملنے آئے تو سی آر نے ان سے ایسا نہ کرنے کو کہا۔ انہیں سمجھایا کہ ہمیں کمیونسٹوں کی طرح رہنا چاہیے۔ روس چین جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیے اور عالمی کمیونسٹ تحریک کو کمزور کرنے والے اقدامات سے بچنا چاہیے۔ وہ پارٹیاں سی آر اسلم کے اس موقف سے متفق ہوگئیں اور اس طرح عالمی مزدور تحریک میں ایک نئی انٹرنیشنل کا قیام عمل میں نہ آیا۔

ہمبوئیں سلام

ستر کی دہائی کے اوئل میں برصغیر کے عظیم انقلابی راہنما اور ہفت روزہ عوامی جمہوریت کے اُس وقت کے ایڈیٹر سید مطلبی فرید آبادی سے میری خط و کتابت شروع ہو چکی تھی۔ میں نوجوان تھا، انقلاب کا جام تازہ تازہ پیا تھا، لہذا زیادہ تر خط میں ہی اسے لکھتا تھا۔ اس کی طرف سے مجھے دو خطوط یاد ہیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر تھا، اور دوسرا لفافے والا۔ لفافے والے خط کے مندرجات مجھے اچھی طرح یاد ہیں کہ اس نے میرے خط کا جواب دیر سے دینے کی وجوہات بیان کی تھیں اور اس تاخیر پر باقاعدہ معذرت کی تھی۔ یہ میرے لئے ایک نئی اخلاقیات تھی۔ میں ان راہنماؤں سے ابھی ملا نہ تھا۔ بس ان کی تحریریں پڑھتا رہتا تھا۔ سید صاحب کی زیارت بھی ابھی نہ ہوئی تھی۔ سید صاحب جلد ہی فوت ہوگیا اس لیے لمبی چوڑی رفاقت نہ ہوسکی۔

البتہ سی آر اسلم سے استادی شاگردی والی گہری دوستی قائم ہوئی جو 30-35 برس تک بہت اعتماد اور خلوص سے قائم رہی۔ اس کے ساتھ بے حساب خط و کتابت رہی جن کی اکثریت تو میں نے ضیاء الحق کے پولیس چھاپوں میں ضائع کر دی۔ مگر پھر بھی بڑی تعداد میں خطوط زیر زمین دفن ہونے یا آتش دان میں جل مرنے سے بچ گئے۔ واضح رہے کہ یہ خط و کتابت اسی کی پہل کاری سے شروع ہوئی تھی۔ اولین خط یوں تھا:

دفتر پاکستان سوشلسٹ پارٹی

5- میکلورد روڈ لاہور

22-9-1975

محترم تسلیمات۔

آپ کا خط ملا۔ سید مطلّبی صاحب بیمار ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد آپ کو خود خط لکھیں گے۔ ''عوامی جمہوریت'' کا پہلا شمارہ چھپ چکا ہے۔ آپ کو بھیجا جا رہا ہے اور چند دوسرے کتابچے بھی۔ آئندہ کیلئے آپ کا پتہ مستقل ڈاک رجسٹر پر لکھ لیا گیا ہے۔ اپنی طرح دوسرے نوجوانوں کو بھی شعور دیں کیونکہ ملک کا مستقبل آپ نوجوانوں سے ہی وابستہ ہے۔ علاقائی خبریں، نظمیں اور مضامین بھی بھجوانے کی کوشش کریں۔

دوستوں کو سلام

مخلص

سی آر اسلم

******

پہلا پرچہ اس لئے کہا گیا کہ ستمبر 1975 کو دو سال تک بند رہنے کے بعد ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' ایک بار پھر شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی ڈیکلریشن کو معطل کر دیا گیا تھا جو طویل مقدمہ بازی کے بعد بحال ہوا۔ یہ رسالہ پاکستان میں محنت کش تحریک کا ترجمان تھا۔ اس کا ذکر ہماری تاریخ کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس نے اپنی غیر حاضری کے دوران پاکستان کے حالات پر ایک ہی نقطے میں خوبصورت تبصرہ کیا۔ ''اس دوران پاکستان کی سیاست میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی سیاست نے افسوسناک صورتحال پیدا کر دی تھی۔ حکومتی پارٹی اور متحدہ جمہوری محاذ کی جنگ محض اقتدار کی جنگ تھی۔ متحدہ جمہوری محاذ محض جمہوریت کے نعرے لگاتا تھا اور حقیقی مسائل مثلاً جاگیرداری کے خلاف ایک بھی بات نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح حزب اقتدار عوام کی

نمائندگی کا دعوے دار ہونے کے باوجود اس مفاد پرست اور استحصالی نظام کی پرورش کر رہا ہے''۔(13)

یہ تو وہی زمانہ تھا جب سپریم کورٹ نے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا دی تھی۔ اس صورتحال پر سی آر اسلم نے لکھا ''نیپ کو سپریم کورٹ کے فیصلے نے ختم کر دیا ہے اور اس کے کارکن اور لیڈر NDP بنانے میں مصروف ہیں۔۔۔۔۔۔ اس طرح سے اس پارٹی نے کالعدم NAP کے لوگوں کو ایک چھاتا مہیا کیا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر وہ سیاسی گپ بازی کر سکیں۔ یہ پارٹی بھی اوپری طبقات کی ہے اور عوام الناس کے لئے اس کی پاس کوئی پروگرام نہیں ہے''۔(14)

ایس ایس او

1976 میں اہم واقعہ سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن S.S.O کے قیام کا تھا۔ ایس ایس او اپنی پیش رو تنظیم ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (DSF) ہی کا تسلسل تھا جو کہ آزادی کے فوراً بعد قائم ہوئی تھی۔ ڈی ایس ایف نے طلباء کو یہ شعور دیا تھا کہ استحصالی طبقات کی نمائندہ حکومت معاشی انصاف نہیں کرسکتی اور جب تک پاکستان میں طبقات اور طبقاتی امتیازات موجود ہیں اس وقت تک طلبہ کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس تنظیم نے فیسوں میں کمی، ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کی فراہمی' فرسودہ نظام تعلیم کے خاتمے اور روزگار کے مطالبات کے لئے آواز بلند کی۔ اس وقت کی حکومت نے طلباء کی آواز کو لاٹھی، گولی اور جیل سے دبانے کی کوشش کی۔ حکومت کے تشدد کے خلاف طلبا نے وسیع تر پلیٹ فارم منظّم کرنے کے لئے آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا کنونشن کراچی میں بلایا۔ یہ کنونشن کٹرک ہال کراچی میں ہونا تھا۔ مگر اس کنونشن کو ناکام بنانے کے لئے دفعہ 144 کا نفاذ کیا گیا۔ اور کٹرک ہال کے دروازے بند کردیئے گئے۔ تب یہ کنونشن کراچی کے نزدیک سمندر میں ایک کشتی میں کیا گیا اور آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس وقت تک امریکی سامراج نے پاکستان کو فوجی معاہدات میں باندھ لیا تھا اور پاکستان کی سیاست اور معیشت پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ چنانچہ امریکی سامراج کے اشارے پر پاکستان کی ترقی

پسند سیاست پر ظلم وستم کا دروازہ کھول دیا گیا۔ جہاں اس ظلم وستم کا شکار کمیونسٹ پارٹی، پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، کسان کمیٹی، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن اور ڈیموکریٹک ویمنز ایسوسی ایشن جیسی ترقی پسند تنظیمیں ہوئیں، وہاں طلبا کی اس تنظیم (ڈی ایس ایف) کو بھی نہ بخشا گیا اور اس کے لیڈروں اور سرکردہ کارکنوں کو بھی جیل میں ڈالا گیا۔ اگرچہ اس ظلم نے طلبا کی تحریک کو کچھ عرصہ کے لئے دبا دیا مگر سوشلزم کی وہ مشعل جو ترقی پسند طلبا نے ملک میں روشن کی تھی، بجھائی نہ جاسکی اور ترقی پسند طلبا نے اس مشعل کو کسی نہ کسی طرح روشن رکھا۔

چنانچہ ایک بہت لمبے وقفے کے بعد 7 مارچ 1976 کو لاہور میں پاکستان کے سوشلسٹ طلبا کا کنونشن منعقد ہوا۔ جمہوری اور ترقی پسند طلبا کا یہ کنونشن تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کنونشن نے طلباء کی اپنی تنظیم کھڑی کردی۔ اس سے قبل چونکہ طالب علم تنظیم نہ تھی تو یہ لوگ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی سیاست سے وابستہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں S.S.O سے وابستہ لوگ دراصل پی ایس پی کے کارکن تھے اور اس وقت تک طلباء کے اندر پارٹی کا کوئی عوامی محاذ نہ تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں سوشلسٹ سٹوڈنٹس کا یہ پہلا کنونشن اس بات کا ثبوت تھا کہ طالب علم بھی محنت کشوں کی طرح اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ سوشلزم ہی ان کے مسائل کو حل کرسکتا ہے اور ملک کی بامقصد اور سچی ترقی سوشلزم کے راستے ہی ممکن ہے۔ یہ کنونشن پاکستان میں ترقی، خوشحالی اور امن کی تحریک کو تقویت بخشنے والا ایک اہم اقدام تھا اور یہ تنظیم محنت کش عوام کی سامراج، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کو آگے بڑھانے کا باعث بنی۔

بعد میں جولائی 1977 کو پاکستان میں مارشل لا لگنے اور پھر 1978 میں افغان انقلاب اور ایک سال بعد ایران میں شہنشاہیت کے خاتمے سے خطے میں بڑی ہلچل مچی۔ چنانچہ سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن نے دوسری ترقی پسند تنظیموں کے اشتراک کے ساتھ پروگریسو سٹوڈنٹس الائنس کے نام سے اتحاد قائم کیا۔ اس نئے اتحاد نے اس تبدیل شدہ صورتحال کو بھانپ لیا اور اپنی صفوں کو متحرک ومنظّم بنانے میں جُت گیا۔ اس الائنس نے بالخصوص کوئٹہ میں عملی جدوجہد شروع کی۔ جلسہ جلوس کیے، بھوک ہڑتال اور گرفتاریاں دیں۔ ایس ایس او اس اتحاد کی قیادت میں پیش پیش

تھی۔اس سلسلے میں کئی دوست اس جدوجہد میں پابند سلاسل بھی ہوئے۔(15)

سی آر اسلم ہر لحاظ سے طلبا کے اس متحرک اور باشعور الائنس کی فکری راہنمائی اور مدد کے لیے وقف تھا۔سی آر اسلم خطوط اور دوسرے ذرائع کے ذریعے ہماری طلبا تنظیم کو اپنے مشوروں سے نوازتا رہا۔ہم جو بہ یک وقت سٹوڈنٹ لیڈر بھی تھے اور پارٹی ورکر بھی ،باشعور ہوتے رہے،تنظیم کاری کے فن سے آگاہ ہوتے رہے اور تحریر وتقریر سیکھنے لگے۔ ہماری طلبا تنظیم اطمینان بخش طور پر پھل پھول رہی تھی۔

وہ پوری زندگی سامراج دشمنی، فیوڈل مخالفت اور جمہوریت کی سیاست کرتا رہا۔ اسی طرح وہ نہایت ثابت قدمی سے اُس بائیں بازوں کے خلاف بھی ڈٹا رہا جو یا تو موقع پرست تھا یا پھر مہم جُو۔ وہ بالخصوص ان لوگوں کو معاف نہیں کرتا تھا جو نام تو مارکسزم کا لیتے تھے مگر سرداروں کے نیپ کو سرخ جامے اوڑھانے میں لگے رہتے یا پھر پیپلز پارٹی کو اصلی تے وڈی کمیونسٹ پارٹی ثابت کرنے میں لگے ہوتے۔ چودھری صاحب بغیر لگی اور بغیر لپٹی کے ساری عمر کہتا رہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی بورژوا قیادت میں چلنے والی بورژوا پارٹیاں ہیں۔ اور ان دونوں بورژوا پارٹیوں کے دم کا چھلا بننے والے لیفٹ کے لوگ پیٹی بورژوا لوگ ہیں۔(ایسے لوگ تو آج بھی موجود ہے)۔سی آر اس زمانے میں اس قبیل کے خلاف نظریاتی مباحثہ کو اہمیت دیتا تھا اور یہی فریضہ آج کے سیاسی ورکر کے ذمے بھی ہے۔

بھٹو کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف عوامی نفرت کا فائدہ مذہبی عناصر کو ہوا۔ایک عدد پی این اے بنا کر جماعت اسلامی اور دیگر امریکہ نواز عناصر نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ تاجر اور صنعت کار یہیں کہیں اپنا روپیہ لگا رہے تھے۔

1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگا کر تحریک چلائی گئی۔بھٹو نے اپنے برانڈ والا مارشل لا لگایا۔مگر ضیاء الحق اصلی مارشل لا لگانے کیلئے دانت تیز کر چکا تھا اور 5 جولائی 1977 کو تمام سیاستدانوں، سیاسی اداروں اور سول حقوق کا مشترکہ دشمن یعنی مارشل لا نافذ ہوا۔

جاگیرداری نظام کو بچانے کیلئے یہ امداد پاکستان کے جاگیرداروں کو وقتاً فوقتاً میسر رہی۔

اس فوجی حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ بھٹو کی نام نہاد زرعی اصلاحات کے برائے نام اثرات کو بھی زائل کر دیا۔ مزید زرعی اصلاحات کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کسانوں، مزدوروں اور ان کی تنظیموں کے خلاف معاندانہ رویہ رکھا۔اس کے دروازے صرف جاگیرداروں اور جاگیرداری نظام کی بحالی کی سیاسی پارٹیوں کیلئے کھلے رہے۔

سی آر اسلم کی پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی کانفرنس کے انعقاد کا کام معرضِ التوا میں پڑ گیا۔

سی آر اسلم اس پورے عرصے میں ملک بھر کے دورے کرتا رہا۔شاید وہ پاکستان کے کسی بھی سیاسی لیڈر سے زیادہ ''ورکر دوست'' راہنما تھا۔علاقہ دور دراز ہو تو ٹرین پر جا رہا ہے۔ ذرا سا نزدیک ہو تو پھر عام بس پر، اور اگر وکالت سے چار پیسے ہاتھ آئے تو منی بس یا پھر کبھی کبھار ''ٹھنڈی بس'' پہ۔(چودھری صاحب ایئر کنڈیشن بس کو یہی نام دیا کرتا تھا۔ یہ بسیں انہی دنوں پاکستان میں متعارف ہوئی تھیں)۔

کوہِ ہندوکُش پہ روشنی

سال 1978 کی 27 اپریل کی گھڑی پوری دنیا کے لیے ایک چونکا دینے والی گھڑی تھی۔۔۔۔۔ اُس دن افغانستان میں انقلاب ہوگیا۔سی آر اسلم کی مسکراہٹ دو چند ہوگئی،اس کی پرامیدی فلک تک بڑھ گئی اور اس کی سرگرمی سوا ہوگئی۔ یہ انقلاب اس قدر قریب ہوا کہ افغان کسانوں چرواہوں کی ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار تک سنائی دیتی تھی۔سی آر کو معجزاتی طور پر ایک ریڈیو مل گیا جس میں انسانی آزادی کے ترانے بجنے لگے،اسے کابل ٹی وی مل گیا جہاں ''زنجیریں ٹوٹ گئیں'' نامی ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔سی آر کو محض ایک ہفت روزہ عوامی جمہوریت کے بجائے روزنامہ خلق،روزنامہ پرچم،روزنامہ انیس،روزنامہ کابل ٹائمز بھی ملے۔ بے شمار ہفت روزے اور سہ ماہی رسالے نکلنے لگے۔سی آر ایک پمفلٹ کیلئے پیسے اکٹھا کرنے میں مہینہ لگاتا تھا اب اس کی خواہش کے عین مطابق ،منوں،ٹنوں کے حساب سے وہی پمفلٹ نکلنے بٹنے لگے۔ پنجاب کے کسی گاؤں میں کسانوں کی منظور کردہ قرارداد پہاڑ کے اس پار فرمان کی صورت نافذ ہورہی تھی۔کتنی بڑی نعمت نازل کردی تھی نور محمد ترہ کئی نے!!۔

سی آر نے سینہ کھول کر اس انقلاب کا خیر مقدم کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اس نقلاب کے پیام کو عام کیا۔بھٹو،ضیاء،ملاّ،فیوڈل سب اسی انقلاب کے حوالے سے تُلنے لگے۔افغان انقلاب

آزادی آبادی کا گزٹھہرا' اور سی آر اور اس کے ساتھیوں نے اس گز سے ملکی حالات کو خوب خوب ناپا۔اس کے'' دوست سوشلسٹ ممالک'' کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا تھا۔ایک فوج وہاں،عوام کے حق میں انقلاب لائے بیٹھی تھی اور ایک فوج یہاں،عوام کی گردن دبوچ رہی تھی۔ ایک غیر صنعتی، بے حد کم تعلیمی اداروں والے پسماندہ بچھڑے ہوئے افغانستان نے انقلاب برپا کر کے پاکستان کے ہر حلقۂ فکر میں ایک ہلچل مچادی تھی۔نظریاتی و تنظیمی سوالات اٹھائے تھے۔اور سی آر قلم و قرطاس کے ذریعے، پوسٹر و پمفلٹ کے ذریعے،کانفرنس و کانگریس کے ذریعے،قرارداد و پریس کانفرنس کے ذریعے ان سوالات کو سلجھا رہا تھا۔وہ اس انقلاب کی خوش الحانی کا نقیب بن رہا تھا۔۔۔۔۔یوم لینن ہو یا یوم مئی،سی آر نے ہر گھڑی کو افغان انقلاب کی تشریح کے لئے وقف کردیا۔ ہر خبر افغانستان کے حوالے سے تھی، ہر گیت ہندوکش کے اُس پار سے وابستہ تھا، ہر اچھا قدم انقلابی حکومت کے توسط سے تھا اور ہر پس منظر ثور انقلاب کیلئے ریزرو ہو چکا تھا۔اداریے،مضامین ،انٹرویوسب نور محمد ترکی کے چھپنے لگے۔سی آر اسلم کا عوامی جمہوریت ،افغان خلق پارٹی کا ترجمان بن چکا تھا۔

دنیا کا کوئی انقلاب خالصتاً وہیں کا انقلاب نہیں ہوتا۔انقلابات تو ساری بنی نوعِ انسان کی میراث ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایک شخصیت، کسی ایک گروہ یا کسی ایک ملک کے مرہون منت نہیں ہوتے۔''خیال کاکو'' نام کا ایک ان پڑھ بوڑھا شخص کوئٹہ کے بازاروں میں افغان انقلاب کے حق میں بولتا ہوا پایا گیا تو پوچھنے پر اُس نے بتایا تھا کہ وہ ''چھوٹی موٹی سمگلنگ کے جرم میں پاک افغان سرحد پہ گرفتار ہوا تھا اور دس پندرہ دن ایک حقیر سی جگہ قیدی رہا۔ وہیں ایک ایرانی قیدی بھی تھا جو ایران کی کمیونسٹ (تودہ) پارٹی کا کارکن تھا۔اس کے ساتھ رہ کر انہی دس پندرہ دنوں میں میں بھی کمیونسٹ بنا۔اب جب افغانستان میں تبدیلیاں دیکھتا ہوں تو یہ تو وہی بالشویک تبدیلیاں ہیں جو 1917 میں لینن روس کے اندر لاچکا تھا۔ اس لئے میں بغیر کسی لیڈر،کتاب،اور اخبار کے اس انقلاب کی حمایت کرتا چلا جارہا ہوں''۔

یہی حال سی آر اسلم اور افغان ثور انقلاب کا تھا۔اس انقلاب کے تو بے شمار لیڈروں اور

کارکنوں کا اپنی زندگی میں سی آر کے لیکچروں، جلسوں، تقریروں، عوامی جمہوریت کے مضامین یا پھر اس کی سوشلسٹ پارٹی سے براہ راست واسطہ پڑا تھا۔ اس طرح یہ گویا اس کے شاگردوں کا انقلاب تھا۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کو بغیر منصوبہ بندی، بغیر ارادہ کے بہت کچھ دے اور لے سکتی ہے۔ سی آر اسے بالکل پاکستانی انقلاب سمجھ کر اس کی حمایت و معاونت کرتا رہا۔

انقلابِ افغانستان یعنی اپریل 1978 کے بعد سی آر اسلم نے بہت لکھا، بہت دورے کیے، بہت پریس کانفرنسیں اور جلسے کئے جن کی تفصیلات اس کے ہفت روزہ اخبار ''عوامی جمہوریت'' کی فائلوں سے مل سکتی ہیں۔ میں یہاں اُس زمانے کے اس کے وہ خطوط نقل کرنا چاہتا ہوں جو اس نے مجھے لکھے تھے۔ شخصی طور پر تو میرے لئے وہ خطوط بہت اہم ہیں ہی، مگر میں چونکہ بلوچستان میں رہتا تھا اور جو کہ انقلاب کے مرکز افغانستان سے متصل علاقہ ہے، اس لئے ان خطوط کی اہمیت عالمی انقلاب کے لئے بہت زیادہ ہے۔ ہماری گرم جوش خط و کتابت دراصل افغانستان میں واقعات کے زیر و بم کی رفتار سے مناسبت رکھتی ہے۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز وہ ایک خط لکھا کرتا۔

یہ پہلا خط افغانستان میں انقلاب برپا ہونے کے تین ہی دن بعد کا لکھا ہوا ہے۔ سرعت اور برق رفتاری سے انقلاب کو جانچنا اور پھر ابد تک کے لیے ایک نقطۂ نظر مرتب کرنا تو کوئی کمیونسٹوں سے سیکھے۔

******

یکم مئی 1978ء

محترمی شاہ محمد مری

تسلیمات

یوم مئی پر مبارک باد۔ افغانستان کے انقلاب پر خوشی و مسرت کا اظہار ضروری ہے، قبول فرمائیے۔

آپ نے ایس ایس او کی مرکزی کمیٹی کی کارروائی رپورٹ اخبار کے لئے نہیں بھیجی۔ نہ ہی بلوچستان کی سیاست کی خبر بھیجی ہے۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں تساہل نہیں کریں گے اور

خبر نامہ اور رپورٹ جلد بھیج دیں گے۔

آپ کا دعوت نامہ موصول ہوگا تو میں ایک ہفتے کے لئے کوئٹہ آؤں گا اور آپ کی رفاقت میں مختلف شہروں میں جاؤں گا۔ جب آپ کو فرصت ہو تو اس وقت بلا لیجئے۔

احباب کو سلام۔ بلکہ:

بہ آں گروہ کہ زساغرِ وفا مستند
سلامے بما رسانید ہر کجا ہستند

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

آٹھ مئی 1978

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ کے کوئٹہ میں جناب امتیاز حسین باقری حنفی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر 75733 ہے۔ ان کا خط آیا ہے جس میں انہوں نے ''عوامی جمہوریت'' کی تعریف کرتے ہوئے دو باتیں پوچھی ہیں: اول یہ کہ ہفت روزہ کا چندہ کیا ہے تاکہ وہ ارسال کر سکیں۔ اور دوم یہ کہ بلوچستان کے سیاسی معاشی اور ثقافتی مسائل پر مضامین لکھتے رہیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان سے ملیں اور چندہ اخبار جو پچیس روپے سالانہ ہے ان کو بتا دیں۔ یہ میں بذریعہ ڈاک بھی بتا سکتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کا رابطہ ان سے ہونا چاہئے۔ اسی لئے یہ کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ ان کی دوسری بات کے بارے میں آپ سے گزارش ہے کہ آپ بلوچستان کی سیاست کے بارے میں، ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں اپنی رپورٹیں ضرور بھیجیں تاکہ ان کی یہ فرمائش پوری کی جا سکے۔

گرمی شباب پر ہے اور جھلسا دینے والی ہوا دن بھر چلتی ہے۔ آپ تو کوئٹہ کی خنک ہوا کے

مزے لوٹتے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ کیا آپ ہمیں کوئٹہ آنے کی دعوت نہ دیں گے۔ یہ خیال رہے کہ آپ کو کم وبیش آٹھ دس روز ہمارے ساتھ رہنا پڑے گا اور یہ عرصہ بلوچستان کی دشت نوردی میں گزرے گا۔

فقط آپ کا مخلص
سی آر اسلم

******

نومئی 1978ء

محترم شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ کا مکتوب بابت انقلاب افغانستان مل گیا۔ شکریہ۔ یہ اگلے شمارے میں چھپے گا۔ پاکستان نے عوامی جمہوریہ افغانستان کو تسلیم کرلیا ہے اور اس کا آغا شاہی ایران کے شہنشاہ سے مشورہ کرنے گیا ہوا ہے کہ اب کیا ہوگا۔

یوم مئی منانے پر مبارکباد۔ اس کی رپورٹ مل گئی تھی چھپ رہی ہے۔ آپ پیٹی بورژوا پروفیسروں کی الزام تراشی سے مت گھبرایئے۔ وہ نہ سچے مارکسسٹ ہیں اور نہ انہیں جدلی اور تاریخی مادیت کی ابجد آتی ہے۔

مارکسزم کا شعور حاصل کرنا اور دوسروں کو دینا اور مزدوروں کی سیاسی پارٹی بنانا اور اس کے حوالے سے محنت کشوں سے رابطہ کرنا اور انہیں طبقاتی شعور سے لیس کرنا اور عمل میں ان کی رہنمائی کرنا ہی سب سے بڑا انقلابی کام ہے۔ کارل مارکس، اینگلز، لینن اور ماؤزے تنگ تک سب یہ کہتے ہیں کہ نظریاتی کام (مارکسزم لیننزم کا علم) کو سیاسی کام پر اور سیاسی کام کو معاشی جدوجہد پر اولیت حاصل ہے۔

اگر آپ دوستوں کو ہفتہ میں ایک بار یا پندرہ روز میں ایک بار فرصت ملے تو کارکنوں کے سٹڈی سرکل لینا اہم اور ضروری کام ہے۔ آپ دوست طالب علم ہیں۔ اگر آپ دوستوں کو کوئٹہ

سے باہر جانے کی فرصت نہ ہو تو آپ کوئٹہ کے سیاسی کارکنوں طلباء اور دانشوروں کو سوشلسٹ بنانے کا کام تو کر سکتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے مارکسزم اپنا لیا تو یہ بڑی کامیابی ہوگی اور آپ دوستوں کی تعداد بڑھے گی۔

احباب کو سلام
سی آر اسلم

مکرر:

انیس ہاشمی واپس آ گئے ہیں اور کراچی میں ہیں۔

میں شوکت حیات (کراچی) اور عبدالوحید (پشاور) سے بھی کہتا رہتا ہوں کہ وہ سندھ اور سرحد کی سیاسی سرگرمیوں کی رپورٹیں اور تجزیے ارسال کریں تاکہ ''عوامی جمہوریت'' میں چھاپے جاسکیں۔ میری یہ کوشش اس لئے ہے کہ ہر سیاسی لیڈر میں جدلی اور تاریخی مادیت کی مدد سے حالات کا تجزیہ کرنے اور نتائج برامد کرنے کی صلاحیت ابھرے اور اجاگر ہو۔ بالخصوص نوجوانوں میں کہ وہ درخشندہ مستقبل یعنی سوشلزم کے لیڈر ہیں۔ اور انقلاب کی روشن مشعل جو کارل مارکس سے چلی آ رہی ہے، ہمارے بعد آپ سنبھالیں۔ آپ نوجوان راہ نمائی کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔

سی آر اسلم

******

سات جون 1978ء

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ کا پوسٹ کارڈ ملا۔ میں نے کریم بخش محمودزئی اور بہار خان نودہانی کو خطوط تحریر کردیئے ہیں اور ان کے جوابات آنے پر ان سے خط وکتابت جاری رکھونگا۔

جناب صفی اللہ نے ایک خبر یوتھ فیسٹیول کے بارے میں ارسال کی تھی وہ ہم نے چھاپ

دی ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی آپ کو نوجوانوں کے عالمی میلہ میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا ہے؟۔ اگر ایسا ہے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔

آپ نے اس میلے کے حوالے سے نوجوانوں اور طلباء میں ان کے مسائل اور سوشلزم اور امن اور ترقی کے نام سے بات کرنے کا پروگرام بنایا ہے وہ اچھا اور مناسب قدم ہے۔ اس سلسلے میں آپ سب صوبائی یونٹوں کو ہدایت جاری کریں کہ وہ بھی اس میلے کے حوالے سے طلباء میں سوشلزم امن اور ترقی کی باتیں کریں۔

آپ کو جب فرصت ہو، آپ میرے ساتھ بلوچستان کے مختلف شہروں اور علاقوں تک جاسکیں تو مجھے تحریر کریں تا کہ میں پہنچ جاؤں اور ہم مل کر دورہ کریں۔ اس وقت کے اہم سوال یعنی اقتدار بورژوا جاگیردار طبقات کے ہاتھ میں رہے یا محنت کش عوام کے ہاتھ میں آئے اور اس کے امکانات پر باتیں کریں۔ انقلاب کا اصل ''جوہر'' سیاسی اقتدار پر محنت کشوں کا قبضہ ہے اور آج اس کے بغیر پاکستان کا کوئی مسئلہ معاشی سیاسی ثقافتی اور قومی حل نہیں ہوسکتا۔ بورژوا قیادت پاکستان کا کوئی مسئلہ حل نہیں کرسکتی۔ اس کو صرف اور صرف محنت کش قیادت (پاکستان سوشلسٹ پارٹی) ہی حل کرسکتی ہے۔ اس لئے یہ لازمی ہوگیا ہے کہ مزدوروں، طلباء، کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کو یہ شعور دیا جائے اور انہیں سرداروں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی قیادت کا دم چھلہ بننے کی بجائے اپنی سیاسی پارٹی کی تنظیم کا احساس دلایا جائے۔ یہ کام سیاسی بھی ہے، طبقاتی اور نظریاتی بھی۔ اس کے ذریعے بورژوا گمراہی کو شکست دی جاسکے گی اور محنت کشوں میں سچا سیاسی شعور پیدا کیا جاسکے گا۔ آپ بلائیں گے تو میں آؤں گا اور تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ آپ کے ''مکتوب بلوچستان'' کا انتظار ہے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

انیس جون 1978ء

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

میرا اندازہ ہے کہ آپ نے ورلڈ یوتھ فیسٹیول کی تنظیم کو خط لکھا تھا اور اس کے جواب میں آپ کو دعوت نامہ موصول ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ینگ کمیونسٹ لیگ ماسکو اور انٹرنیشنل یونین آف سٹوڈنٹس پراگ کے جنرل سیکرٹریوں کو خطوط لکھیں۔

آپ بتائیں کہ کوئٹہ اور سبی میں پارٹی کے دفاتر بنے ہیں یا نہیں۔ نیز آپ خوبصورت اور مدلل ہینڈ بل تحریر کریں۔ اس میں افغانستان کے انقلاب کے رونما ہونے سے اب تک کی کارروائیوں کا مختصر ذکر کریں اور یہ بھی بتائیں کہ یہ انقلاب اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ عین منشائے اسلام کے مطابق ہے اور اس کے لئے کامریڈ نور محمد کے بیانات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ اسے اردو اور پشتو میں اپنی تنظیم SSO کی طرف سے چھپوا کر پشتون علاقے اور اردو والے علاقے میں تقسیم کردیں۔ یہ ہینڈ بل وضاحتی ہونا چاہئے۔ مقصد تعلیم اور درست حالات سے آگاہی تا کہ رجعتی عناصر کی گمراہی دور ہو۔ یہ ایجی ٹیشنل نہیں ہونا چاہئے۔ عوام کو سمجھنے کی ضرورت ہے، انہیں جذباتی بنانے کی نہیں۔ اگر وہ افغانستان کے انقلاب کے مقاصد سمجھ گئے تو پھر وہ ملاؤں کے پروپیگنڈے میں نہیں آئیں گے۔

یہاں تو بے حد گرمی ہے جھلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے۔ گھومنا پھرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود کام میں مشغول ہیں۔

پشاور والے عبدالوحید جو صوبے کی پارٹی کے سیکرٹری تھے آج کل جیل میں ہیں۔ ضمانت کے لئے کوشش کی جارہی ہے اور رہائی ہوجائے گی۔

بلوچستان کے شہروں اور طلبا اور دانشوروں میں اس بات کا احساس ضروری ہے کہ جب تک ریاستی اقتدار پر عوام کے نمائندوں کا قبضہ نہیں ہوتا اور اس پر جاگیرداروں سرداروں خوانین اور سرمایہ داروں کا قبضہ رہتا ہے، اس کی صورت خواہ فوجی ہو یا سول کوئی مسئلہ خواہ معاشی ہو یا سیاسی ہو

تعلیمی ہو یا قومی ہو حل نہیں ہوسکتا۔ اور یہ سارے مسائل اس وقت حل ہو جائیں گے جب ریاستی اقتدار عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس لئے بنیادی کام اس احساس کو محنت کش، طلباء اور دانشوروں میں پیدا کرنا ہے تا کہ وہ بورژوا قیادت سے دور ہو جائیں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

21 جون 1978ء

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

جہاں تک میری بلوچستان آنے کی خواہش کا تعلق ہے اس کے بارے میں غرض ہے کہ میں اپنا پروگرام آپ کی مشکلات کے پیش نظر بناؤں گا اور اس کی اطلاع بذریعہ تار دوں گا۔

پنجاب کے ایس ایس او کے طالب علم لیڈروں کو احساس دلاؤں گا کہ وہ حرکت میں آئیں اور ایس ایس او کی مرکزی کمیٹی کے فیصلوں پر عمل کریں اور تیزی سے کریں۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ الفتح کے مضمون کے بارے میں آپ ہی کچھ تحریر کر دیں۔ ویسے آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ میں نے الفتح کو لفٹ نہیں دی تھی۔ اگر اس کا نوٹس لیا جانا ضروری ہے تو میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔ اب اخبار نویسوں میں برنا کی وہ آوبھگت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس لئے اس مضمون کا جواب شاید دینا ضروری نہیں۔ بہر کیف میں اس پر غور کر کے اس کا جواب دوں گا۔

بلیٹن کے بارے میں آپ کی رائے کا احترام ہے۔ میں آپ کی رائے بلیٹن نکالنے والوں تک پہنچا دوں گا۔ اب تو کالج بند ہو گئے اور اب یہ بلیٹن شاید ستمبر میں ہی شائع ہوگا۔ اس وقت اس کا Pattern تبدیل کیا جائے گا۔

''عوامی جمہوریت'' کے بارے میں آپ کی تجویز بجا ہے۔ پہلے بھی میں نے کوشش کی تھی کہ اسے بک سٹالوں پر رکھوایا جائے اور چند ایک پر رکھا بھی جا رہا ہے۔ اب میں کوشش کروں گا اسے زیادہ سے زیادہ بک سٹالوں پر رکھوایا جائے۔

آپ کا وہ خط مجھے نہیں ملا جس میں آپ نے سبطِ حسن کے مضمون کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ویسے ہم یہ مضمون پارٹی کی طرف سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر رہے ہیں اور اس کے لئے سبط حسن سے کہا ہے کہ وہ اس پر نظر ثانی کریں۔ اگر آپ ایس ایس او کی طرف سے چھاپنا چاہتے ہیں تو بسم اللہ لیکن آپ سبط حسن کا جواب آنے تک صبر کریں۔ جوں ہی ان کا خط آئے گا آپ کو مطلع کر دوں گا۔ اپنے پروگرام سے بھی مطلع رکھوں گا۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

یکم جولائی 1978ء

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

منٹو صاحب کا خیال ہے کہ وہ دو تین ہفتے کی چھٹی منائیں اور کوئٹہ میں قیام کریں۔ وہ شاید دس جولائی کو وہاں پہنچیں گے اور گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔ سنا ہے یہ ریسٹ ہاؤس خاصا سستا ہے۔

ان کے قیام سے آپ فائدہ اٹھائیں اور طلباء کی میٹنگیں بھی کریں۔ ادباء اور شعراء کی میٹنگیں بھی کریں۔ کیونکہ وہ ترقی پسند ادیب اور نقاد بھی ہیں اور ترقی پسند سیاسی ورکروں سے بھی ملاقاتیں ہو جائیں تو ان کا قیام مفید رہے گا۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ان کے قیام سے کس طرح فائدہ اٹھائیں گے۔ مزدوروں کی میٹنگیں بھی کروا دیں۔ آپ کا مضمون چھاپ دیا گیا ہے اور مزید

مضامین کا انتظار ہے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

بیس جولائی 1978ء

محترمی شاہ محمد مری

تسلیمات

بارشوں کا موسم کیا آیا کہ اپنے ساتھ سیلابوں کی آفتیں لایا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق امسال بلوچستان میں زبردست بارشیں اور زبردست سیلاب آئے ہیں۔ ان سیلابوں میں مارے جاتے ہیں بے چارے کسان اور غریب عوام جن کی جمع پونجی (مال اسباب غلہ گھر) سب بہہ جاتے ہیں اور وہ تہی دست ہو جاتے ہیں۔ ایسی حکومتوں کو حکومت کرنے کا کیا حق ہے جو سیلابوں کا انسداد کرنے کی بجائے قال قال کی کانفرنسوں میں لگی ہوئی ہیں۔ سیلابوں کی تباہی کو خوشحالی میں بدلا جاسکتا ہے۔ آج انسان ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں وہ سیلابوں کی تباہ کاریوں سے نپٹ سکتا ہے۔ لیکن یہ تو اسی وقت ممکن ہوگا جب حکومت مزدوروں کسانوں کی ہوگی۔ بلوچستان میں بھٹو کے دور ستم میں ملک سے باہر چلے جانے والے افراد افغانستان سے واپس آ رہے ہیں۔ ان میں لیڈر بھی ہیں اور ورکر بھی۔ ان سے ملاقاتیں ضروری ہیں۔ افغانستان کے انقلاب کے حالات بھی معلوم ہوں گے اور ان کی اپنی سیاست کا بھی پتہ چلے گا۔ آپ ان سے ملیں، باتیں کریں اور اپنا تاثر اخبار کے لئے قلمبند کر کے ارسال کریں۔

آپ کا فائنل امتحان کس ماہ میں ہے۔ یہ میں آپ سے اس لئے دریافت کر رہا ہوں کہ میرا قیاس مجھے بتا رہا ہے کہ آپ آسمانِ سیاست کا چمکدار اور روشن ستارہ بننے والے ہیں اور بلوچستان کے عوام کو آپ کی روشنی کی ضرورت ہے۔

مکتوبِ بلوچستان کا انتظار ہے۔ اس میں سیلابوں اور بلوچ لیڈروں کی افغانستان سے واپسی اور افغانستان کے انقلاب کے بارے میں ان کے رویے کا ذکر ہونا چاہیے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

بخدمت جناب مری صاحب

تسلیمات

ہم نے ''نور محمد ترہ کی کے حالات زندگی'' نامی کتاب کا بنڈل بذریعہ ریل بھجوا دیا ہے۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔

آپ کا امتحان کب ختم ہو رہا ہے تاکہ میں اس کے خاتمے پر بلوچستان آنے کا پروگرام بنا کر آپ کو مطلع کر دوں۔

آپ چند رفقاء اور مزدور نمائندوں کو کراچی لیبر کانفرنس میں ضرور بھجوائیے۔ یہ کانفرنس 28، 29 دسمبر کو ہوگی۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

سید مطلّبی فرید آبادی

(15 نومبر 1893.....21 جولائی 1978)

سید مطلّبی 1893 میں ہندوستان کے قصبہ فرید آباد میں پیدا ہوا، سید گھرانے میں۔ والد کا نام میر احمد تھا اور ماں کا رضیہ سلطانہ۔ وہ ایک جاگیردار گھرانے کا فرد تھا لیکن ہوش سنبھالتے ہی کسانوں اور دوسرے نچلے طبقوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے لگا۔ وہ ان کی خوشی اور غم میں ان کے ساتھ رہتا اور انہیں نظریاتی تعلیم دیتا۔ اس کی زندگی کسانوں کے لئے گیت لکھنے، ان کی خاطر جیلیں کاٹنے اور ان کے حقوق کے لئے لڑنے میں گزر گئی۔ اس نے عملی طور پر تحریکِ خلافت میں حصہ لیا تھا۔

عالمِ جوانی میں ہی سید صاحب نے اپنے آپ کو دل و جان سے دیہات کے محنت کشوں کے مفادات سے وابستہ کر دیا۔ گوڑ گاؤں اور بھرت پور (بھارت) کے میو کسانوں کا وہ گوشت پوست بن گیا۔ وہ اُن پر ہونے والے ریاستی اور حکومتی جبر و مظالم کے خلاف ہمیشہ بڑھ چڑھ کر جدوجہد کرتا رہا۔ علاوہ ازیں سید صاحب متحدہ ہندوستان کی ادبی تحریک میں وہ پہلا شخص تھا جس نے گاؤں کی زندگی کو سچائی، حُسن اور ترقی پسندی کے ساتھ شعر اور نظم کے پیرایہ میں ڈھالا۔

سید صاحب جس علاقے کا رہنے والا تھا وہاں کی زبان ہریانی ہے۔ اُس نے اُسی زبان

میں ایک منظوم ڈرامہ ''کسان رُت'' لکھا۔ جس میں دیہاتی بولی کے الفاظ اور محاورے اسے نہ صرف اس علاقے کے دیہی باشندوں کے لئے قابلِ فہم بناتے ہیں بلکہ اس میں ایک دل کش اور دلنشین تاثر پیدا کر دیتے ہیں۔

''کسان رُت'' 1938 میں شائع ہوئی تھی۔

کسان رت کے علاوہ اس نے مزدوروں کے لئے ایک مشہور گیت ''ھیا ھیا'' لکھا۔ یہ طویل کلام کتابچے کی شکل میں چھپ گئی۔ یہ گیت (گیت نہیں یہ تو کسانوں کا قومی ترانہ ہے) اتنا مشہور ہوا کہ اب بھی مزدور اور کسان اپنے اجتماعات میں اُسے مل کر گاتے ہیں۔

بوجھ اٹھالو، ہیا ہیا
بوجھ اٹھایا، ہیا ہیا
آٹھ مہینے بھوک لگے گی، شیر بہادر بھوک لگے گی
بن کپڑے کے، بن لتے کے، آٹھ مہینے بن روٹی کے
زور لگاؤ ہیا ہیا، بھوک لگے گی بھوک لگے گی
کیسے بھائی ہیا ہیا، شیر بہادر ہیا ہیا
ہاں ہاں بھائی ہیا ہیا، شیر بہادر ہیا ہیا
ہاں ہاں بھائی ہیا ہیا، پیٹ بھرے گا ہیا ہیا
اورا بھارو ہیا ہیا، ہاتھ بچا کے ہیا ہیا
شیر بہادر ہیا ہیا، پیٹ بھرے گا ہیا ہیا
اورا بھارو ہیا ہیا، ہاتھ بچا کے ہیا ہیا
شیر بہادر ہیا ہیا، دام ملیں گے ہیا ہیا
سود بھریں گے ہیا ہیا، قرض ملے گا، ہیا ہیا
پیر بچا کے ہیا ہیا

اسی کتابچے میں اُس کو لگتا ہے بلوچستان کے کشتی بانوں کو مخاطب کیا ہو۔ اس کی دیگر

کتابوں میں منظوم ڈرامہ کسان رُت، منظوم دیہاتی زبان میں پنہاری، اورانقلابِ روس پر طویل نظم ''روسی کرانتی کا آلہ''، بہت مشہور ہیں۔

وہ روزنامہ ''نیادور'' دہلی میں ''برج باشی'' کے قلمی نام سے بھی لکھتا رہا۔ سید صاحب دہلی سے جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''کلیم'' کا بھی نائب مدیر رہا۔ دہلی سے شائع ہونے والا یہ رسالہ جدید ادب کی کئی سالوں تک خدمت کرتا رہا۔

مختلف رُوسی مصنفوں اور مفکروں کی کتب کے اُردو میں تراجم بھی کیے جن میں پلیخا نوف کی کتاب ''آرٹ اور سماجی زندگی'' اور میخائل شولوخوف کے ناول ''بہتا دریا'' کے نام سے تراجم کیے۔

سٹالن کی مشہور کتاب ''اساس لینن ازم'' کے نام سے اور ہنگری کے ممتاز شاعر اور انقلابی ''پتوفی'' کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا۔

سید مطلبی فرید آبادی مختلف روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات جن میں ''آفاق'' محنت ایڈیشن۔ نگار لاہور اور پارس (فیصل آباد) اور تادم مرگ ''عوامی جمہوریت'' کا ایڈیٹر رہا۔ وہ مقبول ومشہور روزنامہ ''امروز'' لاہور کا ایڈیٹر بھی رہا۔ مرحوم کے صاحبزادے سید ابوالکلیم مطلبی نے سید صاحب کی وفات کے بعد سال 1985 میں ادارہ ''عوامی جمہوریت'' کے زیر اہتمام اُس کا مجموعہ کلام ''نوید سحر'' سے شائع کیا۔

بہت بزرگی سنی میں بھی وہ باقاعدگی سے تصنیف وتالیف کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ موت سے کچھ عرصہ قبل ہی اس کی ترجمہ کی ہوئی پلیخا نوف کی کتاب ''آرٹ اور سماجی زندگی'' چھپ چکی تھی۔ وہ آزادی سے پہلے انڈین کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ اس لئے اس نے انگریز سامراج کے خلاف تحریک چلائی۔ اس کے سیاسی عقائد اور انقلابی جدوجہد کی پاداش میں اسے 1940 میں جیل بھیج دیا گیا۔

آزادی وطن کے بعد اس نے پاکستان میں بھی کسانوں کی لُوٹ کے خلاف آواز اٹھائی ۔ وہ دادا فیروز الدین منصور کے ساتھ مل کر کسانوں کو منظم کرنے اور انہیں نظریاتی تعلیم دینے لگا۔

کسانوں کی بیدخلیوں کے خلاف کسانوں کو منظم کیا اور تحریک چلائی۔ حکومت نے کئی کسانوں کو گرفتار کیا مگر ان تمام سختیوں کے باوجود یہ تحریک دبائی نہ جاسکی اور بالآخر مسلم لیگ کی جاگیردارانہ حکومت کو کسانوں کے مطالبات تسلیم کرنے پڑے۔ اور ''تحفظِ مزارعت ایکٹ 1952'' بنایا گیا۔

آزاد پاکستان کی آزاد حکومت نے سید صاحب کو 1954 میں ایک بار پھر گرفتار کرلیا۔ رہائی ملتے ہی وہ پھر کسانوں میں گیا، انہیں منظم کیا اور 1963 میں خانیوال کے مقام پر کسانوں کا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کرایا اور اس کنونشن کے پیغامات گھر گھر پہنچائے۔

سید صاحب ایک بہت بڑا ادیب بھی تھا۔ چونکہ وہ کسانوں میں کام کرتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی تحریروں میں ان کی زندگی، اور ان کے دکھ سکھ کی ترجمانی کی۔

صحافت کے میدان میں بھی سید صاحب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ ''امروز'' کا اعزازی مدیر رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ''آفاق'' محنت ایڈیشن' اور ہفت روزہ ''پارس'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے بعد وہ ''نگار'' کا مدیر بنا۔ وہ تاحیات ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' کا ایڈیٹر تھا۔

سید مطلبی فرید آبادی کسانوں کے مفادات کا چیمپئن تھا۔ وہ ادب کے ذریعے دیہی غریبوں کے مسائل کو مثبت انداز میں پیش کرنے کو ضروری سمجھتا تھا.....اس کا اعتراض تھا کہ ہمارے لکھاریوں نے ایک محدود شہری طبقہ کے لئے لکھا ہے۔ اور ایسے فکری رجحانات پیش کیے ہیں جن کا عام اکثریت کی زندگی سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ اور نہ وہ عام اکثریت کو راہنمائی فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں عوام اور لکھاریوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہوگیا ہے۔

سید صاحب نے اپنی طویل زندگی میں ہر مشکل کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ اس نے جیلیں کاٹیں۔ صعوبتیں برداشت کیں لیکن سماج کی طرف سے لگائے ہوئے فرض سے کبھی منہ نہ موڑا۔ اس نے اپنے اصولوں پر کبھی بھی مفاہمت نہیں کی۔ وہ آواز خواہ سیٹو سینٹو میں پاکستان کی شمولیت کے خلاف تھی یا ون یونٹ کو توڑنے کا مسئلہ تھا۔ کسانوں کی بیدخلی کی بات ہو یا سیاسی پابندیوں کا مسئلہ ہو وہ ہر جدوجہد میں پیش پیش رہتا۔ وہ پاکستان میں ایک ایسا سماج تعمیر کرنا چاہتا تھا جو ہر قسم کے جبر و تشدد سے پاک ہو اور جہاں زندگی پُرمسرت ہو۔ اور اسی مقصد کے حصول کے لئے اس نے پوری

زندگی وقف کردی۔ عقل وشعور پھیلانے والا دریا میوات کے اکھڑ قبائلیوں کے علاقے میں شور مچاتا ہوا گزرا۔ اس نے کپاس کی کاشت کے زرخیز میدانوں میں راتیں بسر کیں۔ پختونخواہ کے پہاڑوں میں بل کھائے، سندھ کے ریگستانوں، فیصل آباد کے صنعتی علاقے اور لاہور کے محنت کشوں کے درمیان سے گزرا۔ وہ سورج کی تیز کرنوں سے زندگی بھر اپنے ساتھیوں پر سایہ کئے رہا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اور گہرا سایہ۔ درخشاں مستقبل کی آس کے ڈھول بجا بجا کر ہمیں آگاہ کرتا رہا۔ وہ گیت گاتا رہا۔ لطیفے سناتا رہا۔ جیلیں کاٹتا رہا مگر جیتے جی خاموش نہ کیا جا سکا۔ اس پر زمانے نے کیا کیا ستم نہ ڈھائے مگر صراط مستقیم سے اسے کوئی ہٹا سکا نہ انگریز نہ ایوب نہ ولی نہ بھٹو۔

میں سنجیدہ سیاست (مارکسزم) میں جس ہستی سے سب سے پہلے متعارف ہوا وہ سید صاحب ہی تھا۔ وہ بھی خطوط کی صورت۔ اس کی لکھی ہوئی دو تحریریں سوشلسٹ زعما کے ساتھ میری اولین شناسائی تھیں، جو میرے خطوط کے جواب میں اُس نے لکھی تھیں۔

زندگی کے تقریباً ہر نہج پر سید صاحب کی سکھائی ہوئی مارکسزم کی سچائی واضح تر ہوتی جاری ہے۔ مثلاً اسی ہی کے انتقال کی خبر ''جنگ'' نے دوسطروں میں چھاپ دی۔ بلوچستان کے باقی کسی اخبار نے اس کی موت کا نوٹس ہی نہ لیا۔ شاہ ایران کے زکام اور مفتی محمود کے انگوٹھے کے زخم کی خبر خود میں نے تین تین کالمی سرخی میں دیکھی، ساتھ ہی تصویریں مختلف پوزوں کے ساتھ۔ مگر جب مزدوروں کا استاد مرا، کسانوں کا جیالا ساتھی وفات پا گیا، ایک بہت بڑے شاعر اور ادیب کا انتقال ہوا، ایک بے باک صحافی کی موت ہوئی تو بورژوا صحافت میں اسُے کوئی خبر ہی تصور نہیں کیا گیا۔

بہر حال مزدوروں کے لیے ھیا ھیا کہنے والا باعزم شاعر اپنی طبعی زندگی گزار کر گزر گیا۔ ملاحوں کو ''بڑھے چلو'' کہنے والا فخر بھرا کپتان اُن کے جہاز ہی پر دم توڑ گیا۔ مزدروں کے لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دینے والا سپہ سالار اُن کی صفوں میں جیا اور اُنہیں کی صفوں میں مرا۔ ریت میں بھی ناؤ چلانے والا باہمت بنجارہ اپنی کشتی کو منزل (؟) تک پہنچانے کی آرزوئیں دل میں رکھ کر دم توڑ گیا۔

لال سویرا تو شاید ایک کوآلی ٹے ٹو تبدیلی کا مظہر ہوتا ہے۔ اُس لال سویرے کا نقیب زندگی بھر بگل بجاتا رہا۔ خواب غفلت میں گم سم لوگ کچھ جاگے کچھ نہ جاگے مگر، بنسری بجانے والے

نے تو اپنا فرض پورا کیا۔ علم وعمل کا ''بہتا دریا'' سمندر میں مل گیا۔

وفات سے تین چار سال قبل اس کے معدے کا اپریشن ہوا جس میں معدے کا 3/4 حصہ ڈاکٹروں نے کاٹ دیا تھا۔

لیکن افسوس اس کی پوری زندگی میں پاکستان جاگیرداریت کے متعفن جوہڑ سے نہ نکل سکا۔ اتنا ہوا کہ وہ جاتے جاتے افغان انقلاب کی خوشبو سے لطف اندوز ہوا۔

برصغیر کے اس عظیم سامراج دشمن ادیب' شاعر' صحافی اور سیاسی راہنما سید مطلبی فرید آبادی کا انتقال 21 جولائی 1978 کی شام کو ہوا، لاہور میں۔ وہ 85 سال کا تھا۔

یہ روحانی لگاؤ بھی کیا عجیب رشتہ ہے۔ جس ساتھی کو اس کی موت کے متعلق بتایا وہ جیسے سکتے میں آ گیا۔ یہ سید صاحب کی عظمت ہے کہ لوگ اَن دیکھی شخصیت کی موت کے بارے میں سن کر ایسے مغموم ہو گئے تھے جیسے اُن کا کوئی اپنا مرا ہو۔

اس کے باوجود بھی اگر کسان کہے کہ سید صاحب کی موت بے وقت تھی تو یہ اس جلیل القدر شخص کی روح کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ ایک جاندار مادہ اتنی دیر ہی ایک کیفیت میں قائم رہ سکتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ سید صاحب کو مرنا تھا، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ جاگیرداری کے خلاف عوام کو اٹھنے کے لیے پکارتے پکارتے اس کا گلا بیٹھ گیا اس کی آواز رندھ گئی اس کا معدہ جل گیا اس کی عمر تمام ہو گئی۔ بس سو بٹا سو نمبر لے لیے، اور کیا کرنا تھا، کیا کر سکنا تھا؟۔

سیاست میں پیچیدگیاں

1978ء دراصل سی آر اسلم کے لئے بہت سی چیلنجوں کا سال تھا۔ افغان انقلاب اسی سال ہوا۔ ضیاء الحق نے پورے پاکستان کو اس نوزائیدہ انقلاب کے خلاف لگا رکھا تھا۔ اس ضیائی طوفان کے سامنے رکاوٹ ڈالنے والے جو چند لوگ اور پارٹیاں تھیں ان میں سی آر اسلم اور اس کی پارٹی پاکستان سوشلسٹ پارٹی سرفہرست تھے۔ اسی سال جناب سید مطلّبی فرید آبادی کا انتقال ہوگیا۔ جو کہ پارٹی آرگن ''عوامی جمہوریت'' کا ایڈیٹر تھا۔

سید صاحب کی وفات کے بعد سی آر اسلم پارٹی کے تمام انتظامی، سیاسی اور نظریاتی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اس کے ترجمان ہفت روزہ کی ادارت کا کام بھی کرنے لگا۔ مضامین لکھنا ، قارئین تلاش کرنا، اخبار کی طباعت و ترسیل، اخراجات کا بندوبست کرنا سب انکا کام ٹھہرا۔

ضیاء کے مارشل لا کی سخت گیری میں سی آر اسلم خالی جگہوں سے بھرے ہوئے اپنے ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' کو چلاتا رہا اور پارٹی کے دور دراز واقع پاکٹوں کو سنبھالا دیتے رہے۔ افغان انقلاب کی حمایت پہ مبنی خارجی و داخلی پالیسیوں پر لکھتا بولتا رہا اور پارٹی کی عوامی تنظیموں کو اپنے سیاسی موقف کی وضاحت اور کارکنوں کی موبلائزیشن کا ذریعہ بناتے رہے۔ یہ عوامی تنظیمیں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن اور پاکستان کسان کمیٹی تھیں۔ بالخصوص ستّر کی دہائی کے آخری

اور 80 کی دہائی کے اوائل میں ٹریڈ یونین ہی پارٹی کا بیرونی چہرہ قرار پایا۔ ریفرنڈموں میں حصہ لینا ، ہڑتالوں کی رہنمائی کرنا ، اس کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس بلانا، استقبالیے منعقد کرنا' بہت سے بہانوں سے اس کی میٹنگیں جلسے کرنا۔۔۔۔۔ یہ سب اسلئے تھا کہ پارٹی پالیسی بیان کی جاتی رہے۔

یہ بہت ہی سخت زمانہ تھا۔ پارٹی کے صوبہ سرحد کے سربراہ جناب عبدالوحید ایڈووکیٹ اسی دور میں دوبارہ نہ سنبھلنے اور تکلیف دِہ موت سے ہمکنار ہونے کے لئے مارشل لائی جیل میں ڈال دیئے گئے۔ ٹریڈ یونین رہنماؤں کو تو مختلف میعاد کی سزائیں ہوئیں اور جرمانے عائد ہوئے۔

ادھر اڑوس پڑوس میں بدبختیاں ہی بدبختیاں اُمڈ رہی تھیں۔ نور محمد ترہ کی کا قتل، اور حفیظ اللہ امین کی بادشاہی ، پھر اس کی برطرفی اور ببرک کارمل کی تخت نشینی ۔۔۔ سب طرف کنفیوژن ہی کنفیوژن تھا۔ مگر سی آر اسلم افغان انقلاب کے دفاع میں اُسی چستی، پھرتی اور ثابت قدمی سے جتے رہے جس طرح روز اول میں تھے۔

ادھر چین میں ماؤزے تنگ دور کا خاتمہ ایک اور عہد کے شروعات سے ہو رہا تھا۔ ماؤ کی تصاویر ہٹائی جا رہی تھیں۔ شخصیت پرستی کے خلاف باتیں ہو رہی تھیں، چین کو دنیا کے لئے کھول دینے کے اقدام ہو رہے تھے۔ مگر سی آر اسلم واقعاتی باتوں کی بجائے سارا زور سوشلزم کے بنیادی اصولوں پہ مرکوز رکھے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھے۔

اِدھر ہمارے پڑوس میں ایران، خمینی کی دو دھاری تلوار کی زد میں تھا۔ اگر شہنشاہیت کا خاتمہ خوبصورت ترین پہلو تھا تو کمیونسٹ دشمنی ہیچ ترین حقیقت۔ سی آر دونوں کو الگ الگ دیکھ رہے تھے۔ وہ ایران عراق جنگ کو دونوں ممالک کے عوام کے لئے بدقسمتی سے تعبیر کر رہے تھے۔

ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ سی آر اسلم برصغیر کے ان دو چار گنے چنے افراد میں سے ہیں جن کے پاس بے پناہ علم تھا اور جنہوں نے اس علم کو خوب پھیلا کر ایک پوری نسل کی سوچ کو آفاقی بنا دیا۔ اس شخص نے محض اپنی سوچ اور نظریے پر قائم رہنے اور اسے پھیلانے میں محنت کی بدولت ہزاروں انسانوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔

یہ خوبصورت اور خوب سیرت شخص اپنی تمام تر عجز و انکساری کے ساتھ زندگی بھر سوشلزم کی

تبلیغ وترویج میں لگا رہا۔ باتیں کرتے تھے تو دل کرتا سنتے ہی رہیں۔ دلیلیں، حکایتیں، لطیفے، اشعار اور ضرب الامثال ان کی گفتگو کا لازمی حصہ ہوتے تھے۔ یہ شفیق انسان اپنے مسکراتے وجود کی طرح ظاہر و باطن دونوں صاف رکھتے تھے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اس کھردری اور سرگرم دھائی کے دوران ان کے لکھے گئے خطوط ہمارے پاس محفوظ رہے۔ یہ خطوط سی آر اسلم کی سوانح حیات کا ایک گراں مایہ حصہ ہیں۔

******

4-11-78

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

نومبر شروع ہوگیا ہے اور آپ کے امتحان کے دن قریب ہوگئے ہیں. امید ہے اور میری خواہش بھی ہے کہ آپ کامیاب ہوں۔ میں حسبِ وعدہ ان دنوں میں آؤنگا جب آپ امتحان سے فارغ ہوجائیں گے۔

آپ کا خط ملا۔ ہم کتابیں جمع کررہے ہیں اور امید ہے کہ اس سلسلے میں سبی کی لائبریری کے لئے کتابیں اردو اور انگریزی کی، اور ادب اور سیاست پر جمع کرلیں گے اور یہ آپ کو ارسال کردی جائیں گی۔

میاں شاہین شاہ آگئے ہیں اور آپ کا خط اور مکتوب بلوچستان لے آئے ہیں۔ شکریہ۔ وہ آپ دوستوں کی گرم جوشی اور مہمان نوازی سے بہت خوش ہیں۔

میں کوشش کرونگا کہ عوامی جمہوریت کا ایک صفحہ ہر شمارے کا ''انقلاب افغانستان'' کے لئے وقف رہے۔ بعض دفعہ کام زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس میں تاخیر ہوجاتی ہے ورنہ تساہل میری طبعیت میں نہیں ہے۔ گزشتہ دو شماروں میں اس انقلاب کے بارے میں براہ راست اور بالواسطہ کافی اطلاعات دی ہیں۔

میں آپ کی لائن سے متفق ہوں۔ دراصل اس سلسلے میں زیادہ زور سرحد اور بلوچستان

میں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں سرحد میں زیادہ کام نہیں ہورہا ہے۔ امید ہے اگلے ماہ تک اس کام میں جان ڈالی جائیگی۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

لاہور

13-11-78

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

امید ہے کہ آپ امتحان کی تیاری میں زور وشور سے مصروف ہونگے۔ ہم جناب نور محمد ترہ کئی کی سوانح حیات اور انقلاب افغانستان پر ایک پمفلٹ چھاپ رہے ہیں۔ آپ دوستوں کو بلوچستان کے لئے ان دونوں کی الگ الگ کتنی تعداد کی ضرورت ہوگی۔ ہم اس کی ایک ایک روپیہ قیمت رکھیں گے۔

احباب کا کیا حال ہے اور این ڈی پی اور پختون خواہ کا کیا حال ہے۔ فرصت ہو تو خط لکھ دینا ورنہ پڑھائی میں لگے رہو۔

سب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

22-11-78

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

آپ کا خط ملا، شکریہ۔ میاں شاہین شاہ کوئٹہ سے واپسی پر ملے تھے وہ بہت خوش تھے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ خود یہ فیصلہ کریں کہ تنظیمی طور پر پارٹی میں شامل ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر وہ عوامی جمہوری اتحاد کی سطح پر مل کر کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے ہیں کہ وہ اپنے احباب سے مل کر فیصلہ کریں گے اور پھر وہ مجھے یکم دسمبر کو پشاور میں بتادیں گے (میں یکم دسمبر کو پشاور میں ہوں گا)۔ آپ نے میاں صاحب کے پیٹی بورژوا خواص کا جو اندازہ لگایا ہے وہ درست ہے۔ میں آپ کی مارکسی ذہانت کی داد دیتا ہوں کہ جس نتیجے پر ہم کئی برسوں کے تجربے کے بعد پہنچے اس پر آپ ایک ملاقات میں پہنچ گئے۔ بہرکیف اگر وہ پارٹی کے ڈسپلن میں آنے کو تیار ہوگئے تو ان کی شرکت بہرکیف مفید ہی رہے گی۔

افغانستان پلٹ احباب سے علمی اور نظریاتی بحث جاری رکھیں تاکہ نظریاتی اور سیاسی یک جہتی پیدا ہوسکے۔

ہم اخبار افغان کونسل لٹن روڈ کوئٹہ کو اس شمارے سے ارسال کرنے شروع کردیں گے۔

ہم نور محمد ترہ کئی کی سوانح حیات جو کابل ٹائمز میں چھپی ہے ترجمہ کرکے کتابچے کی صورت میں چھاپ رہے ہیں اور خلق پارٹی کے ایک پمفلٹ کا ترجمہ بھی چھاپ رہے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ بلوچستان کے لئے آپ کو ہر دو کتابچوں کی کتنی کاپیاں ارسال کریں۔ میری کوشش ہے کہ ہر دو کتابچے یکم دسمبر سے پہلے تیار ہوجائیں تاکہ فرنٹیئر کے لئے اپنے ساتھ لے جاؤں۔

آپ جی لگا کر پڑھیں۔ آپ ذہین اور محنتی طالب علم ہیں۔ کرپشن سے نہ گھبرائیں۔ یہ تو ہر جگہ ہے آپ جیسے قابل طالب علم ہر صورت کامیاب ہوتے ہیں۔

میں جنوری میں آپ کے امتحان کے بعد آؤں گا تاکہ ہم دونوں بلوچستان کے مختلف شہروں اور قصبات کا دورہ کرسکیں۔

کراچی میں 29,30 دسمبر کو لیبر کانفرنس ہورہی ہے لاہور سے وہاں جاؤں گا اور وہیں سے کوئٹہ آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤں گا۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

26-11-78

محترمی شاہ محمد مری

تسلیمات!

آپ کا خط ملا۔ ''آدمی کا مقدر'' عوامی جمہوریت میں قسط وار چھپ سکتا ہے۔ آپ عوامی جمہوریت کے صفحے کے سائز پر کتاب آفسٹ کی کرا کر بھیج دیں آپ سارے ناولٹ کی کتابت کرا کے ارسال کردیں ہم ہفتہ وار چھاپتے رہیں گے۔

اگر آپ اسے کتابی صورت میں شائع کرنا چاہیں تو اس کی کتابت طباعت اور کاغذ پر اٹھنے والے خرچے کا حساب لگا کر ہمیں بتائیں اور اگر ہماری جیب نے اجازت دی تو ہم آپ کی مدد کریں گے۔ یہ ناولٹ بلوچستان کی سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کرلیا جائے گا اس کا دوہرا فائدہ ہوگا۔ اچھے خیالات بھی عوام تک جائیں گے اور پارٹی کا نام بھی۔ آپ فیصلہ کرکے ہمیں خط تحریر کردیں۔

''کسان کی بیٹی'' خاصا مقبول ہوا ہے۔ آپ دوسرے افسانے کا ترجمہ بھی ارسال کردیں تاکہ ہم عوامی جمہوریت میں چھاپ دیں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

آپ کا خط ملا۔ مرزا کے جلسے اور دورے کی کارروائی پڑھی۔ آپ نے بالکل درست کیا کہ مرزا کی سیاست پر تنقید کی۔ آج کی سیاست بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ بہت پیچیدہ ہے۔ مرزا اس سیاست کو کیا جانے۔

اصل بات تو سیاست کی ہے۔ اب تک کے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ہماری سیاسی لائن اور ہمارا نظریہ درست ہے اور عوام اس کو قبول کر رہے ہیں گو یہ قبولیت بہت سست ہے۔ اس کی وجہ جہاں ہم تھوڑے ہیں اور عوام سے رابطہ تیزی سے نہیں کر رہے ہیں وہاں عوام کی شعوری سطح کا بھی سوال ہے۔ پھر عوام اپنے تجربات سے سیاسی لائن کو قبول کرتے ہیں۔ ہم سیاست کرتے ہیں نعرے بازی نہیں کہ ہم بھی نعرے بازی کے سوداگر بن جائیں۔ اصل بات مارکسزم کی صداقت ہے اور یہ صداقت اپنا لوہا منوا رہی ہے اور دو تین سالوں میں یہ صداقت روشنی بن کر پھیل جائے گی اور گرد و غبار اور تاریکی چھٹ جائے گی۔ اندھیروں کے یہ مسافر چندھیا جائیں گے کہ تاریکی کے عادی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

احباب کو سلام

آپ دل و جان اور تن من سے امتحان کی تیاری کریں اور امتحان سے فارغ ہو کر سیاست کے میدان میں اسی لگن اور جذبے سے کود یں۔ ہم بھی آپ کا ہاتھ بٹائیں گے اور پھر آپ سب اور ہم سب مل کر اپنی واضح منزل۔۔۔ سوشلزم کے لئے تیز رفتاری سے کام کریں گے۔

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

محترمی شاہ محمد مری صاحب

اسلام علیکم

ایس ایس او نے بلوچستان کی معدنیات اور کان کنی اور کان کنوں کے بارے میں جو

تحقیقی مقالہ لکھا تھا وہ ان کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ ایس ایس او کے رفقاء اب بلوچستان کی زرعی معیشت پر تحقیقی مقالہ تحریر کریں اور اخبار میں چھپنے کیلئے ارسال کریں۔

اس تحقیق کو کرنے کے لئے مندجہ ذیل امور سامنے رکھے جائیں۔

پشتون ایریا: زراعت میں ملکیتی رشتے

مزارعوں اور مالکوں کے رشتے اور مزارعت کی شرائط

کھیت مزدوروں کے حالات کار اور ان کے حقوق

بلوچ ایریا:

چرواہی معیشت:

چراگاہیں اور ان کی ملکیت

چرواہوں کے حقوق اور حالات کار

کیا مویشی سرداروں کی ملکیت ہیں یا چرواہوں کی

زراعت:

ملکیت کے رشتے

حقوق مزارعت بٹائی وغیرہ۔

طریق ہائے آبپاشی

سبزیات اور باغات۔۔۔۔۔۔۔۔ان کی پیداوار اور فروخت کے انتظامات

زرعی دیہات میں طبقاتی تقسیم اور ان کے باہمی رشتے۔

چرواہی معیشت والے علاقوں میں طبقاتی تقسیم اور ان کے باہمے رشتے

دیہات میں سیاست کے اثرات اور دیہاتی عوام کا سیاسی شعور

مجھے امید ہے کہ آپ دوست اس کام کو جلد از جلد انجام دیں گے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

******

بخدمت جناب شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے اور آخری سال کے آخری امتحان کی تیاری میں مصروف ہوں گے میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

آپ کے تینوں پیڈ چھپ کر تیار ہیں جو طالب علم دوست کوئٹہ سے ملتان طلباء کی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے گا اس کے ہاتھ ارسال کر دیئے جائیں گے۔ البتہ اگر کوئی طالب علم کوئٹہ سے ملتان نہیں آ رہا ہے تو مطلع کریں تا کہ بذریعہ ریل بلٹی کرا دی جائے۔

جماعتِ اسلامی کے جناب میاں محمد طفیل بلوچستان کے دورے پر گئے تھے اور انہوں نے وہاں آ کر ایک پریس کانفرنس سے خطاب بھی کیا ہے۔ ان کے دورے کے سیاسی اثرات کے بارے میں تحریر کریں۔ بلوچستان کی سیاست میں پہلے سے زیادہ گرمی دکھائی دیتی ہے۔ کئی پارٹیاں اپنے اجلاس کوئٹہ کی خنک فضاء میں منعقد کر رہی ہیں۔

پختون خواہ کے رحیم صاحب اور اکرم شاہ سے ملاقات ہوتی ہے تو بتائیں کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

ایران کا بادشاہ تو اب کوئی دن کا مہمان ہے۔ اس کی جگہ فوجی حکومت بنانے کے مشورے ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ فوجی حکومتیں بھی عوام کے ابھرتے ہوئے مسائل حل نہیں کر سکیں گی۔ ایران کے سماج میں معاشی مسائل بڑے گھمبیر ہیں۔ اور معاشی تضادات موجودہ نظام کے اندر نا قابل حل ہیں۔ اس لئے عوام کی طبقاتی جدوجہد جاری رہے گی۔ اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک عوام کی نمائندہ حکومت برسر اقتدار نہیں آتی۔ اور وہ پرانے سماج کو ڈھا کر نیا سماج میں وجود میں نہیں لاتی۔ یہ تضادات باہم دگر متصادم رہیں گی۔ اس خطے کا یہ دوسرا اہم ترین واقعہ ہوگا اور اس واقعہ کے اثرات بھی جنوبی ایشیاء اور خلیج فارس کے ممالک میں دوررس ہوں گے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

28-11-78

محترمی شاہ محمد مری

تسلیمات!

''عالم اسلام روبہ زوال کیوں'' نامی پمفلٹ آپ دو ہزار چھپوالیں آفسٹ پر چھپوائیں۔ اس کی کتابت۔ طباعت اور کاغذ کے خرچ کا حساب لگوا کر مجھے بتا دیں۔ میں یہ رقم بذریعہ منی آرڈر آپ کو ارسال کر دوں گا۔ آپ دوستوں نے اس میں سے اگر پانچ بھی فروخت کر لیے تو لاگت واپس آ جائے گی۔ اگر آپ مفت تقسیم کرنا چاہیں تو مفت تقسیم کر دیں۔ یہ آپ دوستوں پر منحصر ہے۔

جہاں تک سیاست میں لچک کی بات ہے میں آپ سے متفق ہوں۔ لیکن اصولوں میں لچک پیدا نہیں کرینگے البتہ Tactics میں لچک پیدا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے بعض اوقات لچک ضروری ہو جاتی ہے۔

آپ کی یہ رائے بھی درست ہے کہ بنیادی مطالبات کے یوم منانے ضروری ہیں۔ میں نے آپ کی شکایت اسلم اعوان کے حوالے کر دی ہے اور میں خود بھی یہ دیکھوں گا کہ آپ دوستوں کو ''عوامی جمہوریت'' باقاعدگی سے ملتا رہے۔

کراچی۔ کوئٹہ اور ملتان میں تو اخبار بک سٹالوں پر فروخت ہوتا ہے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

21-3-79

محترمی شاہ محمد مری

تسلیمات!

آپ کا خط اور مضامین سب مل گئے ہیں بہت بہت شکریہ۔ آپ نے جن خیالات کا اظہار اپنے خط میں کیا ہے مجھے ان سے پورا اتفاق ہے۔ ہم ہر طرح سے آپ کی اس لائن کو آگے چلانے میں مدد دیں گے۔ میں اپریل کے مہینے میں حاضرِ خدمت ہوں گا۔ تاریخ کا تعین آپ کریں گے۔

خیال ہے کہ ہم تیئس مارچ سے افغانستان کے انقلاب کی کامیابی سے عوام کو روشناس کرانے کی مہم کا آغاز کریں اور اس کے ساتھ ایران کے انقلاب کے بارے میں عوام کو بتائیں کہ یہ سامراج کے خلاف' بادشاہت کے خلاف، اور سماجی ترقی آزادی اور خوش حالی کے لیے ہے اور اس کے ساتھ عوام کی آزادی کی جدوجہد سے یک جہتی کا اظہار کریں اور اس مہم کو دو تین ہفتوں تک جاری رکھیں۔

مہم کے سلسلے میں محنت کشوں کی میٹنگیں کی جائیں' طلبا کی کی جائیں' کسانوں کی کی جائیں۔ اور ہینڈ بل اور پمفلٹ بھی شائع کر کے تقسیم کئے جائیں۔ اس سلسلے میں ایک ہینڈ بل آپ کو ارسال کیا جا رہا ہے، سبی کے لئے الگ ارسال کیا گیا ہے۔

اس مہم کے سلسلے میں جو تعاون ہم سے مانگیں گے وہ ہم مہیا کریں گے۔

افغان انقلاب نے جس طرح قومی مسئلہ حل کیا ہے اس کے بارے میں آپ کا مضمون ہم نے چھاپ دیا ہے۔ امید ہے کہ چند روز میں آپ کو یہ اخبار مل جائے گا۔

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

3-4-79

محترمی شاہ محمد مری

تسلیمات!

ٹی وی پر سنا ہے کہ آپ سب رہا ہو گئے ہیں اور پراسیکیوشن کی ترمیم واپس لے لی گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ سب طلبا کو مبارکباد کہ آپ کی جائز جدوجہد کامیاب ہوئی۔

اگر آپ کو میرا یہ خط مل جائے تو مناسب رہے گا کہ اس میں آپ کو تین اہم تقریبات کے سلسلے میں یاددہانی کرانا چاہتا ہوں۔

اول یوم لینن کہ 22 اپریل کو' دوم یوم ثور انقلاب 27 اپریل کو ہے اور یوم مئی کہ پہلی مئی کو ہے۔

امید ہے آپ سب ان تقریبات کو منائیں گے۔ یومِ لینن پر عوام پر واضح کریں گے کہ مارکسزم لینن ازم اس عہد کی عظیم سچائی ہے۔ ثور انقلاب پر اس انقلاب کی کامیابیوں کا ذکر کریں گے اور عالمی انقلاب کی برق رفتاری پر روشنی ڈالیں گے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

2-6-79

ڈیئر شاہ محمد مری

تسلیمات!

آپ اور منٹو صاحب بخیریت پہنچ گئے ہوں گے۔ آپ منٹو صاحب کے دورے کی رپورٹ ضرور ارسال کریں۔

ہم نے طے کیا ہے کہ پندرہ جون کو یوم آزادیِ فلسطین منایا جائے اور اس روز فلسطینی عوام سے یک جہتی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے لئے آزاد وطن کا مطالبہ کیا جائے۔ مصر اسرائیل

امن سمجھوتہ صہیونی اور سامراجی سازش قرار دیا جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ مصر سے سفارتی تعلقات منقطع کر لے۔

اس سلسلے میں پارٹی کی طرف سے ہینڈ بل چھاپ کر تمام شہروں اور قصبوں میں تقسیم کیا جائے اور تمام سامراج دشمن ترقی پسند عناصر سے مل کر اس روز میٹنگیں کی جائیں۔

ہم نے یہ بھی طے کیا ہے کہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی توسیعی میٹنگ 20 جولائی کو کی جائے۔ آپ تو شرکت کریں گے ہی۔ آپ اپنے ہمراہ بہار خان اور ایک اور رفیق کو لیتے آئیں کہ وہ بھی اس میں شریک ہوں۔ کوئی قرارداد پیش کرنا مطلوب ہو تو آپ لکھ کر ہمراہ لائیں۔

ایجنڈا ارسال کر دوں گا۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

5-6-79

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

آپ کو 6 جولائی کو وقت پر لاہور آنا ہوگا اور ہم آپ کے ساتھ کوئٹہ کے لئے چلیں گے اور ایک ہفتہ کوئٹہ اور سبی وغیرہ میں آپ کے ہمراہ جائیں گے۔ یہ پروگرام آپ کو اپنی سہولت اور ایس ایس او کی میٹنگ کے پیش نظر بنانا ہوگا۔ لیکن 6 جولائی کی آمد ضروری ہے۔ ہم نے بیس جولائی کو پارٹی کی توسیعی مرکزی کمیٹی کی میٹنگ رکھی ہے اس میں آپ بھی آئیں گے اور دور رفقاء کو ہمراہ لائیں گے۔ آپ کے پاس آٹھ جولائی سے پندرہ تک کا وقت ہے جب میں کوئٹہ آپ کے ہمراہ جا سکتا ہوں۔ اس میں یہ تبدیل ہو سکتی ہے کہ اگر آپ کی ایس ایس او کی میٹنگ دس جولائی میں ہوتی ہے۔ ہم گیارہ جولائی سے اٹھارہ جولائی تک آپ کے ہمراہ دورہ کریں گے۔

بہر کیف یہ آپ پہ منحصر ہے۔ میرا تو 6 جولائی کو اور 20 جولائی کو لاہور میں ہونا ضروری ہے ان دونوں تاریخوں کے درمیان آپ ایک ہفتہ کا پروگرام بنا لیں۔

احباب کو سلام

امید ہے منٹو صاحب کا دورہ کامیاب رہا ہوگا۔

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

12-6-79

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

مجھے آج ہی ایم اسماعیل لونی کا خط ملا ہے جس میں یہ خوش خبری موجود ہے کہ آپ فائنل ایم بی بی ایس میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ میری طرف سے اور پارٹی کے تمام رفقاء کی طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

منٹو صاحب دورے سے بہت خوش آئے ہیں۔ دورے کی کامیابی پر آپ احباب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مکتوبِ بلوچستان کا انتظار ہے۔ اس میں ملکی سیاست کے علاوہ افغان بھگوڑوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی تحریر کریں۔

آپ سے 6 جولائی کو میٹنگ ہوگی اس ملاقات پر مزید باتیں ہوگی۔

آپ ایک دفتر تلاش کر لیں اور پارٹی کی طرف سے لے لیں۔ آپ مالک مکان کو ادائیگی کر کے ایک سال کے لئے بے فکر ہو جائیں۔

آنے سے پہلے یہ کام کرتے آئیں۔ دفتر کے لئے ایک میز چند کرسیاں اور ایک دری وغیرہ بھی لے لیں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

لاہور

21-6-79

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

مجھے آپ کا 16-6-79 کا خط ملا۔ مندرجات سے آگاہی ہوئی۔ ان کے بارے میں 6 جولائی 1979 کو لاہور میں غور کریں گے۔ آپ اس میٹنگ میں ضرور شرکت کریں۔

20 جولائی کی توسیعی میٹنگ کی اطلاع (ایجنڈا) سات جولائی کو جاری کیا جائے گا۔ ایجنڈا طباعت کے زیور سے آراستہ کرلیا گیا ہے۔ صرف 6 جولائی کی میٹنگ کا انتظار ہے۔ اس کے بعد ایجنڈا جاری کر دیا جائے گا۔ جس باشعور نوجوان کو اس میٹنگ میں شریک کرانا چاہیں اس کو دعوت دے دیں۔

میری ساری کوشش یہ ہے کہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں باشعور، سنجیدہ اور باعمل نوجوان شامل ہوں اور کمیٹی صحیح معنوں میں انقلاب کی رہنمائی کے قابل ہو سکے۔

میری دوسری کوشش یہ ہے کہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں باشعور، سنجیدہ اور باعمل نوجوانوں (طالب علموں، مزدوروں اور کسانوں) کو شامل کیا جائے۔ یہ درست ہے کہ ہماری پارٹی کی ممبر شپ کے لئے تین شرائط موجود ہیں: مارکسزم لیننزم کے اصولوں سے آگاہی، پارٹی کے پروگرام سے وفاداری اور کسی نہ کسی محاذ پر کام سے وابستگی۔ اس کے لئے ہمیں رفقاء کی نظریاتی تعلیم اور سیاسی تربیت کرنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیٹی بورژوا خود غرضی، حسد اور جوڑ توڑ کی لعنت پارٹی میں آجاتی ہے۔ اور اجتماعی لیڈر شپ کا اصول پیچھے پھینک دیا جاتا ہے۔

اس کے خلاف جہاد کے لئے نظریاتی تعلیم اور سیاسی تربیت کے ساتھ تنقید اور خود تنقیدی کا استعمال بھی ضروری ہے۔

مجھے خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ آپ جیسے باشعور نوجوان پارٹی میں شامل ہیں اور مستقبل میں پارٹی آپ کے ہاتھوں میں مضبوط بھی ہوگی اور کامیاب بھی۔ اور سوشلزم کی تعمیر میں عوام کی رہنمائی کے فرائض بھی ادا کرے گی۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

لاہور

28-7-79

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ میری غیر حاضری میں واپس چلے گئے اس لئے آپ کو خدا حافظ نہ کہہ سکا۔ امید ہے کہ آپ پارٹی کی تنظیم اور عوامی تنظیموں کی طرف توجہ دیں گے اور اپنی مثالی تنظیم کو اور فعال بنائیں گے۔

مائنرز کانفرنس کے بارے میں ملک اسلم آپ کو خط تحریر کریں گے۔ میرے ذہن میں اس کی تفصیل اس وقت نہیں ہے اور ملک اسلم دفتر میں موجود نہیں ہے۔ میں یہ خط ایک اور مقصد کے لئے تحریر کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ لاہور میں مرکزی ورکرز رابطہ کمیٹی کی کانفرنس ہوگئی تھی۔ اس نے طے کیا ہے کہ اس کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور اس کے لئے کمیٹی نے طے کیا ہے کہ بلوچستان سے مرکزی کونسل میں چار نمائندے ہوں۔ اور ان کا چناؤ صوبہ بلوچستان کی مزدور تنظیمیں جو پہلے سے اس رابطہ کمیٹی میں شامل ہیں یا اب شامل ہوں، کریں۔

بلوچستان میں مزدور تنظیموں میں آپ دوست ہیں یا نادر شاہ بخاری ہے۔ مجھے کسی دوسری تنظیم کا پتہ نہیں ہے۔آپ صوبائی ورکرز رابطہ کمیٹی کا پتہ دریافت کرا کے اس میں کسی دوست کو شامل کرائیں۔اور کم از کم ایک ممبر مرکزی کونسل کے لئے اپنا بھجوائیں۔اس سلسلے میں ملک اسلم آپ کو سرکلر بھی ارسال کرے گا۔

احباب کو سلام

جواب کا منتظر

مکرر۔آپ مکتوب بلوچستان ارسال کریں۔کوئٹہ میں حال ہی میں PNP کی میٹنگ ہوئی ہے۔

PNP کا طلباء میں کیسا اثر ہے اس کا بھی ذکر کر دیں۔سوویت یونین، افغانستان اور پاکستان کے باہمی روابط میں خوش گوار تبدیلی کی توقع ہے۔آپ دوست افغانستان سے یک جہتی اور ان تینوں ملکوں کے بہتر تعلقات کے بارے میں اپنی لائن پورے زور سے جاری رکھیں۔ دوسروں سے اس سلسلے میں مباحثے مذاکرے اور گفتگو موزوں رہے گی۔

سی آر اسلم

******

لاہور

15-8-79

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

مدت سے نہ آپ کا کوئی نامہ آیا ہے نہ پیام۔اور نہ ''مکتوبِ بلوچستان''۔ پہلے تو مصروف تھے۔اب تو جونیئر ڈاکٹروں کی ہڑتال کامیابی سے ہمکنار ہو کر ختم ہوگئی ہے اور آپ کو فرصت ہوگئی ہے۔کیا میں امید رکھوں کہ آپ پی این پی، اور پختون خوا اور دیگر پارٹیوں کے بارے

میں تحریر کریں گے۔افغان پناہ گزینوں کی سرگرمیوں کا ذکر کریں گے۔اور رجعت پسند سیاست دانوں اور امریکی دانشوروں کی ملاقاتوں کا بیان کریں گے۔اور بی ایس او، پی ایس او اور دوسری طلباء تنظیموں کے رفقاء کے سیاسی شعور کی بات کریں گے۔

ہم نے فیصلہ کیا ہے (جس کی اطلاع آپ کو دے چکا ہوں) کہ 23 گست کو سامراج دشمن اور نا وابستہ تحریک کا دن منایا جائے اور اس روز، زور افغانستان سے بہتر تعلقات اور امریکہ کی دھمکیوں کی مذمت پر دیا جائے۔ یہ جلسے کوئٹہ، سبی اور دوسرے مقامات پر کئے جائیں اور انہیں سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کرے۔ممکن ہو تو پاکستان کی خارجہ پالیسی پر ایک ہینڈ بل بھی نکال لیا جائے۔ اور تقسیم کیا جائے۔

ہم نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اکتوبر کے کسی روز بلوچستان میں کسان ریلی کی جائے۔اس کے لئے سبی بھی موزوں جگہ ہو سکتی ہے اور کوئی اور بھی۔سبی اس لئے کہ یہاں اپنے رفقاء کافی تعداد میں ہیں۔اگر آپ کو یہ تجویز مناسب لگے تو مجھے تحریر کریں اور ہم آپ کو اس تیاری میں مدد دیں گے۔اکتوبر ایک تو ویسے خوشگوار مہینہ ہے، دوسرے اس ماہ میں سیاسی پابندیاں بھی نہیں ہوں گی۔

یہ ایک روزہ ریلی ہوگی جس میں کسان، مزدور، طالب علم صبح دس بجے جمع ہوں گے اور بعد دوپہر تک جلسے میں رہیں گے۔

اس کی تیاری کے لئے پوسٹر اور ہینڈ بل چھپیں گے اور رفقاء دورے کریں گے۔اس اجتماع میں ایسے علاقوں کے لوگ آئیں گے جو ریل اور سڑک سے آسانی سے آسکتے ہیں اور شام تک واپس جا سکتے ہیں۔

پوسٹروں اور ہینڈ بلوں میں زرعی، صنعتی، ثقافتی اور قومی مسائل پر اپنی لائن ہوگی اور مزدور کسان راج کی بات ہوگی۔اور محنت کشوں کے اقتدار کی بات ہوگی۔اگر ہم اس اجتماع میں پانچ سے دس ہزار تک کسان مزدور طالب علم جمع کر سکے تو بلوچستان کی تاریخ میں یہ بہت اہم واقعہ ہوگا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ دوست جس پہل قدمی، ہمت اور جوش کے مالک ہیں اس سے بڑا اجتماع کر لیں گے۔ اجتماع مشکل نہیں رہتا اگر کسانوں مزدوروں اور طالب علموں کو ان کے

مطالبات اور مزدور کسان راج کے سیاسی نعرے پر متحرک کیا جا سکے۔ پھر عوام فوری پہنچ جاتے ہیں۔
ڈھول بجاتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے اور گاتے ہوئے۔

محنت کش عوام جب سیاسی (طبقاتی سیاست کے) طور پر حرکت میں آتے ہیں تو وہ عوام کا کلچر بھی تخلیق کرتے ہیں۔ رقص اور موسیقی ان کے اعضاء اور ان کے گلوں سے پھوٹ پڑتی ہے۔

آپ کا خط آنے پر تفصیل سے اس بارے میں تحریر کروں گا۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص
سی آر اسلم

******

لاہور

19-8-79

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

''پاکستان میں سوشلسٹ تحریک'' نامی پمفلٹ بذریعہ رجسٹرڈ پارسل ڈاک ارسال کر دیا ہے آپ کو مل جائے گا۔ آپ مناسب انداز میں تقسیم کریں۔

میں نے کئی خطوط تحریر کئے تھے کہ آپ بلوچستان کی سیاسی صورتحال پر اپنی مکتوب ارسال کریں۔ آپ مشغول تھے۔ اب فارغ ہیں فرصت ملے تو حالات سے آگاہ کریں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص
سی آر اسلم

******

لاہور

21-8-79

مکرمی شاہ محمد مری صاحب

اسلام وعلیکم

28,29 ستمبر کو ناگپور (انڈیا) میں کارکنوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ لہذا آپ اپنے آنے کی اطلاع دیں۔ تاکید ہے۔ بشیر صاحب جانے کو تیار ہیں۔ آپ مائنرز کے حالات زندگی اور حالات کار کی رپورٹ بھی لیتے آئیں اور پاسپورٹ بھی جس پر انڈیا کی انڈورسمنٹ موجود ہو ہمراہ لائیں۔

یہاں سے 25 ستمبر تک روانگی ہوگی۔

آپ کا مخلص
سی آر اسلم

******

ضیا مارشل لا سے ٹکر تو لازمی تھی۔ ایک بہت بڑی مدبھیڑ تو کراچی شپ یارڈ کے چھ ہزار مزدوروں کی مکمل ہڑتال کی صورت ہوئی جو 1979 میں تقریباً ڈھائی ماہ تک جاری رہی۔ یہ مزدوروں کی یک جہتی اور تنظیم کی شاندار مثال تھی۔ شپ یارڈ کی نمائندہ تنظیم سی آر اسلم کی زیر سرپرستی چلنے والی پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن سے منسلک تھی اور اس کی لیڈر اور دیگر راہنما پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ مارشل لا نے اس ہڑتال کے دوران دو سو مزدور برطرف کیے۔ درجنوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ تمام لیڈروں کے خلاف مقدمات درج کیے اور تین سال کے لیے یونین پر پابندی لگا دی۔ اس ہڑتال کے دوران مزدوروں نے کراچی شہر میں کئی جلوس نکالے اور اپنے مطالبات کے ساتھ ساتھ مارشل لا کے خاتمے اور آئین کی بحالی کے مطالبات بھی پیش کیے۔ تین سال کے بعد یونین بحال ہوئی اور بحال ہوتے ہی دوبارہ سی بی اے منتخب ہوگئی۔ اگلے ایک دو خطوط میں شپ یارڈ کی اسی تحریک کا ذکر ہے۔

******

29 ستمبر

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری

تسلیمات!

اس سے پہلے میں نے آپ کو خط لکھا تھا کہ آپ اکتوبر کے مہینے میں کوئی تاریخ مقرر کریں جس روز وہاں فیڈریشن کی مجلسِ عاملہ کی میٹنگ کی جاسکے۔ آپکے جواب کا انتظار ہے۔ آپ کا خط آنے پر ہم دوست وہاں آئیں گے اور ہفتہ عشرہ وہاں رہیں گے۔

آپ کا دستی خط مل گیا ہے۔ شکریہ۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنے کام میں کامیاب ہوں گے۔ طلبا کی تنظیمِ نو کی رپورٹ مل گئی ہے۔ آپ نے نیا انتخاب حالات کے مطابق کردیا ہے۔ اُمید ہے کہ طلبا میں کام ترقی کرے گا اور آپ کا مزدوروں میں بھی کام بڑھے گا۔

مکتوب بلوچستان کی جگہ اب ہم بلوچستان کا خبر نامہ کے عنوان سے آپ کی بھیجی ہوئی خبریں اور رپورٹیں چھاپا کریں گے۔ آپ کی تجویز سے اتفاق ہے کہ کسان کمیٹی کا معاملہ فی الحال آئندہ پر چھوڑ دیجئے۔ اگلے سال اپریل کے مہینے میں یا اس کے بعد اس پر غور کریں گے۔ آپ جو کام کررہے ہیں اور جس انداز میں کررہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے۔

طلبا بلٹن کیلئے میں طالب علم ساتھیوں سے کئی روز سے کہہ رہا ہوں امید ہے کہ اس میں باقاعدگی پیدا ہوجائے گی۔

دیمتروف والا مضمون دیکھ رہا ہوں۔ اسے کتاب کی صورت میں چھاپ دیں گے۔ کاسترو کی تقریر ارسال کریں۔ ہم اسے قسط وار ''عوامی جمہوریت'' میں چھاپ دیں گے۔ بلدیاتی انتخابات کے معاملے میں کوتاہی ہوئی ہے، اس کے لئے معذرت خواہ۔ میں چند روز کیلئے لاہور سے باہر چلا گیا تھا اس لئے بروقت اس کے بارے میں نہ لکھا جاسکا۔

شپ یارڈ کے معاملے میں مصلحت نہیں ہے صرف ٹیکٹیکل بات ہے۔

الیکشنوں کے معاملات (رجسٹریشن، متناسب نمائندگی اور بلدیاتی انتخابات) کی وجہ سے عوامی جمہوری اتحاد میں شامل سیاسی پارٹیوں میں ابھی مکمل یک جہتی نہیں ہے اس لئے کام ڈھیلا ہے۔ جس انداز میں حالات بدل رہے ہیں ان سب میں Clarity آجائے گی تو کام ذرا تیزی سے ہوگا۔

ہم اس کوشش میں ہیں کہ لیفٹ کے ساتھ ساتھ جمہوریت پسند سیاسی پارٹیوں سے بھی بات چیت کریں۔ اس سلسلے میں PNP اور NDP سے باتیں ہوئی ہیں۔ شاید اُن تمام سیاسی جماعتوں سے جو رجسٹریشن نہ کرائیں اتحاد کی باتیں ہوسکیں اور معاملہ آگے بڑھے۔

آپ نوجوانوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

****

پیچھے ہٹنے کی دہائی

پچھلی صدی کی 80 کی دھائی اُس انجام کا آغاز تھی جس نے دنیا میں سے انسانی حاصلات کی ساری تاریخ اجاڑ اکھاڑ پھینکی تھی۔ سرمایہ کے ہاتھوں حضرتِ انسان کی اس بڑے پیمانے کی پسپائی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہ کہنا البتہ بہت بڑی زیادتی ہوگی کہ انسانی سماج حتمی طور پر، اور ہمیشہ کے لئے بھیڑیوں کے حوالے ہوگیا۔ ارتقا کی سمت، رفتار اور اٹھکیلیوں کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے پورا عالم دس قدم پیچھے ہٹ آیا۔ سی آر اسلم نے بہت بہادری اور ٹھنڈے مزاج کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھا، سہا اور ردعمل کیا۔ اس باب میں ہم انہی واقعات اور چودھری صاحب کے طرزِ عمل پہ بات کریں گے۔

1981 کے فروری اور مارچ میں ایم آر ڈی کی مارشل لا مخالف اور سی آر کی اپنی سامراج دشمن جمہوری سیاست کی عملی جدوجہد کے نتیجے میں سی آر اسلم اور اس کی پارٹی کے چیدہ راہنما اور کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ پارٹی کے کئی ساتھی شاہی قلعہ لاہور میں تشدد کی قید کاٹتے رہے۔ اور وہ ساتھی جو گرفتار نہ ہوئے تھے اور روپوشی یا نیم روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سی آر اسلم کی تعلیمات کے مطابق پارٹی کی تنظیم کو چلانے، اخبار ''عوامی جمہوریت'' کو جاری رکھنے، اور نظر بند ساتھیوں اور ان کے اہل خانہ کی نگہداشت کرنے کے کاموں میں لگے رہے۔ (16)۔ مارشل لا مردہ باد۔

******

نوکری کے سلسلے میں میری تعیناتی کوئٹہ سے باہر ہوتی ہے۔ لہٰذا سی آر اسلم کے خطوط کو اسی سیاق وسباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

******

لاہور

15-5-82

محترمی شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات!

آپ کا گیارہ مئی کا لکھا ہوا خط ملا۔ یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے اپریل کی چھ تاریخ کو انسی ژنل ہرنیا کا آپریشن کرالیا تھا۔ چودہ دن ہسپتال میں رہ کر گھر آ گیا تھا۔ اب میں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا ہے۔ اور زندگی کے روزمرہ کے کام کرنا شروع کر دیئے ہیں۔

کوئٹہ میں ضرور آؤں گا اور آپ سے اور دوسرے دوستوں سے ضرور ملوں گا۔ 22 جون سے روزوں کا مہینہ شروع ہو جائے گا اور جولائی کے تیسرے ہفتے میں ختم ہوگا اس کے بعد ہی آنے کا پروگرام بنے گا۔ آپ کے ہاں روزوں کے آداب پر بڑی سختی سے پابندی ہوتی ہے اور میرے جیسے مہمان کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ بخیریت ہیں۔ اور یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ آپ برابر لکھنے پڑھنے کا کام بڑے انہماک سے کر رہے ہیں۔

لاہور ضرور آیئے۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ احباب سے ملنا مسیحا وخضر سے ملاقات سے بڑی بات ہے۔ آپ کے ذمے مکتوب بلوچستان باقاعدگی سے لکھنے کی بات طے تھی۔ ہم اس مکتوب کے منتظر ہیں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

7-6-82

محترمی شاہ محمد مری صاحب

بہت سی دعائیں

آپ کا اکتیس مئی کا لکھا ہوا خط آج ملا۔ اس کا کئی دنوں سے انتظار تھا۔ اس لئے میں نے آج ہی اس کا جواب تحریر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جواب حاضر ہے۔

اچھا کیا آپ نے مینی فیسٹو کا ترجمہ عبداللہ جمال دینی کو بھیج دیا۔ وہ باشعور اور صاحبِ ذوق انسان ہیں۔ مجھے صرف ان سے یہ گلا ہے کہ وہ بی ایس او کے چکر میں مبتلا ہیں۔ اردگرد ہونے والے واقعات اس چکر سے نکلنے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو اپنے دل کی باتیں ان کے گوش گزار کر دوں گا۔

کفر کے فتوے ہوں یا نفرت کے انبار آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ صدی تو سوشلزم کی صدی ہے اور اگلی صدی انسانی بہبود اور فلاح کی ہے۔ اگلے دس پندرہ سالوں میں ماضی کے یہ پرستار غلاظت کے ڈھیر پر ہوں گے۔ اور ان ڈھیروں کو صاف کر کے دنیا کو حسین اور خوش نما بنا دیا جائے گا۔

انسان نے تاریخ کے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ وہ قبیلائی نظام سے غلام داری اور جاگیرداری اور سرمایہ داری سے گزر کر سوشلزم تک پہنچ گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس عہد میں سرمایہ داری خود غیر ضروری ہو گئی ہے۔

میں تاریخ کو اسی نکتہ نگاہ سے دیکھتا ہوں اور آج کے اصولوں سے ماضی کو نہیں پرکھتا۔ ہر سماج کے اپنے اصول اور ارتقا کے قوانین تھے اور اس سماج کو انہی قوانین کی روشنی میں سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔ تاریخ میں اچھا اور برا جانچنے کے لئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا وہ تاریخی طور پر لازمی ہے یا نہیں۔ اگر اس کا وقوع پذیر ہونا اور باقی رہنا تاریخ کی ضرورت ہے تو وہ اچھا ہے۔ اگر تاریخ کے

لحاظ سے وہ غیر ضروری ہو گیا ہے تو موت اس کا مقدر ہے اور وہ ناپید ہو جائے گا۔ ہر سماج میں اچھی قدریں ہوتی ہیں اور جب وہ سماج اگلے سماج میں ڈھل جاتا ہے تو وہ قدریں اپنی افادیت کھو دیتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی افادیت کھو دیتی ہیں تو ان سے کون چمٹا رہے گا۔

قبیلائی دور میں اچھی اقدار تھیں۔ لیکن یہ دور تو بہت پیچھے رہ گیا۔ اب تو سوشلزم کا دور ہے۔ سوشلزم کے اپنے قوانینِ حرکت اور اپنی اقدار ہیں۔

میرا اپنا اصول ہے کہ ماضی کی طرف مت دیکھو۔ جو گذر گیا اس پر تاسف نہ کرو۔ مستقبل کی طرف مردانہ وار بڑھو کہ آپ کو اس کا علم ہے اور شعور ہے۔

آپ مری ہیں اس لئے ضدی ہیں۔ میں انقلابی ہوں اس لئے باشعور ضدی ہوں۔ یعنی میں متعصب نہیں ہوں البتہ مستقل مزاج ہوں۔

آپ کو اپنے بیٹے پر ناز ہے مجھے سب بیٹوں پر ناز ہے۔ آج کے بچے کل کے سوشلسٹ نظام کے وارث ہوں گے۔ وہ نہ ضدی ہوں گے نہ متعصب۔ البتہ وہ باشعور بچے ہوں گے اور ارتقا کے قوانین پر ان کی گرفت ہو گی اور وہ ہماری اس غلیظ دنیا کو حسین دنیا بنا دیں گے اپنی تخلیقی محنت سے

۔

جب کبھی فرصت ہو تو لاہور ضرور آیئے۔ اگلا مہینہ روزوں کا ہے پھر عید ہو گی اور اس کے بعد آنے جانے کا سوچا جائے گا۔۔

بچے کو پیار۔ آپ کی بیگم کو دعا و پیار۔ اور آپ کو سلام۔

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

30-11-82

محترمی شاہ محمد مری صاحب

اسلام علیکم

آپ کا ٹیلی فون آیا تو آپ سے باتیں کر کے بہت خوشی ہوئی۔کل کوئٹہ سے ہمارے دوست افضل آئے انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔ان سے معلوم ہوا کہ اکبر ناراض ہو کر چپ بیٹھ گیا ہے اور اسے چند شکایات ہیں۔آپ کوئٹہ جائیں اکبر سے ملیں اور بڑے تحمل سے اس کی شکایات سنیں اور پھر انہیں دور کر کے اسے سرگرم عمل کریں۔یہ بہت ضروری ہے۔یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔دیدہ وری تو اکتسابی شے ہے اور اکتساب عمل و دانش خاصا مشکل کام ہے اور کسی اہل دانش و علم کا ناراض ہونا اور چپ سادھ لینا اچھی بات نہیں ہے۔آپ کوئٹہ سے کراچی کی مزدور میٹنگ میں تین چار مزدور ورکروں کو تیار کر کے شامل ہونے کا کہیں۔تا کہ سب صوبوں کی نمائندگی ہو جائے۔

آپ کے کوئٹہ میں بولان ٹیکسٹائل مل نے کام شروع کر دیا ہے۔چار ہزار کے قریب مزدور اس میں کام کرتے ہیں۔احباب کی ڈیوٹی لگائیں کہ وہ اس کی یونین میں کام کریں اور یونین کو پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن میں شامل کر دیں۔اس وقت یہ یونین بلوچستان لیبر فیڈریشن کے ساتھ ہے۔بلکہ کوشش کریں کہ اس فیڈریشن کے سب لوگ ہمارے ساتھ آ جائیں۔بولان ٹیکسٹائل مل کی یونین کا صدر خالق بلوچ ہے اس سے Contact کریں۔ایک یونین خضدار میں ہے اس کو بھی پکڑیں۔کوئٹہ میونسپل ورکرز کی یونین بنوا کر فیڈریشن میں شامل کرائیں اور ان میں سے ایک دو ورکروں کو کراچی کی میٹنگ میں جو 28,29 دسمبر کو کراچی میں ہو رہی ہے' شامل کرائیں۔

آپ سے ملاقات کراچی میں ہو گی۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

18-12-82

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ کا خط ملا۔بہت بہت شکریہ۔اب آپ سے کراچی میں ملاقات ہو گی تو تمام باتوں پر سیر حاصل بحث ہو گی۔

آپ نے کاڈویل کی کتاب Illusion & reality کا ترجمہ کر لیا ہے۔(لیکن وہ دراصل کرسٹوفر کاڈویل کی کتاب studies in a dying culture کا ایک باب Liberty تھا جس کا ترجمہ میں نے کیا تھا)۔آپ کی محنت اچھا پھل دے۔میری گذارش صرف اتنی ہے کہ آپ کارل مارکس، اینگلز اور لینن کے افکار ادب کے بارے میں ضرور پڑھیں اور پلیخانوف کی کتاب بھی دیکھ ڈالیں۔یہ دونوں کتابیں انگریزی میں دستیاب ہیں۔اگر آپ کے پاس نہیں ہیں تو میں کراچی میں آپ کو لے دوں گا۔یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ یہ بزرگ ادب کے بارے میں سائنٹفک نظریہ رکھتے ہیں اور ان کا علم اور ان کا فکر بہت قیمتی ہے۔(دراصل وہ کاڈویل سے کچھ زیادہ متاثر نہ تھا۔وہ میری حوصلہ شکنی تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر گھما پھرا کر مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے مارکس اور اینگلز پڑھنا چاہیے)۔آپ کی توجہ سے بلوچستان میں ترقی پسند نظریات جڑ پکڑ رہے ہیں۔آپ نے عبدالرحیم خان اور ان کے شاگردوں کے بارے میں بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔ان سے بحث مباحثہ جاری رکھنا ضروری ہے۔

احباب کو سلام

سی آر اسلم

******

21-2-83

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

اسلام علیکم

آپ کے خط مل گئے تھے لیکن ان میں ایڈریس نہیں تھا اس لئے جواب نہ دے سکا۔اب آپ نے ایڈریس تحریر کیا ہے اس لئے جواب حاضر ہے۔امید ہے یہ خط آپ کو ضرور مل جائے گا۔

آپ ٹوئن بی کی کتابیں ضرور پڑھیے۔ اس مطالعہ کے بعد آپ ایچ جی ویلز کی ''تاریخ عالم'' پڑھیے۔ اور اسے مارکسی نکتہ نگاہ سے دیکھئے۔

یہ سال کارل مارکس کی صد سالہ برسی کا سال ہے۔ آپ کارل مارکس اور اینگلز کی کتابیں پڑھئے یہ سمجھ کر کہ اس سال ان دونوں مفکروں کی ساری کتابیں پڑھنی ہیں۔ آپ کراچی میں انیس صاحب کو خط تحریر کریں کہ وہ ان دو بزرگوں کی کتابیں ایوان دوستی سے لے کر آپ کو ارسال کر دیں۔ لینن کی کتابوں کا انتخاب تین جلدوں میں ملتا ہے وہ بھی حاصل کر لیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ آپ دانشور ہیں اور دانشور کے لئے ضروری ہے کہ ان مفکروں کے نظریات کو پڑھے اور ان کی روشنی میں دنیا کے معاملات کو دیکھے۔

بلوچستان کے بارے میں میری یہ گزارش ہے کہ آپ بلوچستان کی تاریخ پر کتابیں پڑھیں لیکن یہ کتابیں گل خان نصیر کی اور خدا بخش مری کی کتابیں نہ ہوں کہ یہ دونوں کتابیں بہت کم مایہ ہیں۔ ان کی کتابوں سے بہتر کتابیں ضرور دستیاب ہوں گی۔ لائبریری سے حاصل کر کے ان کا مطالعہ کریں۔

بلوچستان کی معیشت کا مطالعہ کریں۔ بلوچستان میں سرمایہ داری کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ کریں اور بلوچ عوام کے کلچر کا مطالعہ کریں اور پھر ہم سب کی رہنمائی فرمائیں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ میں بلوچستان کا مطالعہ کروں لیکن لٹریچر نہیں مل سکا۔ اگر دستیاب ہو جاتا تو میں ضرور آپ کی مدد کرتا۔

میرا ارادہ ہے کہ میں مارچ میں کوئٹہ جاؤں لیکن یہ تبھی فائدہ مند ہوگا کہ آپ بھی وہاں موجود ہوں۔ آپ کا خط آئے گا اور آپ جب کوئٹہ آسکیں گے تو میں آؤں گا۔ اس وقت ہم دونوں مل کر بلوچستان کی تاریخ، معیشت اور کلچر پر کتابیں تلاش کریں گے اور ان کا مطالعہ کریں گے۔

آپ سے میری بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ میں آپ جیسے اہلِ دانش اور اہلِ علم نوجوانوں کو اپنا وارث دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے گزشتہ 40 برسوں میں نوجوانوں کو باشعور بنانے کی کوشش کی ہے اور برابر مارکسزم کی روشنی ان تک پہنچانے کی سعی کی ہے اور اب بھی برابر یہ کام کر

رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ یہ کام کر رہا ہوں کہ آپ جیسے نوجوان میرے بعد اس کام کو سنبھالیں اور جاری رکھیں۔

مخلص

سی آر اسلم

******

12-3-83

ڈیئر ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ کا چار مارچ کا خط ملا۔ شکریہ۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں خط نہ لکھوں اور آپ کے آنے کا انتظار کروں۔ پھر سوچا کہ نہ معلوم آپ کب آئیں گے اس لیے جواب دینا ہی مناسب رہے گا۔ سو جواب حاضر ہے۔

آپ آئیں گے تو میں آپ کے ساتھ کتابوں کی دکانوں پر جاؤں گا اور ہم دونوں ہم مشورہ ہو کر کتابیں خریدیں گے۔

میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ لاطینی امریکہ کے ملکوں کے ادیبوں نے بڑا بلند ادب پیدا کیا ہے۔ اور ان کی کتابیں یہاں دستیاب نہیں ہیں۔ چند روز ہوئے ایک بک شاپ پر میں نے چند کتابیں دیکھیں۔ جیب خالی تھی اس لئے خرید نہ سکا۔ اگر آپ کے آنے تک وہ بک نہ گئیں تو آپ خرید لینا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ایسی کتابوں کے خریدار ہمارے جیسے پاگل ہی ہیں اس لئے بکیں گی نہیں۔

میں نے لکھا تھا کہ یہ سال مارکس کی صد سالہ تقریب کا سال ہے۔ اس لئے ہم سب کو اس کی سب کتابیں پڑھ ڈالنی چاہئیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ جون میں ان کتابوں کی پڑھائی شروع کریں گے۔ آپ اگلے تین ماہ تک کیا کریں گے۔ ابھی سے انہیں پڑھنا شروع کر دیجئے۔

جب میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ بلوچستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو میرا

مقصد بلوچستان کی معاشی تاریخ سے زیادہ تھا۔ بلوچستان دنیا سے الگ تھلگ نہیں۔اس کے ذرائع پیداوار ترقی کی کس سطح پر ہیں؟ آلات پیداوار کیا کیا ہیں؟ پیداواری رشتے کیا ہیں؟۔ کیونکہ ان کو جانے بغیر نہ تو بلوچستان کے طبقات اوران کے باہمی رشتے سمجھ میں آئیں گے اور نہ طریق پیداوار کو جانے بغیر لوگوں کی عادات، خصلتیں اور روایات سمجھ میں آئیں گی اور نہ ان کا کلچر سمجھ میں آئے گا ۔اس لئے اگر آپ اسے جاننے کی سعی کر رہے ہیں تو میں آپ سے جان لوں گا۔ ورنہ مجھے تو کتابیں پڑھنا پڑیں گی۔ کتابوں کا علم سیکنڈ ہینڈ سہی لیکن لاعلمی سے تو ان کا پڑھنا میرے لئے مفید رہے گا۔

یہ کہہ کر کہ میں میر بزنجو سے ملوں گا صرف آپ کی تسلی نہیں کی تھی۔ میں تو انہیں آپ کے ساتھ ان کے گاؤں نال جا کر بھی ملنے کو تیار ہوں۔صرف ملنے کے لئے ہی نہیں بلکہ ان سے سیکھنے اور ان سے بحث کرنے کے لئے بھی تا کہ اگر کوئی اختلاف سیاسی یا نظریاتی ہو تو اسے دور کر لیا جائے۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

16-2-84

محترمی ڈاکٹر مری صاحب

مجھے آپ کی 20 مارچ کی لاہور میں ضرورت ہے۔آپ ایک ہفتے کی رخصت لے کر آئیں یہ ضروری ہے اس میں کوتاہی نا قابل معافی ہوگی ۔شاید یہ اس شخص کے بے شمار خطوط میں پہلا خط ہوگا جس میں یہ لہجہ موجود تھا) میں نے آپ کو خط تحریر کیا تھا کہ آپ اس فروری میں بھی چند روز کے لئے آئیں لیکن آپ نہیں آئے۔

آپ آج کل مستقل سفر پر ہیں، خط کس پتے پر تحریر کروں۔اگر آپ کو یہ خط مل جائے تو آپ اپنا کوئی مستقل ایڈریس ڈاک کے لئے تحریر کر دیں۔

احباب کو سلام

آپ کا

سی آر اسلم

******

1984 کے ''عوامی جمہوریت'' کے تین پرچوں میں شائع شدہ مضامین جن کا تعلق افغانستان، امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور مذہبی اقلیتوں کے مسائل سے تھا، پر اعتراض کیا گیا۔حکومت نے اخبار کے ایڈیٹر اور پبلشر کو زرضمانت جمع کروانے کا حکم دیا۔''عوامی جمہوریت'' کے کئی دوسرے پرچوں کو ضبط کرنے کے احکامات جاری ہوتے رہے مگر سی آر اسلم کی پارٹی کا یہ اخبار انہی کی کاوشوں سے مسلسل شائع ہوتا رہا۔اس اخبار کے ذریعے ترقی پسند سیاسی کارکنوں کی تربیت بھی ہوتی رہی اور باہمی رابطہ بھی قائم رہا۔ پارٹی اخبار کی اہمیت کا احساس سی آر اسلم سے بڑھ کر کسی اور کو نہ تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے چندہ جمع کرتا اور ہر ہفتہ رسالہ آٹھ بڑے صفحات میں شائع کراتا۔اُس کے نوے فیصد مضامین وہ خود لکھتا تھا۔موضوعات چننا، لمبے لمبے مضامین لکھنا، فکری سوالات کے پرمغز اور مدلل جوابات دینا، نظریاتی کنفیوژن دور کرنا۔ پھر وہ خود ہی اس کی پروف ریڈنگ کرتا۔ پتے لکھتا اور ملک کے کونے کونے میں پھیلے پارٹی ممبران، ہمدردوں، لائبریریوں، سیاسی زعما کو بھیجتا۔اخبار میں جب تک سید مطلبی فرید آبادی زندہ تھا اس کی مدد کرتا۔اُس کے بعد تو سمجھو سارا کام اُسے خود کرنا پڑتا۔

****

رفیقِ حیات، سنگت سعیدہ اسلم

اسی زمانے میں سی آر اسلم کی شخصیت کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے آیا۔ اس کی بیگم محترمہ سعیدہ اس کی محبت کا مرکز تھی۔ زمانے کی تکالیف سے نڈھال مگر بہت باہمت خاتون تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ اس کی بیگم کو جب کینسر کا مرض ہو گیا تھا تو وہ کس کس طرح اس کی خدمت کیا کرتا تھا۔

1950 میں اس نے سعیدہ سے شادی کر لی تھی۔ اس کی بیگم ایک زبردست خاتون تھی۔ مہربان۔ سی آر اسلم کے ملنے والوں سے شفقت سے پیش آتیں۔ اُس کے ہاں جڑواں بیٹوں کی پیدائش ہوئی جن میں سے ایک کو قیس اور دوسرے کو سفیان کا نام دیا گیا۔ قیس نے اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کی اور صفیان نے نیوکلیئر فزکس میں۔ دونوں بیٹوں کی پیدائش کے فوراً بعد سی آر اسلم ایک بار پھر عوامی حقوق کی لڑائی میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔

وہ خاتون بھی کیا خاتون تھیں۔ اتنے بڑے مرتبے کے انسان کی رفیقِ حیات کو بھی اتنا ہی عظیم انسان ہونا تھا۔ میں جب چاہتا اسے بھابھی کہتا اور جب چاہتا آنٹی۔ وہ گریس فل خاتون ماں کا پیار دیتی تھیں۔ مضبوط دل اور جفاکش بدن کی مالک سعیدہ آنٹی نے تیس برس تک انقلاب کے اس جوگی کو رفاقت بخشی۔۔۔۔۔ اور یہ رفاقت محض ازدواجی نہ تھی، بہت دوررس اور وسیع تھی۔ سی آر اسلم کی تمام قید و بند اور سفر و حضر کی غیر حاضریوں میں گھر کا سارا بوجھ اٹھائے رکھنا کوئی معمولی بات

نہیں ہے۔ وہ خود سیاسی ذہن رکھتی تھیں۔ وہ سوشلسٹ پارٹی کی وومن ونگ میں تھیں۔ ان کی ترجمہ کردہ دو کتابیں تو مجھے یاد ہیں: لینن کے حالات زندگی اور ''نئی زندگی''۔ سعیدہ ڈیموکریٹک ویمن ایسوسی ایشن کی عہدیدار تھیں۔۔۔۔ مگر ان سب اوصاف کے باوجود وہ ایک بیوی تھیں۔ اپنے میاں کو ٹوٹ کر چاہنے والی بیوی۔ میں اور میاں محمود اُس بڑھاپے میں انہیں بہت تنگ کرتے تھے اور سی آر اسلم کے خلاف بڑی رازدارانہ قسم کی باتیں گھڑ کر انہیں سنا لیا کرتے تھے اور پھر جب سی آر گھر آتے تو آنٹی ان سے جس مجسم بیوی کی طرح لڑتی تھیں ہم اس کا نظارہ دیکھتے۔ یہی سعیدہ جب اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہ رہیں تو بڑا سی آر اسلم نرس بن کر ان کی خدمت کرنے لگا۔ اتنی بڑائی میں نے پھر کسی میں نہ دیکھی۔ سی آر اسلم کے اگلے ایک آدھ خط میں کامریڈ سعیدہ اسلم کی بیماری کی طرف اشارہ ہے۔ انہیں چوبیس گھنٹے گھر میں رہنا پڑتا تھا اور اپنی محبوبہ بیگم کو دوائی اور کھانا کھلانے سے لے کر ان کی صفائی تک کا سارا کام کرنا پڑتا تھا۔ سعیدہ آنٹی اسی کینسر کی بیماری سے لڑتے لڑتے فوت ہو گئیں۔

اس باشرف کمیونسٹ خاتون کے جڑواں بیٹے سفیان اور قیس دونوں اولاد والے ہیں اور پیشے میں استاد۔ اُس کی بہوئیں ہم سے بھائیوں جیسا پیار کرتی تھیں۔ سفیان کی بیگم کو اللہ سلامت رکھے حیات ہیں۔ مگر قیس کی بیگم (ہماری پیاری دوست اور بہن کسینڈرا) عرصہ ہوا انتقال کر گئیں۔

سی آر اسلم سفیان کے بیٹے سرمد کو بہت چاہتا تھا اور اس نے پوتے کو خوب محبت سے بڑا کیا۔

مزید مکتوبات

24-9-84

ڈیئر ڈاکٹر مری

تسلیمات

آپ کا خط ملا۔شکریہ۔مکتوب بلوچستان اب تک نہیں ملا۔ان دوستوں کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔جونہی اطلاع ملے گی آپ کو پہنچادوں گا۔

آپ 18 اکتوبر کو صبح لاہور تشریف لائیں اور دو تین روز یہاں رہیں۔تاکید ہے۔آنے کی اطلاع بھی دیں۔اس کی تاکید مزید ہے۔اس وقت دل کی باتیں ہوں گی۔

میری بیوی کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا ہے۔کمزوری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ موجودہ صورت میں میرا لاہور سے باہر نکلنا بے حد مشکل ہے ورنہ میں آپ کی خدمت میں ضرور آؤں گا۔اب تو آپ کو ہی آنا پڑے گا۔سب کو سلام

سی آر اسلم

******

1984 میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر نے اپنے لیے اعتماد کا ریفرنڈم کرایا جس میں 8 سے دس فیصد سے زیادہ ووٹ نہ ڈالے گئے۔اسی ریفرنڈم کے بارے میں تو سی آر اسلم کے ساتھی جالب نے کہا تھا:

جن ہے یا ریفرنڈم ہے

******

اگلا خط ایک دلچسپ واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔لاہور میں ہمارے ایک فنکشن پر ضیاء الحق سرکار کے کہنے پر جماعت اسلامی والوں نے حملہ کر دیا تھا۔ہم لوگوں نے اپنا دفاع کیا اور انہیں مار بھگایا۔اس لڑائی کے دوران میں زخمی ہو گیا اور میری گھڑی بھی وہیں ''میدانِ جنگ'' میں گر گئی۔سی آر اسلم نے میرے علاج معالجے اور عیادت پہ خصوصی توجہ دی۔میں پھر بلوچستان چلا آیا۔سی آر بدستور میری احوال پرسی کے خطوط لکھتا رہا۔میری گمشدہ گھڑی ملی تو اس نے ریلوے مزدوروں کے لیڈر صدیق شاہوانی کے ہاتھ بھجوادی (مگر شہوانی نے یہ کہہ کر میری گھڑی رکھ لی کہ یہ تمھاری لڑائی کی نشانی ہے میں رکھ لوں گا)۔

******

26-2-85

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری

آداب

آپ لاہور سے ایسے گئے کہ نہ خط بھیجا نہ پیغام بھیجا۔میں نے آپ کی خیر خیریت کی خبر لینے کے لئے خط لکھا' اس کا بھی جواب نہیں آیا۔آپ کی گھڑی مل گئی تھی اس کی بازیابی کی اطلاع دی تھی۔آپ نے اس پر بھی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس خط کا جواب ضرور دیں۔اور احباب کا حال چال بھی دیں۔

آپ اپنے خط میں بلوچستان کے قومی اسمبلی میں چنے جانے والے اصحاب کا طبقاتی اور سیاسی تجزیہ بتائیں اور یہ بھی تحریر کریں کہ قومی اسمبلی کے الیکشنوں میں عوام نے کتنا حصہ لیا۔تاکہ ہم

اسے اپنے اخبار میں بطور ''مکتوبِ بلوچستان'' شائع کرسکیں۔

نیز آپ بتائیے کہ آپ کے صوبائی امیدواروں کا کیا حال ہے۔آپ کے دو تین امیدوار کامیاب ہو جائیں گے یا نہیں؟۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

مکرر۔آپ نے جو زخم کھائے تھے وہ مندمل ہوئے ہیں یا نہیں؟۔آپ کے بچوں کو پیار اور آپ کی بیگم کو آداب۔

سی آر اسلم

******

17-3-85

محترمی شاہ محمد مری

اسلام علیکم

آپ کا دستی خط ملا ہے۔شکریہ۔میں 23 مارچ کو اسلام آباد جاؤں گا اور اس کے بعد آپ کو آپ کے کام سے مطلع کرسکوں گا۔

PPH (پیپلز پبلشنگ ہاؤس) والوں سے پلیخانوف کی پہلی دو جلدوں کی وی پی کرادوں گا۔میرے پاؤں کا نمبر 9 ہے۔چپل کبھی کوئٹہ آکر لے لوں گا آپ کے ذمہ داری رہی میری چپل۔

9 مئی کو فاشزم کے خلاف فتح کی چالیسویں سالگرہ ہے۔اور ساری دنیا میں منائی جا رہی ہے اگر آپ منا سکیں تو خوب رہے گا۔

27 اپریل کو جو کچھ بھی چھاپیں اور جو پروگرام بھی بنائیں وہ کراچی بھجوادیں۔یومِ مئی کے اشتہار اور پوسٹر ہم بھجوادیں گے۔

میرا ارادہ ہے کہ ہم مئی کے وسط میں آپ کو زحمت دیں کہ میٹنگ میں شریک ہوں۔اسی ماہ میں ہم پارٹی کانفرنس بھی کرلیں گے۔آپ بھی اپنا مشورہ دے دیں۔

احباب کو سلام

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

گھڑی جس دوست کے پاس تھی وہ جیل میں ہے۔ایک دو روز میں باہر آنے کی توقع ہے۔میں ان کی رہائی پر گھڑی اُس سے لے کر اپنے پاس رکھوں گا۔

******

17-3-85

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری

تسلیمات

امید ہے کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے ہوں گے۔آپ کی گھڑی مل گئی ہے اور وہ اس وقت تک ہمارے پاس امانت رہے گی۔جب تک اس کے بھیجنے کا انتظام نہیں ہوتا یعنی یا تو کوئی کوئٹہ نہیں آتا یا یہاں سے کوئٹہ نہیں جاتا۔

آپ کی ضربات کا کیا حال ہے؟۔چوٹیں سہنا ہر نوجوان کا کام ہے۔امید ہے ان کا درد ختم ہوگیا ہوگا البتہ کسک کچھ دیر رہے گی۔

آپ میری درخواست کے باوجود روانگی سے پہلے ملنے نہ آئے۔اس لئے مجھے جو کچھ باتیں کرنا تھیں ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں۔جو کام تحریر کر رہا ہوں ان کا آغاز 85-3-25 کے بعد شروع کریں۔یہ سارے کام ثورانقلاب کے سلسلے میں ہیں۔

طلباء، مزدوروں، دانشوروں، اور شہریوں کی میٹنگیں الگ الگ ہر کالج ہر فیکٹری ہر شہر اور ہر قصبے میں۔ان میں براہ راست مذاکرات اور حکومت کو تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کریں۔امریکہ

کی مذمت، اس کے اقدامات کی مخالفت اور اس کی عالمی حکمتِ عملی کا آلہ کار بننے سے انکار پر زور دیں۔

ان قراردادوں ہی کی طرح چھوٹے ہینڈ بل بھی تقسیم کریں۔

اس قسم کے بیان پر تمام لیڈروں کے دستخط کرائیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں سے دستخط کرائیں، وکلاء سے دستخط کرائیں اور ان کی باروں سے قراردادیں پاس کرائیں۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں سے کہیں کہ وہ اسمبلیوں میں اس قسم کی قراردادیں پیش کریں۔

دوسرا کام سیاسی نظر بندوں اور قیدیوں کی رہائی کے لئے بیانات، قراردادیں اور اپیلیں جاری کرائیں۔ یہ کام بھی 25 مارچ کے بعد کریں۔

یہ دو کام کرتے وقت سی پی اور پی این پی وغیرہ جو بھی ساتھ دیں ان کی مشترکہ کمیٹیاں بنوا کر کریں۔

8 مارچ کو خواتین کا عالمی دن ہے۔ کوئٹہ، سبی اور دوسرے شہروں میں خواتین کا دن منائیں۔ حقوق اور برابری کے مطالبات کئے جائیں۔

22 اپریل کو کوئٹہ میں یومِ لینن دانشوروں اور مزدوروں کی طرف سے منائیں ایک سیمینار کی صورت میں۔

یہ کام سیاسی بھی ہیں، نظریاتی بھی ہیں اور تنظیمی بھی۔ اور رفقاء کو عمل میں ڈالنے کے بھی۔

مارشل لاء کے اٹھنے کے بعد کوئٹہ، سبی اور سکھر میں ریلوے مزدوروں کے تین جلسے کریں۔ سکھر سے شروع کر کے اگلے روز سبی اور اس کے اگلے روز کوئٹہ۔ ہم بھی آئیں گے ان تینوں میں شریک ہوں گے۔ 8 مارچ سے 28 اپریل تک کاموں کے بعد مزید پروگرام وضع کیا جائے گا۔

احباب کو سلام

سی آر اسلم

تیسری سوشلسٹ کانفرنس

28 مارچ 1986 میں ملک بھر سے پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے مندوبین پر مشتمل سوشلسٹ کانفرنس منعقد ہوئی۔ سی آر اسلم روح رواں تھا۔ چونکہ ایک مارکسی سیاسی پارٹی کی کانگریس میں پیش اور منظور کردہ سیاسی رپورٹ اُس سیاسی پارٹی کا ''سب کچھ'' ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ سی آر اسلم کی پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی 1986 کی سیاسی رپورٹ بطور ضمیمہ اس کتاب کے آخر میں شامل کیا جائے۔ یہاں ہم اس کا وہ اہم حصہ نقل کرتے ہیں جس کا بالخصوص سامنا بلوچستان میں سیاسی ورکروں کو ہوتا ہے، یعنی قومی مسئلہ:

''پاکستان کئی قوموں کا ملک ہے۔ ہر قومیت کی اپنی تہذیب و تمدن زبان و ثقافت ہے۔ یہ قومیتیں ملک کے مختلف حصوں میں بستی ہیں۔ پنجاب میں بسنے والے اپنی آبادی کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی قومیت ہیں۔ اپنی آبادی اور زرخیز اراضی کے باعث پنجاب کو دوسری قومیتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ پاکستان کی فوج اور نوکر شاہی میں بھی پنجاب کو برتری حاصل ہے۔ نیم سرمایہ دارانہ اور جاگیرداری طرزِ معیشت کی بدولت تمام علاقوں اور قومیتوں کی برابر ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بلوچستان اور اندرون سندھ کے بعض علاقے تو انتہائی پچھڑے ہوئے اور پسماندہ ہیں۔ ان علاقوں میں نوآبادز رعی اراضی کا بڑا حصہ ان بڑے سرکاری افسروں اور فوجی جرنیلوں کو

حاصل ہوا ہے جو نہ تو وہاں کے رہنے والے ہیں اور نہ ہی خود کاشت کرتے ہیں۔ بلوچستان سے گیس حاصل ہوتی ہے مگر اس گیس کا مفاد زیادہ تر بلوچستان سے باہر کے علاقوں نے اٹھایا ہے۔ یوں تو پاکستان بھر میں صنعتی ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم جس قدر صنعتی ادارے قائم ہوئے ہیں وہ زیادہ تر پہلے سے ترقی یافتہ علاقوں یعنی پنجاب اور کراچی وغیرہ میں قائم ہوئے ہیں۔ اس معاشی اور سماجی صورتِ حاصل پر جو سیاسی ڈھانچہ استوار ہوا ہے اس میں بھی بالادستی نسبتاً ترقی یافتہ قومیتوں ہی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ ہمارے ملک کا ایک اہم مسئلہ قومیتوں کے معاشی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کا بھی ہے۔

''قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ پہلی مرتبہ اس وقت سنگین شکل اختیار کر گیا جب مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی گئی۔ مختلف علاقوں میں بسنے والی قومیتوں کے حقوق کی پامالی کا نتیجہ تھا کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ہو گیا۔ دوسری مرتبہ یہ مسئلہ اس وقت شدید صورت میں ابھرا جب 1973 میں بلوچستان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور اس طرح صوبائی خودمختاری کی وہ محدود شکل جو 1973ء کے آئین میں طے کی گئی تھی خود آئین بنانے والوں نے ختم کر دی اور اب آٹھ سالہ مارشل لاء کے تحت مرکزی متشددانہ اختیار کے استعمال کے ذریعے اور پھر آئین میں ترامیم کے ذریعے وفاق کے رہے سہے تصور کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ یہی حالات ہیں جو کنفیڈریشن اور خودمختاری کے تصورات کو ابھارنے کا باعث ہیں۔

''پاکستان سوشلسٹ پارٹی تمام قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اس کے نزدیک پاکستان میں بسنے والی ہر قومیت کو معاشی اور سیاسی سطح پر برابر کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں اور اس کے لیے آئینی اور سیاسی تحفظات کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر قومیتوں کو متحد رکھنے کا دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے بغیر ملک کے ہر حصے اور ہر قومیت کو خودمختار اور ترقی یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ فوری طور پر ضروری ہے کہ فیڈریشن کی بنیاد ایک ایسے پارلیمانی آئین پر رکھی جائے جس پر مرکز کو صرف دفاع، امور خارجہ بشمول خارجہ تجارت اور کرنسی کے اور کوئی اختیار نہ ہو۔ تاہم پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک قومیتوں کے حقوق کی جدوجہد پاکستان کے موجودہ

استحصالی جدید نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی جدوجہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جو امریکی سامراج، مقامی نوکر شاہی، جرنیل شاہی، جاگیردار، وڈیرے اور سردار اور غیر ملکی سرمائے سے وابستہ سرمایہ داروں کے مفاد ہی کی پرورش کر سکتا ہے۔ قومیتوں کا استحصال اور پس ماندگی اس نظام کا حصہ ہے۔ قومیتوں کے حقوق کا معاملہ محض آئینی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا حل جاگیرداروں اور اوپری طبقات کی قیادت میں لڑی جانے والی کسی تحریک سے ممکن ہے۔ ایسی تحریکات سامراج کے دخل میں اضافہ کرتی ہیں اور عوام کے وسیع تر اتحاد کو توڑنے کا باعث بنتی ہیں۔

''پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک سامراج اور جاگیرداری مخالف جمہوری جدوجہد کا ایک لازمی عنصر قومیتوں کے حقوق کی جدوجہد بھی ہے۔ یہ جدوجہد پورے پاکستان کے محنت کشوں اور جمہوریت پسند عوام اور سیاسی عناصر کے اشتراک ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے''۔

میری لاہور منتقلی اور سی آر اسلم سے مزید قربت

اگلے دو تین برس ہم دونوں کے بیچ خط و کتابت نہ رہی۔اس لئے کہ میں خود پوسٹ گریجوئیشن کرنے اُس کے شہر لاہور چلا گیا اور وہیں اس کے ساتھ اس کی سرپرستی میں سیاسی کام کرنے لگا۔اور سچی بات یہ ہے کہ وہ میری زندگی کے خوش قسمت سال تھے۔میں نے اس کے ساتھ بے شمار تنظیمی سیاسی دورے کیے،کسان کانفرنسوں کے ایک پورے سلسلے میں ہم اکٹھے تھے۔پارٹی اخبار میں اس کی معاونت کی۔بحثیں مباحثے کیے۔اور صبح شام اس کے ساتھ رہا۔

اس سخی نے استاد ہونے کا حق ادا کر دیا اور ہر طرح سے علمی رہنمائی کی۔لاہور میں قیام کے دوران ملک اور پارٹی جن بحرانوں سے گزرے وہ ہم نے اپنے سروں پر جھیلے۔آزاد خیالی،خود پرستی اور ''بڑا لیڈر'' ذہنیت کی طرف سے ایسے کمر توڑ اور حوصلہ شکن جھٹکے آئے کہ اگر سی آر اسلم کے ''شاک ایبزاربر'' نہ ہوتے تو بایاں دائیاں میں پٹخ دیا جاتا اور ہست معدومی میں چلی جاتی۔اگر ایک مارکسی پارٹی کو بھٹو والی پیپلز پارٹی جیسا نہ بنایا جا سکے تو سرداری ملنا ممکن نہ تھا۔چنانچہ کھڑاک ہو گیا اور پارٹی باقاعدہ توڑ دی گئی۔ایک گروپ الگ ہو گیا۔اور سخت،نرم،مقامی،انٹرنیشنل ہر طرح کی رجحان والی گھاس کی منہ ماری کو اپنا مقدر بنالیا۔سی آر اسلم سرعت کے ساتھ اور نہایت نامحسوس

طریقوں سے داؤ پیچ بدلنے کا ماہر رہا۔اس نے ایک ایسے وقت نظریے اور جماعت کی بقا میں کامیابی حاصل کی جب جھکڑ جھونپڑی کی چولیں ہلائے جاتے تھے۔سی آر اسلم انتہائی وقار اور بردباری سے اپنے متعین کام میں لگا رہا۔اُس کے فکر کی بتی جلتی رہی،اُس کے نظریے کا پرچم قائم رہا۔میاں محمود ،ملک اسلم،خواجہ رفیق،محمد علی بھارا،اسلم ریڈیو،کنیز فاطمہ اور دیگر احباب اُس کے ساتھ ساتھ رہے۔

میں تقریباً ساڑھے تین چار سال وہاں رہا اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد احباب کی محبتوں سے زیر بار بلوچستان لوٹا۔

یوں ایک بار پھر ہم خط و کتابت،ہدایت نامہ و مراسلہ کاری،اور وقتاً فوقتاً ٹیلیفون کے روابط پہ واپس آ گئے۔

میں نے بہت کوشش کی مگر میں سی آر اسلم کے مختلف یونٹوں،عہدیداروں اور ورکروں کو لکھے گئے خطوط جمع نہیں کر پایا۔اگر کوئی دوسرا دوست ہمت کرے تو کتاب کی دو تین جلدوں کا خزانہ جمع ہو سکتا ہے۔ایسے خطوط جو اِس خطے میں انقلابی تحریک کی تاریخ کو مزید امیر اور غنی بنا سکتے ہیں۔

******

28-6-89

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری

آداب

آپ کا خط ملا تو میں نے جواب فوری طور پر دے دیا تھا اور میں نے آپ کو الوداعی تقریب کے فوٹو بھی ارسال کئے تھے۔آپ نے نہ تو میرے خط کی رسید بھیجی اور نہ فوٹو پہنچنے کی اطلاع دی۔اب آپ نے جنید کو خط تحریر کیا ہے اور اس میں گلہ کیا ہے کہ میں نے آپ کے خط کا جواب نہیں دیا۔آپ کا یہ گلہ درست نہیں ہے۔یہ تو ہو سکتا ہے کہ میرا خط اور فوٹو آپ کو ملے نہ ہوں۔اگر میرا خط اور فوٹو آپ کو مل چکے ہیں تو پھر آپ کا گلہ درست نہیں ہے۔

میں بخیریت ہوں۔یہاں گرمی بہت تیز ہے۔گرم ہوائیں جسم جھلسا رہی ہیں۔بارشیں شروع ہوں گی تو میں آپ دوستوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔توقع ہے کہ جولائی کے پہلے ہفتے

میں بارشیں شروع ہوں گی۔ میں اس وقت آپ کو اپنے پروگرام سے مطلع کروں گا۔ آپ دوستوں سے ملے بہت دن ہو گئے ہیں بلکہ کئی ماہ ہو گئے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہو گی۔ دیرینہ دوستوں سے ملاقات تو مسیحا و خضر کی ملاقات سے زیادہ حسین اور خوشگوار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خدائیداد خان، ڈاکٹر معصوم اور باقی سب رفقا کو سلام پہنچا دیں۔

نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کا

سی آر اسلم

******

4-7-89

ڈیئر کامریڈ شاہ محمد مری صاحب

آداب

چند روز ہوئے ہیں میں نے آپ کو خط تحریر کیا تھا۔ چونکہ اس پر تحریر ایڈریس کچھ زیادہ صحیح نہیں تھا۔ اس لئے یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ کو نادرست پتے پر لکھا ہوا خط بھی پوسٹ مین کی یادداشت اور ذہانت کی وجہ سے مل گیا ہوگا۔

آپ یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے اتنے دور کیوں ہیں کہ ''رقیب'' اسلم اعوان کے خط میں ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی برسبیلِ تذکرہ۔ ہم نے تو آپ سے رشتہِ چاہت نہیں توڑا، آپ نے رشتہِ محبت کیوں منقطع کر لیا ہے۔ آپ ہی سے سنا تھا کہ بلوچوں کی وفاداری پر کبھی شک نہ کرنا۔ اور اب خود ہی اپنے عمل سے اپنے قول کو جھٹلا رہے ہو۔

خط لکھنے کا مطلب گلہ گزاری نہ تھا یہ تو یونہی ذکر کر دیا ہے۔ خط لکھنے کا مطلب تو تجدید دوستی ہے اور دوستی کا نئے سرے سے آغاز کرنا ہے۔ اگر تیس برس پرانے دشمن (چین اور روس) دوست بن سکتے ہیں اور بنیاد پرست رفسنجانی انقلابی روس سے دوستی کی شمع جلا سکتے ہیں تو آپ اور میں ایسے تو کبھی نہ تھے کہ تجدید دوستی کی ضرورت پڑے۔ بہر کیف ہم نے دوستی کی راہ پر ساتھ نبھانے کا عہد کر رکھا ہے اُسے نبھائیں گے۔

آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ احباب کو سلام۔ طارق کو پیار۔ آپ کی بیگم کے سر پر دستِ شفقت۔

سی آر اسلم

******

(اب جب سی آر اسلم کو بچھڑے درجن بھر سال بیت گئے۔ اور میں نے اس کا یہ خط دوبارہ پڑھا تو جذبات میں اُسے بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر دوستی دائرہِ تحریر سے باہر چھلک جائے گی۔ اس لیے بس یہ کہنا کافی ہے کہ اے میرے مرحوم دوست۔ تمہارے یہی دو تین پیراگراف تو میری زندگی کا حاصل ہیں۔ باقی تو بس دنیاداری کے ماہ و سال ہیں)۔

******

1-11-89

محترمی ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

تسلیمات

آپ کا خط ملا۔ شکریہ۔ جواب حاضر ہے۔ کامریڈ کرم الٰہی کی وفات پر آپ کی تعزیت اس کے بیٹے شفیق تک پہنچا دوں گا۔

خدا مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا

آپ کے سیاسی خیالات سے مجھے اتفاق ہے۔ میرے نزدیک طبقاتی جدوجہد ہی سماج کی تبدیلی اور ترقی کا باعث ہے۔ اس طبقاتی جدوجہد کی تین صورتیں ہیں۔

اول: نظریاتی کش مکش جس میں پرانے تصورات، نظریات اور خیالات کے خلاف نئے تصورات نظریات اور خیالات کی کش مکش۔ یاد رہے کہ اس عہد میں نئے ترقی پسند اور جدید تصورات نظریات اور خیالات مزدور طبقے کے ہیں، کسی اور سماجی طبقے کے نہیں ہیں۔

دوم: سیاسی کش مکش۔ اس کش مکش میں بھی راہ نمائی کا رول مزدور طبقے کا ہے۔ اس کش مکش میں عوام کی سماج میں بنیادی حیثیت اجاگر کرنا ہے۔ عوام کو اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اور طاقت کا سر

چشمہ سمجھنا اور عوام کو اس کا شعور دینا اور ان میں اپنی طاقت کا احساس پیدا کرنا۔

سوم: معاشی کش مکش یعنی مزدور کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے مزدور طبقے کی سرمایہ دار جاگیر دار اور سرداری سسٹم کے معاشی حقوق کے لئے جدوجہد کے لئے ان کی طبقاتی تنظیمیں بنانا۔

یہ کام بیک وقت کرنے ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ تینوں میں سے زور کس پر دیا جائے اور کس وقت کس کام کو اولیت دی جائے۔

ظاہر ہے کہ نظریاتی کش مکش پر زیادہ اور ہمہ وقت زور ہوگا کہ ملّا کے تصورات' نظریات اور خیالات مزدوروں اور محنت کش عوام کے ذہنوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں ان کی گمراہی کو شعور کی روشنی سے ہر وقت دور کرنے کی سعی کرنا ہوگی۔

آپ نعروں سے عوام میں شعور نہیں پھیلا سکتے۔ مردہ باد زندہ باد تو بہت نچلی سطح کے نعرے ہیں۔ آج عوام میں شعور کی روشنی پہلے سے زیادہ ہے اس لئے وہ اسباب اور نتائج جاننا چاہتے ہیں اور انہیں سماج کے تضادات کا علم' اسباب اور نتائج کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

طارق کو پیار۔ بیگم کو سلام اور اس کے سر پر دستِ شفقت۔

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

****

بے بخت کی نکسیر، کھانے کے وقت پھوٹتی ہے

روس میں لینن کی قیادت میں برپا کردہ عوامی انقلاب نے 75 برسوں کے ارتقاء میں کروڑوں انسانوں کے سروں کی قربانی کی بدولت عالم انسانیت کو معراج کے بلند زینوں تک پہنچا دیا تھا۔ دنیا کے تمام ممالک آزاد ہو چکے تھے، دنیا کی نصف آبادی کے قریب لوگ سوشلزم جیسے اچھے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔۔۔۔۔

1980 کی دہائی میں میخائل گورباچوف پارٹی کا سربراہ بنا تو اس نے ملکی اور بین الاقوامی گھمبیر صورت حال کو یکسر تبدیل کرنے کی تجاویز پیش کیں۔ ایک تو پائیدار عالمی امن کے قیام اور ایٹمی اسلحہ کے خاتمے اور مکمل ترک اسلحہ کے عالمی معاہدے سے متعلق تھی۔ دوسری یورپ کو مشترکہ گھر بنانے کے بارے میں تھی۔ تیسری بات تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان کشیدگی دور کرنے اور ان کے درمیان دوستانہ تعلقات بڑھانے کی تھی۔ پھر روس چین تعلقات بہتر بنانے کا فریضہ تھا۔

گورباچوف نے ملک کے اندر سماج کی تشکیلِ نو اور کھلی تنقید کو رواج دیا۔ پارٹی تنظیم میں سے بیوروکریٹک رویے، غیر جمہوری اطوار اور اوپر سے حکم چلانے کی عادات کا قلع قمع کرنے کی بات کی تاکہ پارٹی میں پیدا شدہ جمود کو ختم کر کے نیا جوش، حرکت اور تیز رفتاری پیدا کی جائے۔(18)

پتہ نہیں کہ ان تمام اچھی خوبصورت خواہشات کے پیچھے کوئی بد نیتی تھی، یا ان کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی غلطی ہوئی یا پھر پہلے سے خرابی اتنی بڑھ چکی تھی کہ اصلاحات پر عمل نے بوسیدہ فریم ہی توڑ ڈالی۔۔۔۔

روس کو بدہضمی ہوگئی۔اس نے سوشلزم والی گندم کی روٹی سے الرجی محسوس کی۔اور بھوک بھیک والی سرمایہ داری کی طرف لوٹ گیا۔خود تو ڈوبا ہی اپنے ساتھ مشرقی یورپ کے درجن بھر ممالک کو بھی چکلہ و دلال معاشرے کے کیچڑ میں غرق کر دیا۔ایسا بڑا دھچکا کہ کل عالم ہل کے رہ گیا۔

اور یہ ایک عام ملک نہ تھا۔سوویت یونین ایک عام ملک نہ تھا۔اسے تو سوشلزم کی علامت اُس کی عظمت کا نشان قرار دیا گیا تھا۔سوشلزم کے نظام کے ساتھ وابستہ ساری امیدیں نفرتیں سوویت یونین کے ساتھ منسوب تھیں۔چنانچہ،اس کے ٹوٹنے سے سوشلزم کے مخالفین دنیا بھر میں ناچنے لگے اور دنیا بھر کے سوشلسٹ ہلاکت آمیز ماتم و مایوسی کا شکار ہوئے۔

ایسا وقت راہنماؤں کے لیے آزمائش کا وقت ہوا کرتا ہے۔سی آر اسلم خصوصاً اہم ہوگیا تھا کہ وہ ہمارے خطے میں شاید سب سے سینئر لیڈر تھا۔اور بلاشبہ اس پورے ریجن میں سب سے بڑا اور فہمیدہ مارکسسٹ دانشور تھا۔اس پر ذمہ داری بہت بڑی تھی۔تین ممکنہ راستے تھے۔

اول: شلوار کے پائنچے بلند کر کے، جوتے کے تسمے اچھی طرح کس کے میزائل کی رفتار سے دُڑکی لگا کر بھگوڑا بنا جائے۔

دوئم: گومگو، اگر مگر، کش مکش کے بانجھ پن کا کچکول لئے سمت کی بھیک مانگی جائے۔

سوئم: سچ پہ مبنی اپنے نظریے کی حفاظت اور سوشلزم کے دفاع کے لئے ساری توانائیاں مجتمع کر کے میدان میں کودا جائے۔

سی آر اسلم اور اس کے رفقاء نے تیسرا راستہ اختیار کیا۔اس نے سوشلزم کا بطور نظریہ، بطور معاشی سیاسی نظام اور بطور ایک سائنس کے زبردست جوش کے ساتھ مدلل و مسلسل دفاع کیا۔ مغربی پروپیگنڈہ اداروں اور عالمی بورژوا میڈیا کے سامنے ڈٹ کر سائنسی نظریات کا دفاع کیا۔ امتحان کی اس گھڑی سے لے کر اپنی طویل عمری کے ضعف اور شل اعضا کے باوجود سی آر اسلم مارکسزم

اور سائنس کی ترویج کی اہمیت پر ہی قائم و باعمل رہا۔

مثال کے طور پر ''اب کیا کیا جائے!'' نامی پمفلٹ میں وہ سوویت یونین کے بکھرنے کو سرد جنگ کے خاتمے، عدم جارحیت، اور ہلاکت آفرین اسلحہ اور فوجوں میں بتدریج کمی کے پراسیس سے جوڑتا ہے۔وہ اس ملک کے انہدام کا نتیجہ اس بات کو قرار دیتا ہے کہ ''ریاستی جبر سے عوام کو اور قوموں کو اکٹھا نہیں رکھا جا سکتا۔اور اس دور میں ریاستی جبر غیر ضروری ہوگیا ہے۔اب عوام کے اتحاد ،انسان دوستی اور انسان کی سربلندی کے لئے جدوجہد ہی انہیں ایک رکھ سکتی ہے۔۔۔۔۔''(19)

سی آر اسلم نے اس بڑے واقعہ کو وہاں پر پنپنے والے منفی رجحانات کا نتیجہ گردانا۔یہ منفی رجحانات ''نسلی انا، عقیدہ پرستی'' اور کٹر قوم پرستی کے تھے اور کیونکہ یہ منفی رجحانات ہیں اس لئے زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔سی آر اسلم اتنا ستھرا انسان تھا کہ وہ بہت اچھی اقدار کے مروج ہونے کی امید دلاتا رہتا تھا۔''انسانوں کی برابری، انسانوں کی سربلندی اور ان کے درمیان بھائی چارہ مثبت رجحانات ہیں جو نشو ونما پائیں گے اور ان کی جگہ لیں گے۔یہ جدلیاتی عمل ہے جو انسان کے فکر میں جاری ہے''۔

ایک کمال بات اس میں یہ تھی کہ وہ بہت بوڑھا ہونے کے باوجود بار بار کہنے لگتا تھا کہ میں اکیسویں صدی دیکھ کر مرنا چاہتا ہوں۔اُس شخص کو اکیسویں صدی میں جیسے ساری نعمتیں نظر آتی ہوں۔اس کا ایک لفظ ہمارے حافظوں میں ثبت ہو چلا تھا:''اکیسویں صدی سوشلزم کی صدی ہوگی۔اکیسویں صدی سائنس کی صدی ہوگی۔یہ صدی سرمایہ داری جاگیرداروں کے خاتمے کی صدی ہے۔یہ صدی تبدیلی میں تیزی کی صدی ہے۔.....''۔ملینیم کا لفظ بھی اسی سی آر نے مقبول عام کیا تھا۔

میں اس کے مضامین اپنی زیرادارت چلنے والے ماہناموں ''نوکیں دور'' اور ''سنگت'' میں شائع کرتا، لوگ بہت دلچسپی سے پڑھتے۔ہم دونوں کوئی موضوع چُن لیتے اور وہ اس پر مضمون لکھ بھیجتا۔

******

12.01.94

محترمی شاہ محمد مری

سلام دوستی

آپ کا 94-1-5 کا خط ملا۔ کامریڈ لال خان کے بارے میں تحریر کردہ مضامین کی فوٹو کاپیاں، اور تعلیم کا مقصد ارسال خدمت ہیں۔

فروری کے مہینے کے مضمون کا عنوان تحریر فرما دیجئے تا کہ اپنے وعدے پر پورا اتر سکوں۔

پنجاب کے صوفیا پر مضمون تحریر کرنے سے پہلے ان کا کلام پڑھنا پڑے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ فروری کے مہینے تک آپ کا یہ حکم بھی تعمیل ہو جائے۔

سوبھو میرا دیرینہ ہمدم ہے۔ سوبھو کے بارے میں کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ اور پاک و ہند کی نصف صدی سے اوپر کی تاریخ کے اہم کارنامے اور واقعات تحریر کرنا ہوں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنے ذہن پر زور دے کر ان واقعات کو یاد کر لوں اور پھر ان کے تناظر میں سوبھو کے متعلق لکھوں۔

ڈاکٹر خداداد خان کو سلام

سی آر اسلم

******

سی آر اسلم کی یہ خصوصیت کبھی بھی نہ بھلائی جا سکے گی کہ وہ سماج میں عورت کی پست حیثیت کے خلاف ساری عمر لکھتا بولتا رہا۔ گو کہ فوری یا عبوری حل نہ تھا اور فیوڈلزم کا خاتمہ ہی منطقی حل تھا مگر وہ چھوٹی عبوری وقتی رعایتوں اور اقدامات کو بھی عورتوں کے لیے بڑی نعمت تصور کرتا تھا۔

******

21.02.94

محترمی شاہ محمد مری صاحب

سلام دوستی۔

آپ کا خط ملا یاد آوری کا شکریہ۔ خواتین کے بارے میں ایک مضمون ارسال خدمت ہے۔ جہاں تک پنجاب کے صوفیا شعرا کے بارے میں مضمون لکھنے کی بات ہے تو اس میں ذرا دیر ہو گئی ہے۔ دیر کی وجہ یہ ہے کہ میں ہر صوفی شاعر کے عہد کا سیاسی معاشی اور سماجی پس منظر لکھ رہا ہوں۔ اس کے بغیر مضمون تشنہ رہے گا۔

میرے نزدیک شاعری ہر عہد کی سیاسی سماجی اور معاشی حقیقتوں کا جذباتی تاثر ہوتی ہے اور ان حقیقتوں کے بغیر شعرا کی تخلیقات کو مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

احباب کو سلام

آپ کا

سی آر اسلم

******

ذرا واقعات کا تسلسل بھی ملاحظہ ہو۔ (ہم پہلے قلیل تعداد مگر سرگرم ترین یونٹ بلوچستان کا تذکرہ کریں گے)۔

نومبر کی تین تاریخ کو بلوچستان کے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور عوامی قیادت کی سوچ کے حامل افراد نے اپنی ایک میٹنگ میں ملکی و بین الاقوامی سیاسی معاشی صورتحال پر تفصیلی بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کی تمام چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیاں ''سٹیٹس کو'' کی پارٹیاں ہیں۔ انہیں نہ تو عوامی مسائل سے دلچسپی ہے، نہ ہی یہ ان مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ملک کے مارکسسٹ حلقوں نے گروہوں کی صورت میں یا انفرادی طور پر مختلف توجیحات کی بنا پر مختلف مواقع پر ان تمام پارٹیوں کو ووٹ دے کر آزما لیا ہے۔ مگر ان تمام تجربات سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوا کہ یہ ساری پارٹیاں دراصل اوپری طبقات کی پارٹیاں ہیں اور خواہ اسمبلی میں دو جماعتی نمائندگی ہو یا کثیر جماعتی، عملی طور پر یہ ''یک جماعتی'' سیاست ہے، بالائی جماعت کی سیاست۔ اس لیے یہاں تیسری قوت کے بجائے دوسری قوت کے قیام کی ضرورت ہے یعنی مزدوروں، کسانوں، ماہی گیروں اور چرواہوں کی معاشی اور سیاسی امنگوں پر مبنی قوت کی۔

اس اجتماع میں اس عزم کا بھی اظہار کیا گیا کہ ہم اور ہماری سوچ سے متفق خواتین وحضرات اپنے قیمتی اور طویل جدوجہد سے حاصل کردہ ووٹ کو ضائع نہ ہونے دیں گے لہذا ہم بلدیاتی ،صوبائی اور قومی اسمبلی ، نیز سینٹ کے انتخابات میں اپنی پارٹی کے جھنڈے ،منشور اور نام کے تحت انتخابات لڑیں گے۔ہم سرمایہ پرستی ، مارکیٹ اکانومی ،قبائلیت ، جاگیرداری اور سامراجیت وغیرہ کے ماحول کے باجود بھرپور طور پر الیکشن میں حصہ لے کر عوام کو بتاسکیں گے کہ ان کے تمام مسائل کا حل موجودہ کسی بھی پارٹی کے پاس نہیں ہے بلکہ صرف عوامی سوچ رکھنے والی سامراج مخالف اور طبقاتی سیاست کرنے والی قوتیں ہی ان مسائل کو حل کرسکتی ہیں۔

یکم دسمبر کو ان احباب کی ایک اور میٹنگ میں جناب سیف الدین بوھرہ کی قیادت میں ایک دس رکنی کنوینگ کمیٹی قائم کی گئی جو اگلے تین ماہ تک سابقہ ذمہ داریوں کے علاوہ پارٹی کی کنونشن منعقد کرنے کا انتظام کرے گی ۔ پارٹی کا نام ''پاکستان سوشلسٹ پارٹی (PSP) ہوگا اور اس کے سرخ جھنڈے پر درانتی اور ہتھوڑے کے علاوہ چار ستارے ہونگے ۔ پارٹی کی ممبر شپ مہم شروع کی جائے گی اور مختلف جگہوں پر اس کے یونٹ قائم کئے جائیں گے۔ پارٹی کیلئے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا جائے گا اور اس کے عوامی فرنٹ قائم کئے جائیں گے ۔ پارٹی کے ورکروں کو عوامی اور جمہوری سیاست اور مارکسزم کی تعلیم دینے کیلئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو سٹڈی سرکلوں کے نیٹ ورک کا انتظام کرے گی۔ پارٹی کی پبلشنگ کمیٹی اپنے شعبے کی دیکھ بھال کرے گی۔

کنوینگ کمیٹی کے 8 دسمبر کے اجلاس میں طے کیا گیا کہ اساسی مسودہ علاقے کے کامریڈز کو مہیا کیا جائے گا تاکہ وہ اس پر بحث کر کے فروری کے پہلے ہفتے تک اپنی تجاویز مفصل طور پر لکھ بھیجیں ۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جو خود بھی اس دستاویز میں قومی سوال کے بارے میں امور تجویز کرے گی۔

لوگوں کیلئے ایک تعلیمی سیاسی سلسلہ شروع کرنے کی منظوری بھی دی گئی جس میں ایک فرد مخصوص موضوع پر خیال آرائی کرے گا۔جس پر کھلی بحث کی جائے گی اور اس کو فعال بنانے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مدعو کیا جائے گا۔مقررین باہر سے بھی بلائے جائیں گے۔

سی آر اسلم اور بلوچستان

یہی دور تھا جب بلوچستان ایک بار پھر سی آر اسلم کی پارٹی بہت سرگرمی سے کام کرنے لگی۔اور اس سارے عمل میں گائیڈ لائن سی آر اسلم کی تعلیمات ہی تھیں۔ وہ مسلسل فون کرتا،خطوط مضامین اور سرکلر لکھتا رہتا۔

سی آر اسلم نے پڑھنے لکھنے کو آنکھیں، لکھنے کو ہاتھ اور بولنے کو زبان بقیہ تمام اعضا سے زیادہ استعمال کیے۔دماغ تو اس کا حیرت انگیز طور پہ اَن تھک تھا مگر آخری برسوں میں انگلیاں آخر میں اتنی اکڑ گئی تھیں کہ وہ قلم تین کے بجائے سارے پانچ انگلیوں میں پکڑ کر لکھتا۔جس طرح آپ لقمہ پکڑتے ہیں ۔ اور اب وہ باریک قلم سے لکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے مارکر استعمال کرنا شروع کر دیا.....آنکھیں برباد ہوگئی تھیں۔

******

10.02.96

محترم ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

سلام دوستی

میرے ڈاکٹر نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں اپنی آنکھ کا موتیا کا آپریشن مارچ کے پہلے ہفتے

میں کرالوں ۔ میں نے اس کے تاکیدی مشورے کو مان لیا ہے ۔ اس لئے میں معذرت خواہ ہوں کہ میں آٹھ مارچ کو کوئٹہ نہیں پہنچ سکوں گا اور آپ احباب سے سیاسی مذاکرات نہیں کرسکوں گا ۔ آپ سب دوستوں کو بتا دیں تا کہ وہ اس روز میرا انتظار نہ کریں ۔ باقی یار زندہ صحبت باقی ۔ اپریل کے مہینے میں ایک پورا ہفتہ آپ کا مہمان رہوں گا ۔ (اس نے آپریشن کے بعد ہر جگہ کہنا تھا کہ میری آنکھوں میں شیشہ ڈالا ہوا ہے ۔ مصنف) ۔

خواجہ رفیق یکا یک سخت بیمار ہو گئے ہیں اور دل کے ہسپتال میں زیر علاج ہیں ۔ آپ کو، آپ کی بیگم کو، اور آپ کے بچوں کو عید کی خوشیاں مبارک ۔

آپ کا مخلص
سی آر اسلم

******

ہم بلوچستان کا تذکرہ کررہے تھے:

مورخہ یکم مارچ 1996 کو پاکستان سوشلسٹ پارٹی بلوچستان کے کنوینگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں سابقہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کی گئی اور منظوری دی گئی ۔ اس اجلاس میں منشور کے درج ذیل حصوں کی منظوری دی گئی ۔ منشور کے بقایا حصوں کی منظوری بحث وتمحیص کے بعد اگلے اجلاس میں دی جائے گی ۔ نیز اجلاس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مورخہ 96-3-23 کو موجودہ کنوینگ کمیٹی توڑ کر پارٹی عہدوں کے لیے باقاعدہ چناؤ کیا جائے گا ۔ اس اجلاس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ قومی سوال پر پیش کردہ مقالے کو ''قومی سوال پر پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا موقف'' کے نام سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جائے گا'' ۔

پندرہ دن بعد 15 مارچ کو پارٹی کی کنوینگ کمیٹی کا اجلاس زیر صدارت کنوینر سیف الدین بوہرہ منعقد ہوا جس میں صوبائی سوشلسٹ کانفرنس کے لیے ضلع کوئٹہ سے مندرجہ ذیل ڈیلیگیٹس اور مبصرین کا انتخاب عمل میں لایا گیا ۔

ڈیلیگیٹس:

تمکین احمد عباسی، ڈاکٹر خالد، سائمن کانٹ، ڈاکٹر خدائیداد، ڈاکٹر شاہ محمد مری، محمد سرور، ڈاکٹر امیر الدین، عنایت اللہ، نوشین، محمد شہک ۔

مبصرین:
جمیل احمد کھیتران، خان گل ۔

طے ہوا کہ پارٹی کی صوبائی ڈیلیگیٹ کانفرنس مورخہ 23 مارچ 1996 بوقت 10:30 بجے صبح بمقام سینٹ مائیکل ہائی سکول آرڈیننس روڈ کوئٹہ کینٹ کو ہوگی ۔

جس میں پارٹی آئین اور منشور کی منظوری دی جانی تھی، اور صوبائی کمیٹی کے ممبران اور عہدے داران کا انتخاب ہونا تھا ۔

چنانچہ مقررہ تاریخ کو پارٹی کی ''سوشلسٹ ڈیلیگیٹ کانفرنس'' منعقد کی گئی جس میں بلوچستان بھر سے کامریڈز نے شرکت کی ۔ کانفرنس نے موجودہ تقاضوں کے مطابق پارٹی منشور اور صوبائی آئین کی منظوری دی ۔ صوبائی کمیٹی کے ممبران کا چناؤ کیا اور صوبائی سیکرٹریٹ کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ جس میں ڈاکٹر خدائیداد کو صدر منتخب کیا گیا، میر عالم نائب صدر اور محمد سرور کو سیکرٹری جنرل چنا گیا ۔

ممبران صوبائی کمیٹی کے نام یہ تھے: ڈاکٹر شاہ محمد مری، تمکین احمد عباسی، احمد نواز مری، ڈاکٹر امیر الدین، محمد عثمان، شہک کریم، سائمن کانٹ، خان گل، نوشین، ڈاکٹر لعل جان، جمیل احمد کھیتران اور ڈاکٹر حاجی اکبر ۔

تقریباً اسی زمانے میں سی آر اسلم نے ایک نیا تھیسز ڈویلپ کر دیا ۔ اب اس نے جو دو چار باتیں اخذ کیں ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ اس خطے میں کافی دہائیوں تک انقلابیوں کے واسطے بورژوا جمہوریت کے لیے اور اس کے اندر جدوجہد کرنا ہی بڑا راستہ رہے گا ۔ چنانچہ وہ ہر وقت مزدوروں کسانوں خواتین اور دانشوروں کو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار کرتا نظر آتا ۔ نئی صدی اور الیکشن گویا ہر ورکر کو اس کی طرف سے نصیحت، ہدایت اور وصیت ہوا کرتے تھے ۔

اِسی سے جڑا ہوا نظریہ اس نے یہ پیش کیا کہ یہاں اب حلقہ بندیوں کی تبدیلی کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ یعنی انتخابی حلقے علاقوں کی بجائے آبادی کی طبقاتی ساخت پہ بنائے جائیں۔ اسے وہ ''طبقاتی انتخابات'' کا نظریہ کہتا تھا۔ اُس کے حساب کتاب کے مطابق عورتیں آبادی کا پچاس فیصد ہیں۔ لہٰذا پچاس فیصد سیٹیں انہی کی ہونی چاہئیں۔ مزدوروں کی آبادی دس فیصد ہے۔ دیہات میں کسانوں، مزارعوں اور کھیت مزدوروں کی تعداد 30 فیصد ہے۔ اسمبلی کی سیٹیں بھی اسی تناسب سے رکھی جائیں۔

اپنے اس ''طبقاتی انتخابات'' کے تھیسز کو وہ سنجیدگی سے پروموٹ کرتا رہا۔ اپنی ہر تقریر، مضمون اور گفتگو میں وہ اس تھیسز کی بات کرتا تھا۔ اُس زمانے کے اس کے سارے مضامین میں یہ تھیسز ایک مہم کے بطور موجود تھا۔

****

23 مارچ کی صوبائی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد کوئٹہ کے بعد پارٹی کی سب سے متحرک یونٹ، ماوند میں از سرِ نو یونٹ بندی اور ممبر شپ مہم کا آغاز کیا گیا۔ یہاں پارٹی کا ذمہ دار احمد نواز کو بنایا گیا۔ چنانچہ PSP ماوند یونٹ کے لیے حسین احمد نے دفتر حاصل کیا اور ساتھیوں نے منظور کیا اور تمام سینئر و جونیئر کو بتایا گیا کہ آئندہ پارٹی کے تمام کام دفتر میں ہونگے۔ پارٹی کا جھنڈا 29-5-96 کو دفتر پر لہرایا گیا اور ساتھی وہاں بیٹھتے ہیں اور دفتر کھلا رہتا ہے۔

****

ہمیں اُس وقت کے بلوچستان اور اس میں موجود مزدور تحریک کو سمجھنے کے لیے وہاں کی پارٹی صوبائی کمیٹی کی ایک میٹنگ کا پریس ریلیز پڑھنا ہوگا۔ یہ میٹنگ ڈاکٹر خدائیداد کی صدارت میں ہوئی تھی

''اس وقت پوری دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔ جس میں ثقافت، معیشت، سیاست اور ٹیکنالوجی حیرت انگیز تیز رفتاری سے تبدیل ہوں گے۔ اس صدی میں صرف وہی قومیں بقاء کے اٹل قانون پر پورا اتریں گی جو تعلیم یافتہ، صنعتی اور سائنسی طور پر ترقی یافتہ

نتیجتاً پرامن ہوں گی۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستانی سماج اب تک جاگیرداری نظام سے منسلک ہے۔ یہاں کا جاگیردار تعلیم سائنس اور صنعتی ترقی کا دشمن ہے۔ جس کو ملکی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ اسے اپنی بقا اور ملکی وسائل کی لوٹ کھسوٹ سے دلچسپی ہے۔ بلوچستان کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ یہاں ابھی تک قبائلی نظام اپنے تمام تر مکروہ رواجوں، روایتوں اور رویوں کے ساتھ عوام پر مسلط رکھا گیا ہے۔ انسانوں کی قتل و غارتگری پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔

اگر قبائلی جنگیں نہ ہوں تو یہ نظام اپنی موت آپ مر جائے۔ سچ ہے جو نظام انسانوں اور انسانیت کی بقا کا سامان نہ کر سکے اسے مر جانا چاہیے۔ اس لیے پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن بلوچستان نے دانشوروں کی امن کمیٹی کے قیام کا جو فیصلہ کیا ہے تو اس سلسلے میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی ''دانشور امن کمیٹی'' کی مکمل حمایت کرتی ہے۔ اور ہر ممکن تعاون کی پیشکش کرتی ہے۔

حالیہ ہوشربا مہنگائی نے پاکستانی عوام کو مصائب اور مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ ان کی غربت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں حکومت کو چاہیے کہ وہ بیرونی مالیاتی اداروں کے دباؤ میں آ کر بجٹ کے ذریعے عوام پر مزید ٹیکسوں کا بوجھ نہ ڈالے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی مزید ٹیکسوں کی شدید مخالفت کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جاگیرداروں پر بھی صنعتی شعبہ کی طرح انکم ٹیکس عائد کرے اور اس کی وصولی یقینی بنائے۔

موجودہ مہنگائی نے جہاں عام شخص کو بری طرح متاثر کیا ہے وہاں وہ سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں کام کرنے والے نچلے درجے کے ملازمین میں جو ماہوار ایک متعین اور قلیل آمدنی پر گزارا کرتے ہیں براہ راست معاشی بدحالی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس لیے پاکستان سوشلسٹ پارٹی مزدوروں، کلرکوں بنک ملازمین، پریس ملازمین، ریلوے ملازمین اور پیرامیڈیکل ملازمین کے مطالبات کی پرزور حمایت کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ محنت کشوں اور ملازمین کے زندہ رہنے کا حق تسلیم کرتے ہوئے فی الفور ان کے مطالبات منظور کرے۔ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے اگر پاکستان ورکرز کنفیڈریشن نے جلسہ جلوس اور ہڑتال

کی کال دی تو PSP ان کی بھرپور حمایت کرے گی۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی وفاقی اکائیوں کی زیادہ سے زیادہ معاشی اور انتظامی خودمختاری کی حامی ہے پاکستان کے چاروں صوبے اس امر کے حقدار ہیں کہ وہ اپنے اپنے پیداواری وسائل کو خود کنٹرول کریں۔

پارٹی ہمیشہ کی طرح اب بھی سمجھتی ہے کہ فیڈریشن کو اکائیوں کے حقوق مکمل طور پر، بغیر کسی پس و پیش اور احسان جتائے، دینے چاہیے۔ اس لیے بلوچستان کی تمام سیاسی قوتوں کا یہ مطالبہ کہ مرکز بلوچستان کو اس کے حصے کا فنڈز دے بالکل حق بجانب ہے۔ لیکن چونکہ کرپشن کی وجہ سے تمام ترقیاتی اور غیر ترقیاتی فنڈز ہڑپ کر لیے جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ احتساب کا ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس سے یہ امر یقینی ہو کہ ملنے والا فنڈ بلوچستان کی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو۔

پارٹی یہ تہیہ کر چکی ہے کہ وہ آئندہ ہونے والے قومی، صوبائی اور بلدیاتی انتخابات میں بھرپور حصہ لے گی۔ حال ہی میں مرکزی حکومت نے یہ عندیہ دیا ہے کہ آئندہ بلدیاتی انتخابات اسی سال نومبر میں ہوں گے۔ پارٹی اس کی تیاری اور اس میں حصہ لینے کے لیے اپنے ہر اجلاس میں اس پر غور کرے گی۔

******

9.11.96

ڈیئر ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب

سلام دوستی

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ بیگم صاحبہ اور بچے بھی بخیریت ہوں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ''عوامی جمہوریت'' کی آب یاری کے لئے آپ نے جو وعدہ کر رکھا ہے ہر ماہ اس کی آب یاری کے لئے اسلم اعوان کی دستگیری جاری رکھیں شکریہ۔ آپ یعنی بلوچستان کے سوشلسٹ اور ہم سب فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم سوشلسٹ' الیکشن میں حصہ لیں گے۔ جن حالات

میں الیکشن ہوں ہم ضرور حصہ لیں گے۔ اس لئے آپ اعلان کریں کہ بلوچستان کے سوشلسٹ الیکشنوں میں حصہ لیں گے۔ اور مزدوروں اور کسانوں اور دانشوروں سے اپیل کریں کہ وہ بلوچستان کی سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ ہولڈروں کو ووٹ دیں تا کہ جمہوریت بحال اور مستحکم ہو اور مزدور کسان راج قائم ہو تا کہ ہر قسم کے استحصال، جبر زیادتی اور ظلم و ناانصافی سے پاک معاشرہ قائم ہو۔

آپ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے مزدوروں کے مسائل کے حوالے سے، کسانوں کے مسائل کے حوالے سے' اور امن برابری بنیادی انسانی حقوق' سماجی انصاف اور سوشلزم کے حوالے اور خواتین کو سماج میں مردوں کے برابر مقام اور ان کے برابر معاشی سیاسی اور سماجی حقوق کے حوالے سے ان میں شعور پیدا کریں، انہیں متحرک کریں اور سوشلسٹ امیدوار کے لئے ووٹ مانگیں۔

ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ تبدیلی اور ترقی کی ان قوتوں یعنی مزدوروں کسانوں اور خواتین سے رابطے کے لئے اور انہیں با شعور کرنے کے لئے کام کریں گے اور پارٹی کے امیدواروں کے لئے ووٹ مانگیں گے۔ طبقاتی طریق انتخاب اور طبقاتی انتخابی حلقوں کی تشکیل کا مطالبہ کریں گے۔ مزدوروں کے لئے دس فی صد، کسانوں کے لئے ستر فیصد اور خواتین کے لئے مردوں کے برابر سیٹیں مانگیں گے۔

الیکشن نوے دن میں ہوں یا اس سے زیادہ دنوں میں ہوں ہم مزدوروں کسانوں اور خواتین سے رابطہ کر کے انہیں مزدور کسان راج کے لئے متحرک کرنے میں لگے رہیں گے۔ وقت آ گیا ہے کہ مارکسی اہل فکر اور ترقی پسند دانشور کمر بستہ ہو کر ترقی اور تبدیلی کی ان قوتوں کو ان کے تاریخی فریضہ سے آگاہ کریں۔ موجودہ سیاسی صورت میں میٹنگ میں آپ کی کمی شدت سے محسوس کی گئی ہے۔

احباب کو سلام۔ نوکیں دور کے لئے چشم براہ ہوں۔

آپ کا

سی آر اسلم

******

اسی دوران خطے میں ایک اندوہناک واقعہ ہوا۔ بلوچستان کی پارٹی نے مندرجہ ذیل پریس ریلیز جاری کیا:

''28-9-96

پاکستان سوشلسٹ پارٹی بلوچستان، افغانستان کے سابق انقلابی حکومت کے سربراہ اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان کے صدر ڈاکٹر نجیب اللہ اور ان کے بھائی شاہ پور احمد زئی کی شہادت پر انتہائی دکھ اور رنج کا اظہار کرتی ہے۔ ان کو جس بہیمانہ اور وحشیانہ طریقے سے قتل کیا گیا اور قتل کرنے کے بعد ان کی لاشوں کے ساتھ جو انسانیت سوز طرز عمل اختیار کیا گیا وہ انتہائی قابل مذمت اقدام ہے۔ اس بے رحمانہ قتل کو دنیا کے کسی بھی قانون کے تحت درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ تمام دنیا کا یہ مصدقہ اصول ہے کہ کسی بھی شخص پر ایک غیر جانبدار عدالت میں قانونی تقاضے پورے کیے بغیر سزا نہیں دی جاسکتی۔ لیکن افغانستان میں ڈاکٹر نجیب اللہ کا قتل انصاف کے منہ پر ایک طمانچہ بھی ہے اور تاریخ کا ایک المیہ بھی۔

پارٹی اقوام متحدہ کی بھی پرزور الفاظ میں مذمت کرتی ہے کہ وہ اِن بدلتے ہوئے حالات میں ڈاکٹر نجیب اللہ اور ان کے بھائی کی زندگی کی حفاظت کو یقینی نہیں بنا سکی۔ جو ادارہ اپنی پناہ میں آئے ہوئے دو اشخاص کی حفاظت نہیں کر سکا اُس پر دنیا میں امن و امان کے قیام اور بنیادی انسانی حقوق کے سلسلے میں قطعی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

پارٹی قاتلوں کے پاکستانی پشت پناہوں کی مذمت کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتی جو اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر اس قدر بہیمانہ اور تہذیب سے گرے ہوئے قتل کے مرتکب ہوئے۔

ڈاکٹر نجیب اللہ صرف افغانستان قوم کے شہید نہیں بلکہ وہ اس پورے خطے کے انقلابیوں کے عزیز دوست تھے ان کے بھائی اور بازو تھے۔ ان کا قتل ایک عالم کا قتل ہے اس پورے منطقے کے لوگ ان کی موت پر ماتم کناں ہیں''۔

******

پروگریسو ڈاکٹرز فورم

اسی دوران نومبر 1996 میں بلوچستان میں پارٹی سرگرمیوں کی ایک رپورٹ یہ کہتی ہے:
مختلف ہم خیال روشن فکر دوستوں سے رابطہ کیا گیا جس کے نتیجے میں ڈاکٹروں کی ایک تنظیم پروگریسو ڈاکٹرز فورم (PDF) قائم کی گئی جس نے قلیل عرصے میں بہت اہم کام کیے مثلاً اب تک تقریباً چھیاسٹھ مستحق اور نادار بچوں کو مفت خون فراہم کیا گیا۔

پارٹی دوستوں نے ایک اور تنظیم پیس ایکشن فورم (PAF) کے نام سے قائم کی۔ جس کے ذمے بلوچستان میں قبائلی کشت وخون کے خلاف مختلف ذریعوں سے عوامی شعور بلند کرنا تھا۔ لیکن یہ تنظیم اب تک اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کے صرف دو اجلاس ہوسکے ہیں جو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی غیر فعالیت کی وجہ سے یہ تنظیم مستقبل قریب میں ختم ہوجائے گی۔

****

25 دسمبر 1996 کو سوشلسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کا اجلاس شیام کمار کے گھر منعقد ہوا۔ اجلاس میں الیکشن میں امیدوار نہ ملنے کی وجہ سے حصہ نہ لے سکنے پر گہری مایوسی کا اظہار کیا گیا۔ شیام کمار نے دوستوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''الیکشن میں جانا تھا لیکن نہیں جاسکے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے، نئی صف بندی کرنی چاہیے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتے۔ ہم مزدوروں کے لیے سیاست کرتے ہیں ہم ان کی حمایت کریں گے۔ اخباری بیان حمایت میں جاری کریں گے۔ جہاں موقع ملے بات کی جائے۔ انہی لوگوں (مزدوروں) کے لیے کام کرکے ان کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔

ڈاکٹر خدائیداد نے کہا کہ ٹریڈ یونین کے ساتھ رابطہ رکھنا ضروری تھا، لیکن نہیں رکھا۔ گذشتہ تجربہ یہ ہے کہ بورژوا قوم پرست تحریکیں اُن کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ مختلف ذرائع مثلاً پیسہ وغیرہ کے ذریعہ۔ اس طرح ہمارے cause کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہم ان سے رابطہ نہیں

کرتے۔قومی تحریکوں میں قبائلی لوگ ہیں۔احتیاط کرنی پڑے گی۔دیکھنا پڑے گا لیبر میں لوگ ہمارے مقصد کے ہیں۔ہمیں پہلا تجربہ ریلوے یونین کی ناکامی کی صورت میں ہوا۔سیاست اور پیداگیری مترادف باتیں ہوگئی ہیں۔ہماری تحریک ناکام ہوئی۔

مزدوروں کو ایجوکیٹ کرتے رہنا چاہیے۔

الیکشن میں ووٹ مزدور امیدواروں کو دیا جائے۔

ڈاکٹر حاجی اکبر نے کہا کہ طے ہوگیا کہ مزدوروں کے امیدواروں کی حمایت کرنی چاہیے۔اپنے دوستوں ورکروں اور دوسرے افراد سے بات کی جاسکتی ہے۔کچھ مالی مدد کی جائے۔ہم سے جو کچھ ہوسکتا ہے کرنا چاہیے۔پارٹی فنڈ سے مدد کی جائے۔

شاہ محمد نے کہا کہ یہ کرسچن امیدوار قابل اعتماد نہیں، زور اور طاقت کی تاب نہ لاسکے گا۔لیکن اُس نے یقین دہانی کرادی ہے۔دوسرے بھی with draw نہیں ہونگے۔

جہاں پہ ہمارے لوگ امیدوار لوگ نہیں ہیں وہاں دوستوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔

سترہ جنوری 1997 کو بلوچستان کی سوشلسٹ پارٹی کی جنرل باڈی میٹنگ منعقد ہوئی۔اس میں مزدوروں کی طرف سے الیکشن میں امیدوار کھڑے کرنے کو سراہا گیا۔پارٹی نے اس الیکشن میں ان کا بھرپور طور پر ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔معاشی لڑائی سے نکل کر سیاسی اکھاڑے میں آگئے ہیں۔ہمیں ان کے لیے عملی طور پر شامل ہونا ہوگا۔مضامین، پمفلٹ، وال چاکنگ، اخراجات کے لیے چندہ کیا گیا۔وصول شدہ رقم پانچ ہزار بنی۔جن دس افراد سے یہ چندہ وصول ہوا (ان کی رقم کا تذکرہ نہ کرتے ہوئے) وہ یہ تھے:

ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر امیر الدین، تمکین احمد عباسی، شیام کمار، ڈاکٹر خدائیداد، ڈاکٹر تاج حسنی، سرور آغا، سیف الدین بوہرہ، ڈاکٹر حاجی اکبر، ڈاکٹر فیض ہاشمی۔وعدہ کرکے پیسے نہ دے سکنے والوں کی بات کرنا نامناسب ہے لیکن سرور آغا کی فائل میں ہماری جن تنظیموں کے ذمہ چندہ لگا ان کے نام یہ تھے:

پیس ایکشن فورم، پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن، پروگریسو ڈاکٹرز فورم۔

21-1-97 کو پانچ ہزار روپے بطور انتخابی مہم ورکرز ایمپلائز اتحاد بلوچستان لیبر فیڈریشن کو پہنچائی گئی۔ان کا رسید نمبر ہے 127۔

****

5-5-97

مورخہ یکم مئی کو پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی ڈسٹرکٹ کمیٹی کوئٹہ کا اجلاس منعقد ہوا۔اجلاس میں یوم مئی کے حوالے سے شکاگو کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔انہوں نے مزدور مفادات کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر مزدور طبقے کی جدوجہد کو لازوال راستہ دکھایا۔عالمی سطح پر سامراجی مفادات کو کاری ضرب لگائی۔

اجلاس میں پاکستان کے تمام محنت کشوں اور کچلے ہوئے طبقات سے اپیل کی گئی کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوں تاکہ وہ موجودہ پانچ فیصدی جاگیرداروں نوابوں اور سرمایہ داروں کو اقتدار سے بے دخل کرکے پاکستان میں حقیقی مزدور کسان راج قائم کریں۔مزدور طبقے کی متحدہ قوت ہی ملک سے بھوک افلاس اور استحصال کا خاتمہ کرسکتی ہے۔نسلی لسانی اور مذہبی بنیادوں پر انتشار ان زبوں حالی میں مزید اضافہ کرے گا۔اور وہ مشکلات سے دوچار رہیں گے۔

اجلاس میں آٹے کے موجودہ بحران پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور اسے حکمرانوں، سمگلروں اور منافع خوروں ذخیرہ اندوزوں کا خود پیدا کردہ قرار دیا گیا۔ان عوام دشمن عناصر کی شدید مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا کہ عوام کو سستے داموں آٹا مہیا کیا جائے۔

علاوہ ازیں پارٹی تنظیمی صورت حال پر غور کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ بلوچستان میں پارٹی کو مزید فعال اور سرگرم کرنے کے لیے مختلف مقامات پر پارٹی کارکنوں اور ہم خیال ترقی پسند قوتوں کی نظریاتی، سیاسی تربیت کے لیے سٹڈی سرکلز کا اہتمام کیا جائے گا اجلاس میں کوئٹہ شہر کے پارٹی کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا نیز اہم فیصلے کیے گئے۔

******

اگست 1997

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کی میٹنگ 24 اگست 1997 کو منعقد ہوئی۔ جس میں ملکی و بین الاقوامی سیاسی و معاشی صورتحال پر تفصیل سے بحث ہوئی۔ اس کے علاوہ پارٹی کی تنظیمی صورتحال کا مفصل جائزہ لیا گیا۔

پارٹی نے مردم شماری کے بارے میں دو نقاطی موقف اختیار کرنے کا فیصلہ کیا:

1- تمام مہاجر عناصر کو مردم شماری سے الگ رکھا جائے۔

2- مقامی آبادی کی مردم شماری شفاف، ستھری اور بین الاقوامی معیار کے مطابق ہو۔

پارٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ مردم شماری کے معاملے کو سرداری اور خانی نظام کے خلاف ابھرتی ہوئی عوامی نفرت کو کند کرنے اور عوامی قوت کو تقسیم کرنے کی ہر سازش کا ڈٹ کر مخالفت کرے گی۔

پارٹی کے کوئٹہ ضلع کے سربراہ جناب تمکین عباسی نے ضلع میں پارٹی کو مزید متحرک اور فعال بنانے کی تجاویز دیں۔ پارٹی نے جلد از جلد مکران، اور سبی ڈویژنوں میں پارٹی کی ضلعی کمیٹیاں قائم کرنے کے بارے میں تفصیلی بحث کی۔

یہ فیصلہ ہوا کہ بلوچستان سنڈے پارٹی ہر اتوار کو منعقد نہ ہو بلکہ ایک اتوار سنڈے پارٹی کا ہوا اور دوسرے اتوار سوشلسٹ پارٹی کا۔ اسی طرح پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کو فعال بنانے کا فیصلہ ہوا۔

رسالہ ''سنگت'' جلد از جلد شروع کرنے کا عزم بھی کیا گیا۔

******

5 ستمبر 1997 کو سی آر اسلم کی جانب سے ایک سرکلر ہمیں ملا:

محترمی جناب

تسلیمات۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں سات نومبر اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کا دن ہے اس انقلاب کی روشنی نے پانچوں براعظموں کو منور کر دیا تھا۔ اس انقلاب کے دن پاکستان سوشلسٹ پارٹی سوشلسٹ کانفرنس کرنا چاہتی ہے۔

اس کانفرنس کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے ضلع کی ضلعی کمیٹی کی میٹنگ کریں۔ ستمبر اور اکتوبر کے دو مہینوں میں پارٹی میں نئے ممبر بھرتی کریں اور اپنے ضلع میں مزدوروں اور کسانوں سے رابطہ کریں اور انہیں پارٹی میں شمولیت پر آمادہ کریں۔

اس کانفرنس کی تیاری کے لیے ملک کے معاشی سماجی اور سیاسی حالات کا تجزیہ کریں اور مزدوروں اور کسانوں اور دبے کچلے عوام کو ان کے معاشی سماجی اور سیاسی حقوق کا شعور دیں اور ان پر واضح کریں کہ جب تک ملک میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حکمرانی رہے ملک کا معاشی نظام خراب سے خراب تر اور سماجی نظام بدتر اور سیاسی نظام پُرتشدد ہی رہے گا۔

مزدوروں کی چھانٹیاں، برطرفیاں اور نجکاری ہوتی رہے گی۔ بے روزگاری میں اضافہ جاری رہے گا۔ صنعتکاری نہیں ہوگی۔ منافع کا لالچ مہنگائی میں اضافہ کرتا رہے گا۔

کسانوں سے رابطے کے دوران انہیں بتائیں کہ ان کے مسائل زمین کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے ہیں اس لیے انہیں زرعی اصلاحات کرانے، زمین کی حد ملکیت 25 ایکڑ فی خاندان مقرر کر کے اس سے اوپر کی تمام زمین ضبط کر کے ساڑھے 12 ایکڑ فی خاندان کے حساب سے خود کاشت کی بنیاد پر مفت تقسیم کرانے کے لیے پاکستان سوشلسٹ میں شامل ہو کر جدوجہد کرنی چاہیے۔

مزدوروں اور کسانوں کو شعور دیں کہ اُن کے اسی فی صد ووٹ ہیں۔ اور وہ اپنے ووٹوں کی طاقت سے اسمبلیوں میں 80 فی صد سیٹیں حاصل کر کے پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی راہنمائی میں ملک میں مزدور کسان راج قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں طبقاتی حلقے اور طبقاتی انتخاب کے لیے جدوجہد کے لیے تیار کریں۔

انہیں احساس دلائیں کہ وہی اپنے ووٹوں سے مزدور کسان قائم کر کے برابری، جمہوریت اور انصاف والا سماج قائم کریں گے۔ جس میں انسانی حقوق اور سماجی انصاف کی ضمانت ہوگی۔ اس طرح ہی وہ سوشلزم کی تعمیر کر کے سب کے لیے پرمسرت زندگی کی ضمانت دے سکتے ہیں اور یہ وہ صرف پاکستان سوشلسٹ پارٹی میں شرکت کر کے ہی کریں گے۔

نیازمند

محمد اسلم اعوان

سیکرٹری دفتری امور

******

2.12.97

محترمی ڈاکٹر صاحب

آداب!

آپ کا 26-11-97 کا خط یکم دسمبر کو ملا۔ یادآوری کا شکریہ۔ آپ کی بیگم کا دعائیہ جواب ''اللہ سکھی رکھے'' مجھے بہت پسند آیا۔ آپ میری طرف سے ان کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کریں۔

یار دوست سب ٹھیک ہیں۔

''سنگت'' کے جاری ہونے کی خبر عوامی جمہوریت میں چھاپ دیں گے۔ امید ہے سنگت، نوکیں دور سے بہتر اور بلند تر ہوگا۔ آپ اپنی کتابیں مجھے ضرور ارسال کر دیں تا کہ میں انہیں پڑھ کر اپنے علم میں اضافہ کر سکوں۔ بلوچ سماج اور بلوچستان کی تاریخ کے بارے میں صرف چند کتابوں کے مطالعے تک میرا علم محدود ہے۔

احباب کو سلام۔ سنگت کا بے چینی سے انتظار ہے۔

آپ کا مخلص

سی آر اسلم

******

کبھی کبھی یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارا سماج ایسا کیوں ساکن و جامد ہے کہ فطری بڑھوتری میں بھی ایک آدھا سنٹی میٹر تک آگے نہیں جاتا۔ ابھی میں بیس برس قبل (15 مارچ 1998) کی سوشلسٹ پارٹی بلوچستان کی ایک رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ اُس زمانے میں مردم شماری ہو رہی تھی۔ آج

2017 کو بھی مردم شماری ہو رہی ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر ہم اُس وقت جہاں کھڑے تھے، آج بھی وہیں ہیں۔ ذرا رپورٹ دیکھے:

******

مارچ 1998

صوبائی کمیٹی کی میٹنگ

پندرہ مارچ 1998 بروز اتوار کو سوشلسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں مردم شماری کے بارے میں بحث ہوئی۔ یہ بات نوٹ کی گئی کہ مردم شماری خالصتاً ایک انتظامی اور وفاقی معاملہ ہے۔ مگر بلوچستان میں بالائی طبقات اس کو ایک متنازعہ سیاسی ایشو بنا کر دولسانی گروپس میں خلاء بڑھا رہے ہیں۔

دونوں طرف زوال پذیر قبائلی نظام کو دوام بخشنے کے لیے اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح عوام میں نفرت پھیلا کر طبقاتی شعور کو کُند بنا کر طبقاتی جدوجہد کا راستہ روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی اس طرز عمل کی سخت مذمت کرتی ہے۔

اجلاس میں مکران میں سیلاب کی تباہ کاری پر سخت افسوس کا اظہار کیا گیا۔ لیکن امداد کی تقسیم میں جو بدعنوانی ہو رہی ہے اس کے فوائد متاثرین تک نہیں جا رہے، ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ مہنگائی خصوصاً بجلی کی قیمتوں میں اضافہ پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

ملک میں موجودہ مذہبی و فرقہ وارانہ دہشت گردی کی جو لہر آئی ہے جس کے نتیجے میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو رہی ہیں پارٹی اس کی شدید مذمت کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مجرموں کو فی الفور گرفتار کر کے سزا دے۔

قرار پایا کہ نئی تعلیمی پالیسی پرانی تعلیمی پالیسی کا چربہ ہے۔ اسی طرح صحت پالیسی بھی ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے مفادات کو تحفظ دیتی ہے۔ اور عوامی امنگوں کی ترجمان نہیں ہے۔ اس لیے پارٹی ہر دو پالیسیوں کو مسترد کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ مفت لازمی تعلیم اور مفت علاج معالجہ کی سہولیات کی ضمانت والی پالیسی بنائی جائے۔

قرارداد ہوئی کہ نج کاری کا خاتمہ ہونا چاہیے۔اس سے بے روزگاری کا عنصر بہت بڑھ جاتا ہے۔

یہ بھی قرار پایا کہ پڑوسی ممالک سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی ضرورت ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں امن کا معاملہ اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔

****

سرور آغا کی فائل میں ایک اور دلچسپ بات بھی دیکھنے میں آئی۔اُس کے اندر حبیب بنک کے ذریعے پارٹی کے اخبار کو تین ہزار تئیس روپے بھیجے گئے۔ساتھ میں اس کی طرف سے اسلم اعوان کو 8.3.99 میں لکھے گئے خط میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ہم اس پیسے کا ذکر اس لیے کر رہے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ اُس زمانے میں پارٹی اخبار بنڈل کی صورت یہاں وصول ہوتا تھا۔یہاں ہم ممبروں اور ہمدردوں کو یہ اخبار بیچتے تھے اور وصول رقم پارٹی ہیڈ کوارٹر روانہ کرتے تھے۔مطلب یہ کہ اخبار بیچنا ہماری سیاست کا حصہ ہوا کرتا تھا۔دلچسپ ہے کہ اس خط اور بنک چیک کے ملنے پر اسلم اعوان کی طرف سے یہ خط سرور آغا کو موصول ہوا:

******

محترم سرور

تسلیمات: خیریت موجود و مقصود

آپ سے 30-5-98 کو مبلغ -/3000 روپے کا چیک موصول ہوا تھا جس میں ایک اخبار کے پیسے ایڈوانس آئے تھے۔اس کے بعد جون، جولائی، اگست، اکتوبر، دسمبر 98 کے اخبار یعنی 5 ماہ کے اخبار آپ کو بھیجے ہیں۔اخبار شدید بحران کا شکار ہے آپ براہ کرم جلد از جلد اخبار کے پیسے ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔عین نوازش ہوگی۔

واسلام

محمد اسلم اعوان

******

تیرہ دن بعد یعنی 12-6-98 کو ملک اسلم اور اسلم اعوان کا مشترکہ خط یوں تھا:

کامریڈ محترم سرور

اسلام علیکم

آپ کا خط موصول ہوا آپ کے حکم کی تعمیل میں احمد نواز مری کے نام اخبار کی تین کاپیاں آئندہ شمارہ سے جانی شروع ہو جائیں گی۔

نیز کوئٹہ میں جن دوستوں کو اخبار براہِ راست بھیجا جا رہا ہے۔اِن کے پتہ جات کی لسٹ بھی ارسال ہے۔

ہمارے ہاں تو لوگوں کو دھماکوں (ایٹمی دھماکوں) کا بخار ہو رہا ہے لیکن آپ شاید اس سے محفوظ ہیں لیکن امید ہے کہ تنخواہوں میں کٹوتی اور بجٹ سے یہ بخار اترنا شروع ہو جائے گا۔

سب دوستوں کی طرف سے کامریڈ مری، کامریڈ خدائیداد اور دیگر تمام دوستوں کو ادب سے سلام عرض کر دیں۔

نوازش ہوگی۔

آپ کا مخلص

ملک محمد اسلم

اسلم اعوان

******

آیئے ہم پھر سی آر اسلم اور اُس کی سیاست کی بات جاری رکھتے ہیں۔مندرجہ ذیل سرکلر 22 جون 1998 کا ہے جس پر دستخط تو اسلم اعوان کے ہیں مگر لفافے پر پتہ سی آر اسلم کے ہینڈ رائٹنگ میں ہے۔

''محترم کامریڈ

تسلیمات

وزیراعظم نواز شریف نے 1972 کی زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کا اعلان کیا ہے۔اس اعلان پر اس وقت تک عمل نہیں ہوگا جب تک پاکستان کے کسان اکٹھے ہوکر لال جھنڈے اٹھا کر مطالبہ نہیں کرتے کہ:

* ملکیت کی حد فی کس کی بجائے فی خاندان مقرر کی جائے۔
* زرعی زمین کی حد ملکیت 25 ایکڑ فی خاندان مقرر کی جائے۔
* اور اس پر عملدرآمد 1972 سے کیا جائے۔
* زرعی اصلاحات کا قانون قومی اسمبلی سے منظور کرایا جائے۔
* زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کی نگرانی کسان کمیٹی سے کرائی جائے تاکہ محکمہ مال رشوت لے کر جاگیرداروں کی طرف داری نہ کر سکے۔

لاہور، پارٹی کی منظور کی گئی قرارداد بطور نمونہ حاضر ہے۔

آپ ہفتے میں ایک بار اسے قرارداد بنا کر مقامی اخبارات میں دیں۔

آپ کسانوں کی میٹنگ کر کے انہیں متحرک کریں اور کاروائی برائے پارٹی اخبار بھی ارسال فرمائیں۔

اسلم اعوان

سیکرٹری دفتری امور

''پاکستان میں ملکیت کی حد مقرر کرنے کے لیے دو مرتبہ زرعی اصلاحات کی گئیں۔ پہلے ایوب خان کے دور میں جب بڑے زمینداروں جاگیرداروں وغیرہ سے قیمتاً اراضی لے کر مزارعوں کو قیمتاً زمین دی گئی جس پر کسان کمیٹی کا مطالبہ تھا کہ ان سے 100 ایکڑ فی خاندان سے زائد اراضی بلا معاوضہ لی جائے اور مزارعین کو مفت تقسیم کی جائے''۔

''دوسری مرتبہ جب ذوالفقار علی بھٹو نے لینڈ ریفارمز ریگولیشن 1972 مارشل لاء ریگولیشن 115 کے ذریعے زرعی اصلاحات نافذ کیں اور زرعی زمین کی حد ملکیت 150 ایکڑ فی کس مقرر کر دی لیکن کسان کمیٹی کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا کہ مالکان سے بلا معاوضہ زمین لے کر مزارعوں میں مفت تقسیم کی جائے گی لیکن سوشلسٹ پاکستان پارٹی اور پاکستان کسان کمیٹی یہ مطالبہ کرتی رہی کہ حد ملکیت 100 ایکڑ نہری فی خاندان مقرر کی جائے جو بھٹو نے نہ مانا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاگیرداروں نے مال کے افسروں سے مل کر اپنی زرعی اراضی اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور نوزائیدہ بچوں کے نام پہ کر کے زرعی زمین اپنے پاس ہی رکھ لی اور اصلاحات کو ناکام بنا دیا''۔

پاکستان کسان کمیٹی اور پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کسان نمائندوں کی نگرانی میں کیا جائے تاکہ افسر شاہی اور جاگیردار مل کر انہیں ناکام نہ بنا سکیں۔اس مطالبے پر بھی غور نہ کیا گیا جس کے نتیجے میں جاگیرداروں نے بیوروکریسی سے ساز باز کر کے بڑے بڑے قطعات بچا لیے۔

قومی اسمبلی نے فروری 1977 کو زرعی اصلاحات کے ریگولیشن میں ترمیم کر کے زرعی زمین کی حد ملکیت ایک سو ایکڑ فی کس مقرر کر دی۔5 جولائی 1977 کو جنرل ضیا نے مارشل نافذ کیا اور اگست 1977 میں جنرل ضیا الحق نے سو ایکڑ زرعی اراضی کی حد یعنی 100 ایکڑ مقرر کرنے والا قانون منسوخ کر دیا اور چھوٹے کاشتکاروں کو جو رعایت دی گئی تھی وہ بھی صرف واپس نہ لی بلکہ عشر کے نام پر ایک نیا ٹیکس نافذ کر دیا۔

جنرل ضیا الحق نے شریعت کا قانون نافذ کیا تو فیڈرل شریعت کورٹ نے بھی یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ اسلام میں بے حد و حساب جائیداد رکھی جا سکتی ہے اور یوں زرعی اصلاحات پر عمل ختم کر دیا۔بیسیوں جاگیرداروں نے مقدمے کر کے اپنی ہزاروں ایکڑ اراضی زرعی اصلاحات میں سے نکلوا لیں اور دوبارہ قابض ہو گئے ہیں۔

''میاں نواز شریف اگر پاکستان کو خوشحال ملک بنانے میں مخلص ہیں تو انہیں قومی اسمبلی میں قانون بنوانا چاہیے جس میں زرعی اراضی کی حد ملکیت سو ایکڑ فی کس کی جگہ فی خاندان مقرر کی جائے اور

یہ قانون 1972 سے نافذ العمل ہونا چاہیے تا کہ جاگیرداروں نے جو اراضی محکمہ مال سے مل کر بچائی تھی یا بعد میں عدالتوں سے واپس کرالی ہوئی ہے بھی زرعی اصلاحات کے تحت تقسیم ہو سکے۔

''مطالبہ: حد ملکیت 100 ایکڑ فی خاندان مقرر کی جائے تمام حاصل شدہ زمین بلا معاوضہ لی جائے اور مزارعوں میں مفت تقسیم کی جائے۔ ساڑھے 12 ایکڑ تک مالیہ کی ادائیگی بند کی جائے۔عشر ختم کیا جائے۔ نیز تمام سرکاری اراضی جو مختلف سکیموں کے تحت مزارعوں کو دی گئی ہے کے مالکانہ حقوق مزارعوں کو دیے جائیں تا کہ وہ محکموں کے جبر سے آزاد ہو کر قومی ترقی میں حصہ ڈال سکیں''۔

******

اسی عرصے میں پارٹی کے اندر کے بحران نے ایک طرح سے شانت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ الگ گھروندا بنانے کے شوق پورے ہو گئے۔ پتہ چلا کہ دربدر لوگوں کے کیمپ میں رہ کر آپ'' درخشاں'' ہو ہی نہیں سکتے۔ تب بچھڑے دوبارہ آن ملنے کو سرک گئے۔ پسِ دیوار کھسر پھسر ہوئے۔ بوڑھا سی آر، مان گیا۔

اس سلسلے میں ہماری دسترس میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا ایک سرکلر 25 جنوری 1999 کا ہے۔ جس کے تسلسل میں سات اپریل 1999 کو یہ سرکلر جاری ہوا:

محترمی ومکرمی

تسلیمات۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ملک میں بائیں بازو کی سیاست کو عوامی سطح پر منظّم اور متحرک کرنے کے لیے پاکستان سوشلسٹ پارٹی، عوامی جمہوری پارٹی اور پاکستان نیشنل پارٹی کے ادغام کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور اُسے حتمی شکل دینے کے لیے 2 مئی 99 بروز اتوار دس بجے صبح ''انجل بنکوئٹ ہال'' میں پارٹی پروگرام و آئین کی منظوری کے ساتھ دیگر معاملات طے کیے جائیں گے۔ اس فیصلہ کے مطابق دیگر پارٹیوں اور افراد سے رابطہ کرنے اور کانفرنس کی تیاری کے کام کے لیے دو کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔ رابطہ اور تیاری کے کام کے لیے عابد حسن منٹو۔ یوسف مستی خان، بیگم نسیم شمیم، ملک محمد اسلم، فتح محمد، محمد علی بھارا، رازق بگٹی، حسن عسکری اور نعیم شاکر، اسی طرح دستاویز کی

تیاری کے لیے شاہ محمد مری، بی ایم کٹی اور اختر حسین پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی۔

اب تک بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کئی گروپوں اور افراد سے رابطہ کیا جا چکا ہے صوبائی رابطہ کمیٹیاں بھی بنائی جا چکی ہیں تا کہ وہ اپنے اپنے صوبہ اور حلقہ اثر میں دوستوں کو متحرک کر سکیں۔

آپ اپنے حلقہ میں تمام ساتھیوں سے رابطہ کریں۔ دوسری دونوں پارٹیوں کے دوستوں سے مل کر میٹنگ کریں اپنے حلقہ سے ڈیلیگیٹ نامزد کریں ان کی فہرست دفتر ارسال فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ دوستوں کو متحرک کریں۔ اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی کریں۔ اس انقلابی فریضہ میں آپ کی گہری دلچسپی کا اظہار ہی کامیابی کا ضامن ہے۔

امید ہے کہ آپ پوری تندہی سے اس فریضہ سے عہدہ برا ہونگے۔

خیر اندیش

ملک محمد اسلم

ممبر رابطہ کمیٹی''

یوں یکم مئی 1999 میں الگ الگ فرقوں کی موت ہو گئی اور اُس کی پارٹی دوبارہ ایک ہو گئی۔

ظاہر ہے پیرانہ سالی کے باوجود اس ''متحدی'' کنونشن میں سی آر اسلم کی موجودگی کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ میری ڈیوٹی انہیں کنونشن ہال میں لانے کی لگی۔ ملک محمد علی بھارا کے ساتھ میں جب وہاں پہنچا تو سی آر اسلم سے درخواست کی کہ ہمیں احساس ہے کہ آپ کی عمر اور صحت دیر تک ایک پبلک جلسے کی صدارتی کرسی پر بیٹھنے کی نہیں ہے مگر آپ کی موجودگی سے شرکا کی حوصلہ افزائی ہو گی اور ملک کے کونے کونے میں بکھرے ورکرز کو باور ہو گا کہ اِس اتحاد کو آپ اور آپ کے احباب کی حمایت حاصل ہے۔

بغیر کسی عذر کے سی آر اپنا واسکٹ پہن کر کار موٹر کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اور یوں ''نئی؟'' پارٹی کے نام میں ''نیشنل'' اور ''ورکرز'' شامل ہو گئے۔ سی آر اسلم اِس ''نئی'' پارٹی کا سرپرستِ اعلیٰ مقرر ہوا۔

تصانیف

سی آر کی تحریریں پڑھیں تو آپ فوراً زور سے کہہ دیں گے کہ یہ تو بہت سادہ ہیں۔اور جن لوگوں نے سی آر اسلم کے ساتھ سیاست کی وہ آپ کو اسی زور شور سے بتائیں گے کہ اس کی اپنی شخصیت اِن تحریروں ہی کی طرح بہت سادہ تھی۔

اس نے بہت کچھ لکھا۔۔۔۔فلسفہ پر، سیاست پر، حالاتِ حاضرہ پر، شخصیات پر، جلسوں میٹنگوں کی کارروائی پر، قرار دادیں، اداریے، عالمی تحریکوں پر، انقلابوں پہ مضامین ۔۔۔۔اگر مجموعہِ تصانیف مرتب ہوں تو یہ بلا مبالغہ بہت سی جلدیں بن جائیں گی۔اب تک محض چند چیزوں کو ہی کتابی شکل دی جا سکی ہے۔اس کی یہ شائع شدہ تصانیف درج ذیل ہیں:

1- جمہوری سماج میں عورت کا مقام

یہ ایک کتابچہ ہے جو سی آر اسلم نے تحریر کیا تھا۔سی آر اسلم شاید برصغیر میں عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا حامی اور طرفدار تھا۔کتابچے میں اُس نے واضح کیا کہ اِس نصف آبادی کو نظر انداز کر کے معاشرے میں کسی قسم کی اصلاح و ترقی ممکن نہیں۔

تقریباً اپنی ہر تحریر کی طرح اس تصنیف میں بھی سی آر نے سماجی تعصّبات کی معاشی بنیاد کا کھوج لگایا۔اس نے قدیم اشتراکی سماج، قبائلی دور، فیوڈلزم اور سرمایہ داری نظام تک انسانی ارتقاء

کے ہر مرحلے پہ عورت کے استحصال کے اسباب اور اس کی صورتیں مدلل انداز میں بیان کیں۔

وہ عورت کی نجات کے لیے دو شرائط پیش کرتا ہے: محنت کے استحصال کا خاتمہ، اور پیداواری عمل میں عورت کی شرکت۔سی آر اسلم تعلیم، صحت، روزگار جیسی باتوں کا ذکر کرتے کرتے جاگیرداریت کے خاتمے تک بہت تفصیل سے عورت کی نجات کے طریقے بتاتا ہے۔

2- اقبال کا پیغام میری نظر میں

ہمارے ملک میں فکرِ اقبال کے ساتھ دانشوروں نے جس ہلکے اور بازاری انداز میں سلوک کیا ہے وہ واقعی بہت تکلیف دہ ہے۔اپنے اِس کتابچے میں سی آر اسلم انہی مغالطہ سازوں سے نمٹا ہے۔سی آر اسلم نے اقبال کے شعوری سفر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ اقبال نے طالب علمی کے دور میں وہ کچھ پڑھا جو اُس زمانے میں پڑھایا جاتا تھا۔وہ بورژوا نظریات اور خیالات تھے جو ملکی زندگی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے تھے۔مگر اس کے باوجود اقبال نے انگریزوں کی غلامی کو محسوس کیا، دیہات میں جاگیرداروں اور ان کے اتحادیوں کا جبر ناپا اور ملّاؤں پیروں کی ''روحانی کرامات'' کے جال کی مضبوطی کا مطالعہ کیا۔پھر جب اقبال اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ گیا تو وہاں اسے صنعتی معاشرے میں سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں کا غیر انسانی استحصال نظر آیا۔چنانچہ وہ سرمایہ داری نظام کا بھی مخالف ہو گیا۔اقبال سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری کی چیرہ دستیوں کے خلاف شاعری کرنے لگا۔اقبال نے روسی انقلاب کو نغمہ بیداریِ جمہور سے تعبیر کیا۔

اپنی اس تصنیف میں سی آر اسلم نے اقبال کو انسانی سربلندی کی آواز قرار دیا۔اقبال سائنسی علوم کا زبردست حامی تھا۔سی آر نے اقبال کے اشعار کے ذریعے اقبال کو مزور انقلاب کا حامی ثابت کیا۔سی آر اسلم کہتا ہے کہ اقبال کے کلام میں متضاد خیالات پائے جاتے ہیں مگر وہ اس کا سبب خود اس زمانے کے ہندوستانی سماج میں موجود بے شمار تضادات کو قرار دیتا ہے۔لیکن اقبال کے کلام میں سامراج، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف مستقل اور مسلسل بے باکانہ اظہار موجود ہے کہ اس نظام کو ڈھا کر نیا نظامِ زندگی تعمیر کیا جائے۔اس بات کا اظہار بھی موجود ہے کہ یہ کام

صرف مزدور کر سکتے ہیں۔

سی آر اسلم نے عقیدوی حیثیت اختیار کرنے والے اقبال کے مزدور تحریک میں افادیت کے پہلو کو اجاگر کیا۔ اُس نے اقبال کے فلسفہ میں زگ زیگ اور تضادات کی تفصیل میں جانے سے احتراز کیا۔

3-عالم اِسلام مبتلائے زوال کیوں ہے؟

مندرجہ بالا موضوع پر 1971ء میں طلبا کی ایک تنظیم کی طرف سے ایک مذاکرہ منعقد کیا تھا۔ سی آر اسلم کو بھی اس مذاکرے میں بولنے کی دعوت دی گئی۔ اس نے جو مقالہ پڑھا تھا، اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ مذاکرے کے منتظمین نے اس بات پر زور دینے کا کہا کہ کیا امّت کے زوال کا باعث مذہب سے بغاوت ہے یا اس کی پابندی؟۔ اگر اس کا باعث مذہب سے بغاوت ہے تو مذہب سے باغی قومیں کیوں اس قدر ترقی کر رہی ہیں؟۔

سی آر اسلم نے سب سے پہلے ''اسلام سے کیا مراد ہے؟'' کے بارے میں بات کی جس کے بعد بہت ہی واشگاف الفاظ میں اس فقرے سے بات شروع کی ''میں شروع ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک عالمِ اسلام کے زوال کا سبب نہ مذہب کی پابندی ہے اور نہ مذہب سے بیگانگی ہے۔ بلکہ اس کے اسباب معاشی اور سیاسی ہیں''۔ اس نے تاریخی و جدلیاتی مادیت کے ذریعے اپنی بات مدلل انداز میں بڑھاتے ہوئے جاگیرداری نظام کو زوال پذیری کا سب سے بڑا سبب قرار دیا۔ اس نے زور دیا کہ جب تک سامراجی قرضے منسوخ نہیں کیے جاتے اور جاگیرداری نظام ختم نہیں کیا جاتا، ''اسلامی'' ممالک زوال کے گرداب میں پھنسے ہی رہیں گے''(20)

4-اکتوبر انقلاب

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کراچی کی جانب سے سی آر اسلم کے شائع کردہ اس پمفلٹ میں 1917 سے لیکر 1974 تک کے سوویت یونین کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس میں ان تمام

اقدامات کا ذکر ہے جو اس انقلابی حکومت نے مذکورہ 57 برس میں اٹھائے۔ بالخصوص ''اکتوبر انقلاب اور قوموں کا حقِ آزادی'' نامی ایک سرخی تلے دراصل اس مسئلے پر اپنی لائن بھی وہی قرار دی جو کہ سوویت پارٹی نے اختیار کی تھی۔ سی آر اسلم نے کہا کہ اکتوبر انقلاب کی کامیابی کے بعد ہی لینن نے تمام قوموں کے حقِ آزادی کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور روس میں شامل تمام چھوٹی قوموں کو الگ الگ اپنی ریاستیں بنانے کا عملاً حق دے دیا جس کے سبب دنیا بھر کے محکوم اور نیم محکوم ملکوں کے عوام کے دلوں میں اپنی قومی آزادی کیلئے نئی تڑپ، نئی لگن اور نیا جوش پیدا ہوا اور تمام نو آبادیاتی ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکیں زور پکڑ گئیں۔

اکتوبر انقلاب سے قبل کا روس فی الحقیقت قوموں کا جیل خانہ تھا۔ وہ ایک ایسا ملک تھا جس میں مختلف قوموں اور قومیتوں کے وہ لوگ آباد تھے جو معاشی ترقی کی مختلف سطحوں پر تھے۔ لینن نے روس میں تہذیبوں کی ترقی کے لیے مساوی مواقع مہیا کیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں کے درمیان جو تعصّبات حائل تھے وہ ختم ہو گئے۔

پاکستان جیسی کثیر القومی ریاست میں قوموں کا سوال ہمیشہ سے متنازعہ اور پیچیدہ رہا ہے۔ ایک بدترین مرکز پرست اکثریت کے اندر چھوٹی اور محکوم قومیں اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے روزِ اول سے برسر پیکار رہی ہیں۔ پاکستان کے کمیونسٹ اپنے فطری اور پیدائشی فریضے کے بطور قوموں کی برابری اور حقِ خود حاکمیت کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ سی آر اسلم اس عمل میں مستقل مزاجی کے ساتھ پیش پیش رہا۔ وہ تحریر کرتا ہے:

''پاکستان ایک نو آزاد وفاقی اور جمہوری ملک ہے۔ 1973ء کے آئین میں وفاق اور یونٹوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی گئی ہے۔ آئین میں دی گئی اختیارات کی اس تقسیم میں بوقت ضرورت ردو بدل کر کے عوام کے حق خودارادی کو وسیع اور مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ آئین میں تبدیلی کا یہ عمل سیاسی ہے۔ یونٹوں کے اختیارات میں وسعت کا مسئلہ بھی سیاسی ہے اور انہیں سیاسی عمل ہی سے طے کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ یونٹوں کے اختیارات کو وسیع کرنے کے سیاسی عمل کو وفاق اور یونٹوں کے درمیان محاذ آرائی اور ٹکراؤ قرار دینے کی صورت میں عوام کا اتحاد بکھر رہا ہے اور ان کا

شعور شاونزم کا شکار ہو رہا ہے''۔(21)۔سی آر اسلم لکھتا ہے:

''قومی مسئلے پر پرولتاری پارٹی کا عالمی نظریہ بین الاقوامی ہے قوم پرستی نہیں۔ انقلابی جدوجہد میں یہ ترقی پسند قوم پرستی کی حمایت کرتی ہے اور رجعت پرست قوم پرستی کی مخالفت کرتی ہے۔اس کو ہمیشہ اپنے اور سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ لینا چاہیے اور کبھی بھی سرمایہ دارانہ قوم پرستی کا شکار نہ ہونا چاہیے۔(22)

5-علم المعیشت

پولیٹیکل اکانومی یا علم المعیشت مارکسزم کی توجہ کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے۔تین بڑی بڑی جلدوں پر مشتمل مارکس کی مشہورِ زمانہ تصنیف ''کیپٹل'' نے گذشتہ دوسو برس سے دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھا ہے۔

سی آر اسلم نے اپنی کتاب ''علم المعیشت'' میں اسی سائنس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ اور ہر جگہ پاکستان کی صورتحال سے مثالیں دے دے کر کتاب کو عام فہم اور دلچسپ بنایا۔ ہمہ وقت کم پڑھے لکھے کسانوں اور مزدوروں کو شعور دیتے رہنے والا سی آر اسلم، بہت سادگی سے اس مشکل ترین موضوع کو بیان کرتا ہے۔ یہ کتاب بقول سید مطّلبی فریدآبادی ''سوشلزم کے قیام کی جدوجہد سے وابستہ یا اس کے برپا ہونے کے خواہشمند سیاسی وسماجی کارکن یا شائقینِ معاشی سماجی اور سیاسی اداروں کے نشوونما اور انسانی سماج کے ارتقا کی تاریخ سے باخبر'' (23) ہونے کے لیے بہت مفید ہے۔

126 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں علم المعیشت کے عام تعارف کے بعد مندرجہ ذیل موضوعات پر بحث کی گئی ہے: قدیم اشتراکی نظام پیداوار ،غلام داری سماج کا نظام پیداوار، جاگیرداری کا نظام پیداوار، سرمایہ داری کا نظام پیداوار اور معاشی بحران۔ ہر باب کے آخر میں ''خلاصہ'' کے عنوان سے اُس باب کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو میں اس نوعیت کی یہ واحد تصنیف ہے۔عام فہم بھی ہے اور پرتاثیر بھی۔ سیاسی ورکرز کے لیے تو سٹڈی سرکل کی چیز ہے۔

یہ کتاب دوسری بار 2005ء میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوچکی ہے۔تیسری بات یہ کتاب سنگت اکیڈمی ہی کی طرف سے 2017 میں شائع ہوچکی ہے۔

6-اس عہد کی نئی حقیقتیں اور اس کے تقاضے

سی آر اسلم کا لکھا یہ کتابچہ ضیا کی رجعتی اور بنیاد پرست آمریت کے اختتام اور انتخابات کے نتیجے آنے والی نئی حکومت کے دوران شائع ہوا تھا۔اس میں عالمی صورتحال کا بہت جامع انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔اور اس تناظر میں پاکستان کی سیاسی معاشی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں اس نے ملک میں جمہوریت اور روشن فکری کے بارے میں سات سوالات مرتب کر کے عوام اور دانشوروں کے سامنے پیش کر دیے تا کہ ان پر وسیع بحث مباحثہ ہو۔ یہ سوالات اس قدر دیرپا ہیں کہ اکیسویں صدی کے پاکستان کے لیے بھی ان کی اہمیت اسی قدر زیادہ ہے۔اور آج بھی انہی پر بحث کرنے اور ان پر سیاست کا رخ متعین کرنے کی اشد ضرورت ہے۔وہ سوالات یوں ہیں:

1- کیا پاکستان کا موجودہ جمہوری اور سیکولر عمل مستحکم اور ناقابل واپسی ہے؟۔

2- کیا فوج نے قومی اسمبلی جو عوام کے اقتدار اعلی کی نمائندہ ہے کی بالادستی تسلیم کر لی ہے؟۔

3-اگر ایسا نہیں ہے تو کیا اس صورت میں بھی پاکستان کے جمہوری اور سیکولر عمل کو مستحکم کیا جاسکتا ہے اور اس کو ناقابل واپسی بنایا جاسکتا ہے؟۔

4-اگر اس جمہوری اور سیکولر عمل کو مستحکم کیا جاسکتا ہے تو کیا عوام کے تعاون اور سرگرم جمہوری عمل اور شعوری جدوجہد کے بغیر کیا جاسکتا ہے؟۔

5- کیا پاکستان کی لیفٹ، سیکولر اور جمہوری پارٹیوں اور مارکسی ترقی پسندوں اور جمہوریت پسند دانشوروں کے علاوہ کوئی اور عناصر جمہوریت کو درپیش خطرات سے آگاہ کرنے اور انہیں سچ بتانے کا حوصلہ رکھتے ہیں کہ ان کے ملک کی جمہوریت ڈانواں ڈول ہے اور ان کے اقتدار اعلیٰ کے چھن جانے کا حقیقی خطرہ موجود ہے؟۔

6- کیا یہ درست ہے کہ اس وقت عوام کو سچ بتانے، انہیں جمہوریت کو لاحق خطرات سے

آ گاہ کرنے ،اورانہیں حرکت میں لانے سے بڑا کوئی اورانقلابی کام نہیں ہے؟۔

7- کیا موجودہ عالمی صورتحال ملک کے اندر جمہوری تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے سازگار فضا فراہم کرتی ہے؟(24)

7- خواتین کے بارے میں لینن کے خیالات

سی آر اسلم نے نظریاتی لحاظ سے ایک خوبصورت تحریر کا انتخاب کر کے اس کا ترجمہ کیا۔ یہ دراصل جرمن کمیونسٹ خاتون محترمہ کلارازیٹکن کی تحریر ہے۔ کلارازیٹکن عالمی مزدور تحریک کی راہنما تھی ۔ اس نے عالمی خواتین تحریک کو منظّم کیا اور برسوں تک اس کی راہنما رہی۔ یہ وہی کلارازیٹکن ہے جس نے 1910 میں ایک بین الاقوامی فورم میں سفارش کی تھی کہ آٹھ مارچ کو محنت کش عورتوں کا بین الاقوامی دن منایا جائے تا کہ جہاں کہیں عورتوں کے خلاف ناانصافیاں، جبر و استحصال اوران کے حقوق کی نفی ہو وہاں اس دن عورتیں پوری دنیا میں اپنے حقوق کے لیے متحد ہو کر آواز بلند کریں اوراس طرح حکومتیں بھی عورتوں کے مسائل کی طرف توجہ دیں۔کلارازیٹکن کی اس سفارش کو سراہا گیا اور 8 مارچ عدل وانصاف پر مبنی معاشرہ کی تشکیل کے لیے عورتوں کی جدوجہد کے دن کے طور پر منایا جانے لگا۔کلارازیٹکن نے خواتین کی تحریک کے بارے میں لینن سے کئی بار انٹرویو لیے۔اس نے لینن کے ساتھ اپنی اس گفتگو کو اپنی کتاب ''میری یادداشتیں'' میں تفصیل سے بیان کیا۔

سی آر اسلم نے کلارازیٹکن کی اسی کتاب ''میری یادداشتیں'' میں سے اُس حصے کا ترجمہ کیا ہے جو خواتین کے مسائل اور حقوق سے متعلق ہے۔لینن نے اُس زمانے میں عورتوں کے بارے میں موجود بورژوا خیالات کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔لینن نے جنسی سوالات، ازدواجی زندگی، عورتوں کی تنظیم اور عمومی انقلابی تحریک میں عورتوں کے کردار پر ایک مارکسسٹ انداز میں گفتگو کی۔

سی آر اسلم کا انتخاب بروقت ہے اور ہمہ وقت اہمیت کا حامل۔ترجمہ بہت رواں اور سہل ہے۔

8- جدلی وتاریخی مادیت کے اصول

یہ فلسفہ کے بہت پیچیدہ شعبے ہیں۔اس ملک میں میں نے ایک دو اشخاص دیکھے جنہیں فلسفے کے تاریخی اور مادی جدلیات کے بارے میں علم تھا۔ جسے وہ بیان بھی کر سکتے تھے اور سماج میں اس کا اطلاق بھی کر پاتے تھے۔سی آر ان میں سے ایک تھا۔اس کا ایقان تھا کہ صرف اور صرف جدلی مادیت کے علم کی مدد سے ہی ارتقا اور تبدیلی کے قوانین کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

جبکہ سی آر اسلم کا واسطہ مزدور طبقے کی تدریس سے تھا۔ ناخواندہ یا نیم خواندہ لوگوں کی تربیت اور تعلیم نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس دقیق سائنس کو سادہ اور عام فہم انداز میں محنت کشوں کو ذہن نشین کرادے۔ چنانچہ اس نے 104 صفحوں کی کتاب لکھ ڈالی۔اس کی یہ کتاب مندرجہ ذیل عنوات پر مشتمل ہے:

فلسفے کا بنیادی سوال ۔ جدلی ''تاریخی'' مادیت کے راہنما اصول۔ جدلی تاریخی مادیت کے اصولوں کی تفصیلی وضاحت (اجتماعِ ضدین، تضادات کی باہمی کشمکش، حالات وشرائط اور تبدیلی کی بنیاد، معاندانہ تضادات، غیر معاندانہ تضادات، بنیادی اور غیر بنیادی تضادات، پاکستانی سماج کے بنیادی تضادات، عالمی سطح پر تضادات) ،مافیہ اور ہیئت، سبب اور نتیجہ، ضرورت اور اتفاق، امکان اور حقیقت، علم اور عمل کا نظریہ، تاریخی ضرورت اور آزادی، جبر و اختیار کا مسئلہ، سماج کی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ، سماجی ترقی کی فیصلہ کن قوت عوام ہیں، تاریخ میں فرد کا رول، طبقات اور طبقاتی کشمکش، سرمایہ داری نظامِ پیداوار، طبقاتی کشمکش، مارکسی پارٹی کی ضرورت، عالمی معاشی بحران ،غیر طبقاتی سماج کا قیام، قبیلہ قومیت اور قوم ، ریاست کیا ہے، سماجی انقلاب کیوں اور کیسے برپا ہوتے ہیں، سماجی انقلاب کی متحرک طاقتیں۔

اس عہد کی سب سے بڑی سچائی کو سادہ انداز میں لکھنا بہت بڑی عملی مشکل پر قابو پانا ہے۔ذرا یہ فقرہ دیکھیے ''یہ دنیا پہلے سے تیار اور طے شدہ افعال کا منبع نہیں ہے بلکہ یہاں ہر آج طے کرتا ہے کہ آنے والا کل کیا ہوگا''۔اور سی آر اسلم ساری زندگی اس عملی مشکل کا سامنا کرتا رہا اور خود

ہی حل کرتا رہا۔ اپنی تحریروں کی مدد سے اس نے ہزاروں ضرورت مند انسانوں کے دماغوں کو منور کر دیا۔

9- سوشلزم کیا ہے۔ (کتابچہ)

10- نور محمد ترہ کی کے حالات زندگی۔ (کتابچہ)

11- پاکستان میں سوشلسٹ تحریک۔ (کتابچہ)

12- سی آر اسلم کے مضامین (جلد نمبر1)

سی آر اسلم نے آخری دس برسوں میں ہاتھ سے لکھے گئے اپنے مضامین کے چھ رجسٹر میرے حوالے کئے تھے۔ میں نے پوچھا تھا ان کا کیا کروں؟ کہا، جو مرضی آئے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اُس کی مرضی انہیں کتابی شکل میں چھپوانے کی ہے۔ یہاں مگر مسئلہ یہ تھا کہ کتابوں کی اشاعت اچھا خاصا پیسہ مانگتی ہے۔ اس کے بعد کا بڑا معاملہ کتابوں کی مارکیٹنگ یا کھپت کا ہوتا ہے۔

میں اسی مخمصے میں رہا۔

پھر ہوا یوں کہ ایک پبلشر اُسے چھاپنے پر تیار ہو گیا۔ یوں رجسٹروں کے اِن مضامین میں سے ایک جلد تیار ہو کر چھپ سکی ہے۔ اس کا نام ہے ''سی آر اسلم کے مضامین''۔ یہ جلد اب ختم ہو چکی ہے۔ مارکیٹ میں نہیں ہے۔ دوبارہ چھاپنا پڑے گا۔

ان مضامین میں بڑے بڑے الفاظ اور گھن گرج والے ثقیل جملے موجود نہیں ہیں۔ سی آر اسلم عام آدمی کے لئے لکھتا تھا۔ اسی کے شعور کی سطح تک اتر کر اسے ساتھ لے کر بلند ترین نظریات تک لے جاتا تھا۔ روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہوئے وہ اپنی تحریر میں مثالیں دیتا تھا، ضرب الامثال ڈالتا تھا، سیاق و سباق جوڑتا تھا۔ وہ قاری کے دل دماغ کو ہمیشہ جگائے رکھتا تھا۔ اُسے حیران کرتا تھا، اُس سے بلواتا تھا، اس سے لکھواتا تھا اور اُسی سے اُسی کو پختگی کی سند دلوا کر آگے

بڑھتا تھا۔

نتیجہ یہ کہ سی آر اسلم کا ہر ساتھی بذاتِ خود ایک اچھا خاصا دانشور ہوتا تھا۔ اس لئے عام مشاہدے کی بات ہے کہ جہاں جہاں سی آر کا ایک آدھ کامریڈ ہو گا وہیں وہیں سوشلزم کا جھنڈا ہو گا ۔۔۔۔ سربلند جھنڈا، تازہ بہ تازہ جھنڈا، سرخ و نمایاں جھنڈا۔

13- سی آر اسلم کے مضامین (جلد نمبر2)

تین رجسٹروں کے مواد پر مشتمل یہ جلد پبلشنگ کے لیے تقریباً تیار ہے۔ اس میں 1998 اور 1999 میں لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ اِن میں کچھ مضامین روزناموں میں چھپے، کچھ ہفت روزہ عوامی جمہوریت میں۔

اُن سب میں اکیسویں صدی کے لیے بصارت اور توقعات و امکانات کا تذکرہ ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی بین الاقوامیت ہے۔ مزدوروں کسانوں عورتوں یعنی عام انسانوں کی بہبود کے راستے کا انتخاب اور اُس کی وضاحت ہے۔ انداز وہی سٹڈی سرکل والا ہے۔ عام فہم فقرے، سادہ زبان اور انتہائی دور بین نقطہ نگاہ۔

نیکی کرنے والا انسان

ایک بلوچی شعر کا ترجمہ ہے کہ: میں نے زندگی ناپ کر دیکھی ہے۔اس کی کل لمبائی دو بالشت ہے۔سی آر اسلم اپنی اسی دو بالشتی زندگانی بِتا کر وفات پا گیا۔مگر وہ تاریک راہوں کی تاریکی میں کچھ کچھ روشنی گھول کر گیا۔ جاگیرداری جیسے بے فیض سماج میں وہ ایک آبرومندانہ زندگی جیا۔وہ ایک نیک شخص تھا، خاموش اور مستقل مزاجی کے ساتھ نیکی کرتا رہا۔کبھی دیکھو تو مظلوموں مجبوروں کی تنظیم بنا رہا ہے، کسی کو جغرافیہ سمجھا رہا ہے، کہیں علمِ معیشت پہ عام لوگوں کو لیکچر دے رہا ہے۔عام آدمی کے لئے اخبار نکال رہا ہے، کسی کی شادی کروا رہا ہے، کسی کو ضمانت دلوا رہا ہے۔اور کسی مسافر کی رہائش کا بندوبست کر رہا ہے..... پاکستان کے عوام بالعموم اور اُس کے واقف کار بالخصوص کسی نہ کسی شکل میں اس کے مقروض ہیں۔

پاکستان بالعموم اور صوبہ پنجاب بالخصوص سوشلسٹ نظریات کے پھیلانے اور تنظیم ساز کے بطور اگر کسی ایک شخص کا مقروض ہے تو اس شخص کا نام سی آر اسلم ہے۔ ہزار مشکلات کے باوجود وہ اپنا پیغام اور تنظیم عملی طور پر ایک ایک سب تحصیل تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ایسی صبر آزما ذہن سازی کہ اُس سرزمین پر عام انسانی معیار پہ اگر کوئی قابلِ بھروسہ شخص ڈھونڈنا ہو تو وہ سی آر اسلم کا شاگرد ہوگا۔

جنوبی ایشیا میں شعور کا یہ سفیر سب لکھاریوں سے زیادہ بولا اور اس نے سبھی ''ابوالکلاموں'' سے زیادہ لکھا۔وہ بات زور زور سے کہتا اور بار بار دھرا کر کہتا۔ جیسے میں ہاؤس جاب کے وقت کسی قبائلی مری کو تین قسم کی گولیاں اور دو قسم کے شربت استعمال کرنا سکھا رہا ہوں۔ مگر اس نے نہ کبھی تصنیف جتائی اور نہ تقریر پہ اترایا۔

سی آر اسلم نے جنوبی ایشیا کے سارے سیاستدانوں میں سب سے زیادہ سفر کیے، ملک کا کوئی ایسا گوشہ نہ ہوگا جہاں اس کی بنائی ہوئی پارٹی یا طبقاتی تنظیم موجود ہو اور سی آر وہاں نہ گیا ہو۔مگر نہ کبھی اس کے پیر جلے، نہ دل پھپھولے ہوا۔ جیلوں ریلوں میں زندگی گزارنے والے اس شخص نے پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں کسی بھی سیاح، سیلانی، جوگی اور سیاسی کارکن سے زیادہ سفر کیے۔سوشلزم کی تبلیغ، تنظیم اور نشوونما کی خاطر اس نے اس دھرتی کے چپے چپے کو سجدہ گاہ بنائے رکھا۔ اونٹ، ٹرک، کشتی، بس، کار، ریل گاڑی اُس جام درک کے ''سیاہ'' نامی گھوڑی بنے رہے۔ پاکستان بھر میں سوشلزم کا ایک ایک غنچہ اس کی باغبانی کا حسین گواہ ہے۔

سی آر اسلم نے بیرونی ممالک کا محض ایک آدھ سفر ہی کیا تھا اور وہ بھی مشرقی یورپ کے ممالک کا۔ وہ سوشلزم کی خاطر ہی وہاں گیا۔۔۔۔قید خانے بھی سوشلزم کے نام سے، تہہ خانے بھی اُسی کے نام پہ۔سی آر اور سوشلزم سفر و حضر کے ساتھی، طعام و قیام کے بیلی اور، دُکھ سکھ کے رفیق رہے۔

ان دوروں اور لوگوں سے وسیع میل جول کے نتیجے میں اُسے ملک کے ہر حصہ کے لوگوں کے سماجی و معاشی حالات کا علم تھا۔ وہاں کی تاریخ، ادب اور موسیقی کی معلومات تھیں۔ وہ ہمیں اِن مقامات کے بارے میں اپنی گفتگو میں معلوم دار کرتا جاتا۔ندی نالوں تک، فصل و اناج تک، منڈی مارکیٹ تک۔ اور وہ ایسا مجلسی شخص تھا کہ انہی علاقوں کے بارے بولتے بولتے، سیاحت کراتے کراتے مارکسزم پر جا تا تھا۔

سی آر اسلم کی لغت میں ''I am'' کا لفظ موجود ہی نہیں تھا۔اسے علم و فن والے غرور کا عام مرض کبھی نہ لگا۔اسی لیے تو اُس آدمی نے کبھی بھی اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا اور برگزیدہ نہ

سمجھا، کبھی سرپرستانہ انداز اختیار نہ کیا۔ ہمیں یاد ہے کہ اُس کے ہم عصر کبھی ''بزرگ راہنما'' بنتے، کبھی مرکزی لیڈر، کبھی استاد، اور کبھی عظیم لیڈر۔ ''میں، میں'' کرتے تھکتے نہ تھے۔ ہر انٹرویو، جلسہ اور گفتگو میں ''آئی ایم'' کے جلوے ہوتے۔ مگر سی آر اسلم کبھی بھی اپنے بارے میں نہیں بولتا تھا، وہ تو تحریک کی بات کرتا تھا۔ اس نے کوئی آٹو بائیوگرافی نہیں لکھی۔ کبھی اپنے باپ دادا، اپنے بچپن اور ذات کے بارے میں کچھ نہ لکھا۔ اُس نے اپنے کسی مضمون، کسی انٹرویو میں اپنی نجی زندگی اور آل اولاد کے بارے میں کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ خودستائش کا الٹ تھا وہ۔

لاکھوں لوگ کسی نہ کسی حوالے سے اس سے فیض یاب ہو چکے لیکن اس کے باوجود وہ نہ تو ''مہا'' کہلایا، نہ مہان، نہ عظیم، اور نہ ہی کسی کو ''استادوں کا استاد'' کہنے کا موقع دیا۔ ایک عبداللہ جان تھا جو چرانوے برس کی عمر کو پہنچ کر، خود پہ فالج لگا کر، سی آر کو ''استاد'' کہنے کی گستاخی کر جاتا تھا۔ مگر اُسے کوئی ٹوکتا اس لئے نہیں تھا کہ سی آر اسلم یہاں تھا نہیں، سینکڑوں میل دور لاہور میں رہتا تھا۔ اُس کے وسائل کم تھے اور عبداللہ جان سے وابستہ لوگوں کے ساتھ اس کے وہ روابط نہیں رہے تھے جو ہوا کرتے تھے۔ اس لئے اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ جمالدینی صاحب اُسے استاد کا درجہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ورنہ اُس نے ''پیٹی بورژوا خود پرستی'' جیسی ایک دو مشکل اصطلاحات کے تحت اپنے ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' میں ٹکا کے دو تین مضمون لکھ مارنے تھے۔۔۔ پتہ نہیں اس دریا کو کس مست توکلی نے مدھم چلتے رہنے کی دعا دی تھی۔ کہ اس کی تعلیمات کے اثرات تو نظر آتے ہیں، وہ خود نہیں۔

سی آر اور اس کے قریبی ساتھی (محمود احمد، خواجہ رفیق، ملک اسلم، اسلم ریڈیو، محمد علی بھارا، کنیز فاطمہ) سوشلزم میں سوئچ آن سوئچ آف نہیں کرتے تھے۔ انہیں عام انسان سے تھکاوٹ، کراہت نہ ہوتی تھی۔ ان کے اٹھک بیٹھک اور شکل و برتاؤ سے افسری، بڑائی نہیں نظر آتی تھی۔ اس قدر عام کہ عام آدمی اُن سے ملنے اور گفتگو کرنے میں کمفرٹ محسوس کرتا تھا۔ وہ خود بھی قابلِ رسائی آدمی تھا اور اس نے اپنے ساتھیوں سنگتوں کو بھی اپائنٹمنٹ سے ملاقات دینے والا رہنے نہ دیا تھا۔ اپنی ساری مشکلات اور ذاتی پریشانیوں کے باوجود وہ ہمہ وقت افتادگانِ خاک کو سر اٹھا کر

چلنے کے قابل بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔

سی آر اسلم چونکہ مڈل کلاس والی عام ضروریات سے بے نیاز تھا اس لیے وہ ہمیشہ آرام سے رہ سکتا تھا۔ اُسے میں نے دھوبی سے گھنٹوں باتیں کرتے سنا جہاں کوئی فلسفہ، اصطلاح اور نازک خیالیاں نہ تھیں۔ اَن پڑھ دھوبی کی سطح کی عام دنیاوی باتیں تھیں۔ باتوں باتوں میں البتہ وہ اپنے نظریات کی شربت کے گھونٹ اسے پلاتا جاتا۔ مگر وہ بھی عام فہم انداز میں، عوامی بولی میں۔ میں نے اُس دھوبی کو جدلیاتی مادیت سے لے کر ایئر کنڈیشن کے ہوا ٹھنڈا کرنے کی سائنس کے بارے میں اپنی عام بولی میں ٹھیک ٹھیک باتیں کرتے کئی بار سنا۔

وہ دوسروں کی بات نہایت تحمل اور دلچسپی سے سنتا۔ پھر آرام آرام سے بات کرتا جاتا۔ عام آدمی عام آدمی سے موضوع فکس کر کے تو مجلس نہیں کرتا ناں!۔ عام آدمی کو تو تعارف کی بھی ضرورت نہیں ہوتی!۔

سی آر اسلم انتہائی سادہ مگر سائنسی زندگی گزارتا تھا۔ لباس، خوراک اور زندگی کے دوسرے امور میں ہائی جی ین کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتا۔ صبح سویرے باغ جناح کی سیر کبھی قضا نہ کرتا۔ وہاں شہر کے مختلف حصوں سے اس کے ہم عمر بوڑھے بھی آجاتے۔ سب نے یہ ایک عادت سی بنا لی تھی۔ ورزش نما سیر بھی ہوتی اور مختلف پارٹیوں اور نظریات سے وابستہ یہ ''انجمن بزرگان'' چیونٹی کی چال چلتے ہوئے سیاسی اور فکری بحثیں بھی کرتے۔ وہ آپس میں حالات حاضرہ کا تبادلہ کرتے، اور یوں سارے دن اپنے اپنے حلقہِ اثر میں گفتگو کے لیے بہت سارا توشہ جمع کر کے لوٹتے۔

سحر خیز سی آر صبح کی سیر کے بعد سورج نکلتے ہی اپنی میز پر آن موجود ہوتا۔ بی بی سی اور آل انڈیا کی خبریں تبصرے ایک کنگ سائز ریڈیو پر سنتا جو بجلی پہ لگا ہوتا تھا۔ یہ مہیب جسامت ریڈیو صرف دو سٹیشن چلتا تھا، بی بی سی اور آل انڈیا ریڈیو۔ میں نے اُس پہ کوئی اور سٹیشن کبھی نہیں سنا۔

اُسے بہت سے اخبار اعزازی طور پر آتے تھے۔ وہ انہیں تفصیل سے پڑھتا۔ اردو میں تو وہ بالخصوص نوائے وقت پڑھتا تھا جو کہ اس کا اپنا کھڑا کیا ہوا دشمن اخبار تھا۔ یہ اخبار اُس کے

نظریات کا سنگین ترین مخالف تھا۔ اسی لیے وہ اسے غور سے پڑھتا۔ کوئی جواب طلب نکتہ ہوتا تو اس پہ اپنے ہفت روزہ اخبار ''عوامی جمہوریت'' میں مضمون لکھ لیتا۔ وگرنہ اپنے اور اپنے ہم خیال لوگوں کے خلاف چھپے ہوئے طنز وطعن پڑھ کر آگے بڑھتا اور دوسرے اخبارات پڑھتا۔ وہ انگریزی اخبارات ڈان، فرنٹیئر پوسٹ، دی نیشن، اور دی نیوز ضرور پڑھتا تھا جن میں اردو کی بہ نسبت بین الاقوامی خبریں اور مضامین زیادہ شائع ہوتے اور اردو کی بہ نسبت زیادہ آزادی سے ملکی امور کی باتیں چھپی ہوتیں۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا ہفت روزہ ''پیپلز ڈیموکریسی''، کیوبا کا ہفت روزہ ''گرانما'' اور آسٹریلیا کی کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ''گارڈین'' بھی اُس کے پاس آتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام سوشلسٹ ملکوں کے سفارتخانوں کے بلٹن اس کو ڈاک کے ذریعے ملتے تھے۔ دنیا کی کئی ٹریڈ یونینیں اپنے ترجمان اخبار اُسے بھیجتی تھیں۔

اسی لیے سی آر اسلم زندگی بھر ملک کے اپ ٹو ڈیٹ ترین آدمیوں میں سے رہا۔

اخبار بینی اور ناشتہ وغیرہ کے بعد نہا دھو کر وکیلوں کی وردی پہنتا اور عدالت چلا جاتا۔ ایک آدھ کیس کر لیتا، وکیلوں منشیوں اور پیشیوں والوں سے بحثیں کرتا اور بارہ ایک بجے پانچ میکلوڈ روڈ پارٹی آفس آجاتا۔

پارٹی آفس تہہ خانے میں تھا اور وہاں تک سیڑھیاں جاتی تھیں۔ بڑھاپے میں سیڑھیاں چڑھنا اترنا گھٹنوں کے لیے پیر کی بددعا ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہانپتے ہوئے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے یہ دس گیارہ زینے ایک صدی میں سر کر لیتا۔ اور بالآخر ہال نما کمرے میں رکھی بڑی میز کے آخری سرے پر اپنی مخصوص لکڑی کی کرسی پر جا بیٹھتا۔

سوشلسٹ پارٹی کا دفتر افتادگانِ خاک کا دفتر تھا، بدنصیبوں، استحصال کے مارے ہوئے لوگوں کے طبقے کی پارٹی کا آفس!!۔ بدنصیبوں کی پارٹی کا سربراہ بھی کیسا ہوگا۔ سی آر اسی طرح کا۔ وہ ورکرز میں ایسے گھل مل جاتا جیسے ماں جائے بھائی ہوں۔ فلٹر بے فلٹر ایک آدھ بہت نیچ برانڈ کا سگریٹ مزدور حاضرین سے لے لیتا۔ پورے سگریٹ کو مبلغ ڈیڑھ کشوں میں واصل سینۂ خود

کر لیتا۔ ساری زندگی کسانوں کے ساتھ رہ رہ کر وہ دیہاتیوں کی طرح سگریٹ سے انتہائی بدسلوکی سے پیش آتا تھا۔ بھئی اُس کے ایک ڈیڑھ کش میں ہی سگریٹ کا انتقال ہو جاتا۔

سی آر اسلم باقاعدہ سموکر نہیں تھا۔ سگریٹ نہ ہوتا تو ہفتوں نہ پیتا مگر اگر ڈبیہ ساتھ پڑی ہو تو سمجھو چین سموکر بن جاتا۔ کش لگاتا جاتا اور بولتا جاتا تھا۔ چائے پیتا جاتا تھا، اور بولتا تھا۔۔۔ اور سٹڈی سرکل نما بحث میں غلطاں ہو جاتا۔ خود سوال اٹھاتا، حاضرین سے جواب تلاش کرواتا' اور اپنی سوچ نامحسوس طریقے سے بحث میں انڈیلتا جاتا۔

اُسے بالکل پرواہ نہ ہوتی کہ مخاطب ایک ہے، یا دس ہیں، چٹے اَن پڑھ ہیں یا پی ایچ ڈی ہیں۔ وہ نئی نئی باتیں، نئے نئے زاویے ڈھونڈ ڈھونڈ لاتا جاتا۔ ان پہ سوال اٹھاتا تھا، جواب دیتا تھا، ماضی بتاتا تھا، مستقبل بتاتا تھا، پرجوش بن جاتا تھا، پرنم ہو جاتا تھا۔ ضرب المثل بولتا تھا، شعر کا سہارا لیتا تھا، کسانوں کی حکایتیں سناتا تھا، انقلابیوں کے ترانے دھراتا تھا، ضرب المثل سناتا، مثالیں دیتا تھا۔۔ اور یوں مخاطب کا علم وواقفیت بڑھاتا جاتا تھا۔

وہ اس قدر آسان اور سہل انداز میں خلائی ٹکنالوجی، مارکسی سائنسی نظریہ، انفارمیشن ٹکنالوجی اور حتیٰ کہ جنیٹک انجینیرنگ پہ بولتا جاتا کہ بات مخاطب کے ذہن میں جذب ہو جاتی۔ اسی لیے تو یہ حیرتناک بات کسی کے پلے نہیں پڑتی تھی کہ ملک کے دور افتادہ گاؤں دیہات میں بھی سی آر کی پارٹی کا ورکر اِن جدید ترین باتوں پہ پروفیسروں جیسی گفتگو کرتا تھا۔

دفتر میں چنے، منگ پھلی، مکئی کے چھلے بھوک کے منہ پہ مارے جاتے تھے۔ وہ میسر نہ ہوتے تو چائے تو تھی ہی، اسی سے بحثوں کو مقوی بنایا جاتا۔

گو کہ ایسا بہت کم ہوتا تھا لیکن اگر کبھی کوئی وزٹر نہ ہوتے تو وہ وہاں خصوصی طور پر رکھے ہوئے امتحانی گتے پہ اُڑسے کاغذوں پہ کوئی مضمون، اخباری بیان، مراسلہ لکھنے بیٹھ جاتا (اسی طرح کا چوہالگا ہوا امتحانی گتہ اس کے گھر کے ٹیبل پر بھی موجود ہوتا جس میں چار چھ سفید کاغذ برائے تحریر کلپ شدہ ہوتے)۔ وہ بہت پابندی کے ساتھ ملک بھر سے آئے ہوئے خطوط کے جواب لکھ لیتا۔ اگر موقع ملتا تو بذریعہ ڈاک آئے ہوئے بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں کے سرکلر، بلٹن اور رسائل

پڑھ لیتا۔ اچھی چیز ہوتی تو اُسے اپنے پاکستانی قارئین کے لیے اردو میں ترجمہ کر کے اپنے اخبار کے لیے دیدیتا۔ اگر دفتر میں اُس مواد کو پڑھنے کا وقت نہ ملتا تو وہ سب کو ملا کر پڑھنے کے لیے گھر لے جاتا ۔جنہیں پھر آفس سیکرٹری اسلم اعوان واپس منگوا کر ہال میں رکھی بہت بڑی میز پہ پارٹی ورکرز کے پڑھنے کے لیے ترتیب سے رکھ دیتا۔

سی آر اسلم چار، ساڑھے چار بجے دفتر سے پیدل نکل کر ہال روڈ سے ہوتا ہوا مال روڈ کراس کر لیتا اور ٹمپل روڈ کے پارک لین میں اپنے گھر پہنچتا۔ کبھی اکیلا اور کبھی کسی ساتھی کے ساتھ۔

لباس بدل کر بہو کے ہاتھوں تیار کردہ سادہ ترین کھانا کھاتا۔ اُس کے کھانے میں عموماً سبزیاں ہوتیں۔ دال بھی پکتی تھی اور کبھی کبھی ہم گوشت کی اُس کے حصے میں آئی بوٹیاں شیئر کر لیتے۔

کھانے کے بعد پھر وہ بیٹھک میں اپنی میز پر بیٹھ جاتا۔ چار بج کر بیس منٹ کی آل انڈیا ریڈیو کی خبریں سنتا، پڑھتا، لکھتا، اور کبھی کبھی وہیں اونگھتا۔

شام کو اُس کے گھر کوئی نہ کوئی پارٹی ورکر ضرور آجاتا۔ شہر سے باہر کے لوگ تو خصوصاً آجاتے، ملک اسلم ایڈوکیٹ کی موجودگی لازم ہوتی۔ راجہ ولایت ہوتا، ملک بھارا اگر ملتان سے، اور میاں محمود لائلپور سے آتا تو وہ ہوتے، تبسم اقبال آجاتی، یونیورسٹی کا کوئی طالب علم اپنے تھیسسز کے سلسلے میں آجاتا، کسینڈرا اپنے اخباری دفتر سے فارغ ہوتی تو آ کے عالم فاضل سُسر کی محفل میں بحث میں حصہ لینے بیٹھ جاتی۔ یوں ایک طرح کی علمی بیٹھک سج جاتی جس میں عورتوں کی بین الاقوامی تحریک، کمیونسٹ دنیا کی باتیں، فلسفہ، تاریخ اور معاشیات پر بحثیں، اور جدید سائنسی دریافتوں اور ٹکنالوجی کی عجائبات پر تبادلہِ خیالات ہوتے۔

کوئی اچھا موضوع ہاتھ نہ آتا تو وہ اپنے اُن ساتھیوں میں سے کسی کو اپنا کوئی مضمون یا بیان ڈکٹیٹ کروالیتا۔ جب یہ کام پورا ہوجاتا تو ایسی تحریر پر بحث شروع ہوجاتی۔ اس کے پارٹی ورکرز اپنے استاد کے مضمون میں کاٹ چھانٹ، اضافے، تحریفیں کروا کروا کر اُسے کیا سے کیا بنا ڈالتے! ۔سی آر اُس وقت تک راضی راضی ترمیمیں قبول کرتا جاتا جب تک کہ اُن میں کوئی فکری کمی

کجروی نہ ہوتی۔ ہاں، لیکن اگر نظریاتی فریم سے ہٹ کر کوئی ترمیم کرنے لگتا تو تب وہ بکرے کی سینگ کی طرح سخت ہوجاتا۔ یوں ایک نیا سٹڈی سرکل شروع ہوجاتا۔

جو نئی کتاب قابلِ ذکر کتاب مارکیٹ میں آتی وہ ضرور خریدتا۔ وہ پنجاب پبلک لائبریری کا باقاعدہ ممبر تھا۔ پڑھنے میں کوئی نستعلیقیت نہ تھی، بس پڑھنے لگ جاتا، کوئی مہمان آجاتا تو کتاب کو اُسی کھلے انداز میں الٹا کر کے میز پر لٹا دیتا۔ اور مہمان سے اس کتاب اور اس کے مندرجات پر گفتگو کرتا۔ جونہی فرصت ملتی کتاب کو سیدھا کرتا اور پھر پڑھنا شروع کرتا۔ اور اگر وہ کتاب عوام یا رفیقوں کے لیے مفید ہوتی تو ہر ایک کو پڑھنے کی تلقین کرتا۔

سی آر مطالعہ کے معاملے میں بہت سلیکٹو تھا۔ وہ کبھی اوٹ پٹانگ چیزیں نہیں پڑھتا تھا۔ معاشیات، مارکسزم، فلسفہ اور تاریخ اس کے پسندیدہ موضوعات ہوتے تھے۔ روسی اکیڈمی آف سائنسز کی ''مختصر تاریخ عالم'' برسوں اس کے سرہانے کے نیچے رہی۔ اسی طرح ایچ جی ویلز کی ''تاریخ عالم'' بھی اسے پسند تھی۔ کارل مارکس کی تحریروں کا تو وہ عاشق تھا ہی، وہ لینن سے بھی زندگی بھر راہنمائی لیتا رہا۔ ڈارون کے نیچرل قوانین تو وہ ہر کسی کو پڑھوانا چاہتا تھا۔ ٹالسٹائی، میکسم گورکی اور پشکن اُس کے پسندیدہ مصنف رہے۔ اردو ادب میں وہ اقبال، کرشن چندر، فیض، اختر شیرانی، استاد دامن، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، سجاد ظہیر، سبطِ حسن، امرتا پریتم، حبیب جالب اور احمد راہی کو پسند کرتا تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ مارکس، لینن جیسے اساتذہ کی تحریریں پڑھے۔

وہ اپنی کتاب کے کونے میں عموماً پینسل سے اپنا نام انگریزی میں لکھ لیتا۔ وہ کتاب کے اوپر زیادہ لکھتا نہ تھا، نہ انڈر لائن کرتا۔ شریف آدمیوں کی طرح کتاب سے شرافت سے پیش آتا۔ کتاب جب مکمل پڑھ لیتا اور اگر یہ بہت ضروری، اور اپنے پاس رکھنے والی ریفرنس کتاب نہ ہوتی تو کسی پارٹی ممبر کو دے دیتا بالخصوص دور دراز کے ساتھی کو۔

انہی اوصاف کی بدولت وہ نصف صدی تک پاکستان میں کمیونسٹوں کی اکثریت کا لیڈر رہا۔ اور کمیونسٹ کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر بے شعور قطعاً نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ کہ وہ ایسے لوگوں کا لیڈر رہا جو اپنے نظریے کی علمی بنیادوں پر دسترس رکھتے تھے، تحقیق، اور بحث اور مطالعہ کرتے تھے۔ ایسے

باشعور انسانوں کی قیادت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ سی آر اسلم اس لیے طویل قیادت کر سکا کہ وہ مطالعہ، کمٹ منٹ اور قوت فیصلہ میں اپنے تمام رفقا سے بڑھ کر تھا۔ اس نے ذاتی مفاد، اور پسند سب کچھ اپنے ساتھیوں کی تربیت پر تیاگ رکھا تھا۔ انقلاب کے علاوہ کوئی موضوع نہیں، کوئی اور کام نہیں۔ چوبیس گھنٹے کا انقلابی۔

قمیص شلوار وہ ہمیشہ سفید رنگ کا سوتی والا پہنتا۔ جلسہ وغیرہ ہوتا تو سفید واسکٹ بھی پہن لیتا۔ اس کے کپڑے دھلے ہونے ضروری ہوتے تھے۔ اِستری بھی۔ باقی پرانا ہونا کوئی عیب نہ ہوتی تھی۔ میں نے اُس کی بہت سی قمیصوں کے کالر ادھڑے دیکھے۔ مگر وہ لباس کے بارے میں ایسا بے پرواہ بھی نہ رہتا کہ ضرورت پڑنے پہ سوئی دھاگے کی خدمات نہ لیتا۔ نہیں، اُس کے کپڑے بے شک پرانے ہوں مگر وہ کبھی بھی پھٹے ہوئے اور بے استری نہ ہوتے۔

اُس کے جوتے موٹے کپڑے سے بنے ہوئے بوٹ ہوتے تھے، سروس وغیرہ کے۔ وزن دار بھاری بوٹ وہ نہیں پہنتا تھا۔ بڑھاپا تو اپنا کلچر ساتھ لاتا ہے ناں! سی آر اسلم گرم پنجاب میں جرابیں بہت کم پہنتا تھا۔

درماندہ اور پریشان انسانیت کی خدمت کے لئے سی آر اسلم نے اچھے اوصاف کو اپنی عادت کا حصہ بنا ڈالا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی وقتی، یا دکھاوا کرنے والا معاملہ نہ تھا۔

زندگی اس پہ صرف اس حد تک مہربان رہی کہ اُسے جینے کو بہت سال عطا کر دیے۔ اسی طویل عمری کی نعمت کی دستیابی کے سبب وہ ایک نہیں بلکہ دو تین نسلوں کا استاد رہا۔

اس نے بقول اس کے بیٹے قیس اسلم کے: ''تمام عمر ہماری والدہ، سوشلزم، اور پارٹی سے بے حد پیار کیا''۔ میرا اضافہ یہ کہ ''عام انسان'' سے بھی۔

چنانچہ وہ ستر برس تک مسلسل اور ہمہ وقت انسانوں کی خدمت کرتا چلا آیا۔ استقامت کے ساتھ چلتا رہا، وہ کسی کو دھکا دیے بغیر، کسی کا گِلہ اٹھائے بغیر آسمانِ انسانیت کی بلندیاں رینگتا رہا۔

چودھری رحمت اسلم ہمارے ماہنامہ سنگت کا سرپرست اعلیٰ تھا۔ سنگت اور اس سے قبل

ماہ نامہ نوکیں دور کی اشاعت کو وہ بہت اہم سمجھتا تھا۔ وہ مرحوم ضمیر نیازی اور محترم عبداللہ جان کی طرح نہ صرف رسالہ سنگت ورق بہ ورق پڑھتا تھا بلکہ اس میں لکھتا بھی تھا۔ ہمیشہ اس کی سرکولیشن، اس کی ترسیل اور گیٹ اپ کے بارے میں بحث کرتا تھا، اور تجاویز دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ خدمتِ خلق کے حوالے سے اس کے رفقاء کی بقیہ ساری سیاست اور دیگر انسان دوست سرگرمیوں کے مجموعے سے بھی سنگت کی اشاعت بڑھ کر ہے۔

سی آر اسلم ایک فلاسفر تھا۔ وہ دنیا، سماج اور انسان کی فلاح کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہ مارکسسٹ نظریہ دان تھا اور اپنے معاشرے پر اس بڑی سائنس کے اطلاق کے طور طریقے وضع کرنے کا کام کرتا تھا۔ سی آر اسلم انقلابی تھا اور اپنے نظریات کی سچائی کو عمل کے میدان میں ثابت کرتا تھا۔

سی آر اسلم نے زندگی کا بڑا حصہ کھلی سیاست کی، کھلی پارٹی چلائی، قائل کرنے والے اجتماعی فیصلے لئے۔ وہ سازشوں کا ہمہ وقتی کافر رہا۔ وہ چاپلوسی کرنے اور سننے سے بچا رہا، تفرقہ بازی سے دور رہا، اور بداخلاق زبان سے اجنبی رہا۔ اجتماع کی دانش کے اس حامی نے کسی بھی مخالف کی ذات پہ کوئی حملہ نہ کیا۔ جسے اچھا سمجھا خوب زور زور سے اعلان کیا، جسے برا جانا اس سے خاموشی کے ساتھ دور رہا۔ جس پر بھی تبصرہ کیا، اس کی سیاست کے حوالے سے کیا۔ کبھی گالیوں کا جواب دشنام طرازی سے نہ دیا۔

اس نے طلباء کی سیاست سے آغاز کیا۔ ٹریڈ یونین، کسان کمیٹی اور سیاسی پارٹی تک اس کے سفر میں کہیں کامافل سٹاپ، اور سوالیہ نشان نہیں ملے گا۔ زیر دستوں کی سی زندگی، جہاں کوئی چھلانگ کوئی پھلانگ نہیں۔ ہموار چال، ہم آہنگ رفتار۔ جیسا باہر ویسا اندر، جیسا آج ویسا دس برس بعد۔ جیسا جلسے میں ویسا ہی جیل میں۔ ضمیر کا پرسکون انسان۔ اپنے مشن پہ ہی لگے رہنا۔ گرمی ہو یا سردی اس نے اپنا میدان کبھی نہ چھوڑا۔ سی آر اسلم مستقل مزاج انقلابی رہا۔ وہ وقتی ابھار سے کبھی پھیلا نہیں، اور ناکامیوں سے کبھی مرا نہیں۔ اس شخص کو کبھی بھی جلدی جلد بازی نہ ہوتی تھی۔ جھنجھلاہٹ، تڑاپ تڑوپ، سراسیمگی اور ہیجان کبھی قریب نہ پھٹکتے۔ استقامت تو شاید اُس کی سب

سے بڑی شناخت تھی۔ تشبیہیں نہیں دوں گا مگر یہ دعویٰ ضرور کروں گا کہ وہ کوہِ گراں تھا۔ سنگِ میل ،جس سے سینکڑوں لوگوں نے سمت پائی۔ بھرپور وفا میں اپنے نظریے سے استقامت۔ برے سے براوقت اُس پہ آیا، اس کے نظریے پر آیا، اس کی تنظیم پر آیا مگر وہ اپنے مسلک پہ قائم دائم رہا۔ اس کا حوصلہ دیکھ کر اُس کے ساتھی حوصلہ پاتے۔ یوں بغیر تقریر و لیکچر کے بھی وہ سبق دیا کرتا تھا۔ وہ ایک بھاری پتھر کی طرح اپنی جگہ پہ جما رہا' اور روشنیاں بانٹتا رہا۔

سی آر اسلم نہ صرف خود نیکی کرتا رہتا تھا بلکہ وہ تبلیغ کرتا جاتا تھا نیکی کی' دوسروں کے کام آنے کی، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی۔ وہ ایسا لیڈر تھا جو ہمیشہ اپنے رفقا کی مشکلات کی خبر رکھتا تھا۔ وہ ہمہ وقت دوستوں کی مشکلات بانٹنے والا انتظام کار رہا۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ آج کی ساری سیاسی، ادبی اور سماجی اکابرین والی نسل، اُس سے متاثر ہے۔

ہمارا یہ رہبر کبھی بھی اپنی قربانیوں پہ اترایا نہیں اور تحریک کے زوال سے آہ و فریاد نہ کی۔ وہ ہمارے خطے میں ذاتی زخم چھپانے کا سب سے بڑا سپیشلسٹ تھا۔ کبھی غصے میں، طیش میں ،اور جذبات میں نہیں آتا تھا۔ اس کا چہرہ دکھ سکھ کا تھرمامیٹر کبھی نہ رہا۔ اس کا تن، اس کا بدن، اس کی مسرت، اس کا دکھ۔۔۔۔سب کچھ عوام الناس کی بھلائی سے وابستہ تھا۔ سی آر اسلم نظریہ دانی، انسان دوستی، دانش، سچائی اور دوام کا پتلا تھا۔

وفا کا نام سی آر اسلم تھا۔ وہ سچائی کی زمین میں دھنسا ہوا سربہ فلک سرسبز درخت تھا۔ اس کی تبلیغ میں، اس کے داؤ پیچ میں، اس کی حکمت عملی میں کبھی فریب، دھوکہ شامل نہ رہا۔ آپ اگر اس کے ساتھ چار دن گزارتے تو زندگی بھر اس کے اقدامات کے بارے میں پیش گوئی کرنے کے اہل بن جاتے کہ وہ اس عالمی جدلیات کا گُر آپ کو سکھا ڈالتا تھا جس پہ وہ خود چلتا رہتا تھا، جس پر دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیاں چلتی ہیں۔

سی آر جتنا سامراج دشمن شخص شاید ہی کوئی اور ہو۔ لفاظی والی نہیں، نعرے بازی والی نہیں۔ بلکہ مستقل مزاجی اور سنجیدگی سے سامراج دشمنی اس کا طرہِ امتیاز رہی۔ وہ ہر وقت سامراج کی ہر شکل کی مخالفت کرتا تھا، معیشت میں، سیاست میں، کلچر میں۔ کسان کانفرنسوں میں تو اس قدر

کہ ایک اجتماع میں ایک سادہ لوح کسان نے دوسرے سے کہا کہ اس کو جب بھی سنا وہ سامراج کے خلاف شکایت کرتا رہتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ سامراج کوئی بیماری ہے جو اُسے لگ گئی ہے۔؟

مسلسل مارشل لاؤں، ملاؤں اور فیوڈلوں کی حکمرانی کی انتظامی سیاسی سماجی اور اخلاقی حملوں، اور محاصروں کے باوجود بشر دوستوں کے سرغنے سی آر کو گوشہ نشین نہ کرایا جاسکا۔ وہ جیل میں بھی بولتا رہا اور مجمعے سے بھی فلاح کا خطاب کرتا رہا۔ اسے کوئی ترغیب تحریص چُپ نہ کرا سکی۔

سی آر اسلم طویل عمری کے سبب ظاہر ہے بیماریوں کا شکار ہوا ہوگا۔ آنکھ کا آپریشن، نظام پیشاب کے آپریشن، پھر اُس آپریشن پہ انسٹرنل ہرنیا کا آپریشن اور اس طرح کی کئی بیماریاں بھگتیں۔ اُس کو کوئی بیماری ہوتی تو سمجھو سارے پاکستان کو معلوم ہو جاتا۔ وہ ڈاکٹر امیر الدین کی طرح دہائی اور سراسیمگی تو نہ پھیلاتا، مگر وہ اپنی بیماری کی تفصیلات، اُس کے اسباب، اُس کی تکالیف، تشخیص کی سہولیات، علاج اور نتائج کے بارے میں اپنے ڈاکٹروں سے طویل باتیں کرتا۔ یہ مکمل معلومات وہ اپنے سارے دوستوں، جاننے والوں یا برسرِ راہ ملنے والوں کو زبانی یا تحریری طور پر تفصیل سے بتاتا۔ یوں وہ خود بھی آدھا ڈاکٹر بن جاتا اور اپنے احباب کو بھی زبردست سائنسی معلومات پہنچاتا۔

سی آر اسلم بہت اچھا استاد تھا۔ بغیر اعلان کیے بغیر اشتہار بانٹے وہ ہر وقت' اپنے ہر ملنے والے کو کچھ نہ کچھ بتا رہا ہوتا۔ سی آر اسلم علم کا ایک مہربان دریا تھا، پیہم بہتا دریا۔ نہ کبھی اس کے سوتے خشک ہوئے اور نہ ہی کبھی اِس قدر تند و تیز کہ لوگوں کو اپنے اطراف سے، ماحول اور معروض سے اکھاڑ پھینکیں۔ وہ علم کی مدھم آنچ سے اپنے شاگردوں کے تفکر کو مستقل طور پر ابھارے رکھتا تھا۔ مکران کے آم کا باغ جہاں کوئی خاردار باڑھ نہیں، کوئی کانجی ہاؤس نہیں، کوئی دربان نہیں۔ اور پھر' وہ یہ تکبر بھی نہیں کرتا تھا کہ لشکرِ عظیم جمع ہو تو تبھی شامِ غریباں سجائے۔ ہر نفس غنیمت تھا، ہر عقل فرقان تھی۔ ہم نے ''ایک'' مخاطب پہ مشتمل اُس کے کئی سٹڈی سرکل اٹنڈ کیے۔ وہ ان ایک ایک دو دو آدمیوں کے جلسہ ہائے عام سے تین تین گھنٹے خطاب کرتا تھا۔ اس عقیدہ کے تحت کہ جو کچھ آج وہ تنہا کر رہا ہے وہ کل کا نقارہ ہوگا جسے لاکھوں کروڑوں انسان بجائیں گے۔

بلا مبالغہ سی آر اسلم نے ہزاروں شاگرد پیدا کئے ۔۔۔۔شاگرد جو جدوجہد کرتے کرتے وطن چھوڑ گئے، شاگرد جو جدوجہد کرتے کرتے مر گئے، جیلوں میں سڑ گئے۔شاگرد جو اُس کی پارٹی چھوڑ گئے، شاگرد جو اُس کے ساتھ رہے۔شاگرد جو اُس کی چغلیاں بولتے لکھتے اپنی لیڈری کا جواز دیتے رہے، شاگرد جو بن بتائے اُس کے عطا کردہ شعور کو پھیلاتے ۔شاگرد جو اُس کی پیرویاں کرتے ہیں، شاگرد جو اُس کے مخالف بنے مگر اسی کی تعلیمات اور اُسی کے فقرے دہراتے رہے۔

اس استاد نے نہ تو ساتھ رہنے والوں کی بے جا تعریفیں کیں، نہ مخالف کیمپ میں جانے والے اپنے شاگردوں کو کبھی دھتکارا۔کسی بھی وقت کفارہ ہوسکتا تھا۔سی آر اپنی سیاست الگ کرتا تھا مگر بگڑے بچھڑے شاگردوں سے تعلق نہ توڑتا تھا۔

کمال صبر تھا اس شخص میں۔اسے معلوم ہوتا تھا کہ جو شخص اِس گھڑی اُس سے لیکچر سن رہا ہے وہی چوبیس گھنٹے قبل اِس لیکچرار کے خلاف انگریزی سے آلودہ ہرزہ سرائیاں فرما کر اب اُس کے خلاف نیا مواد مصالحہ لینے آیا ہے۔مگر وہ بڑا انسان تھا، چھوٹے انسانوں سے حسنِ سلوک کرتا جاتا تھا۔

سی آر اسلم اپنی صدی بھر کی زندگانی میں سوشلزم کا طالب علم رہا، اُسی کا استاد، اسی کا ساتھی رہا۔وہ پیرانہ سالی کے سبب اپنی سیاسی پارٹی کی سربراہی سے رضا کارانہ طور پر ریٹائرمنٹ لے کر عوام اور عوامی دانش پہ بھروسہ کیے، بہت پرامید رہتا تھا۔بڑھاپے کو جوانوں کی تعلیم میں ڈبوتا رہا، تنہائی کو سٹڈی سرکل نما محفلوں میں قتل کرتا رہا، یادوں کے انبار کو نوخیزوں کی معلومات کے ریوڑوں میں رواں کرتا رہا۔نوخیز سامعین جواب ناپید ہوتے جارہے تھے۔

سی آر کڑھتا نہیں پڑھتا تھا، غیبت نہیں محبت کرتا تھا، تحکم نہیں تربیت کرتا تھا، شک نہیں اعتماد کرتا تھا۔وہ تالیوں کے لئے نہیں سماجی بہبود کے لئے بولتا تھا۔ماضی میں نہیں مستقبل میں رہتا تھا۔سی آر اسلم امید و اعتماد کے گلستان کا مالک تھا۔مال کے بدلے مال والا تاجر تھا۔آپ اپنی مایوسیاں اُسے دے دو، پر اُمیدی اُس سے لے لو۔بلا احسان، بلا قدرِ زائد۔

سی آر قوت فیصلہ عطیہ کرتا تھا۔سی آر کبھی بھی امید کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا

تھا۔بڑی سے بڑی ناکامی نے بھی اُسے کبھی مایوس نہیں کیا۔سیاسی کارکن ڈھارس لینے بھی اس کے پاس جاتے تھے۔مگر وہ کوئی ہوائی آسرا اور خیالی امید نہیں دیتا تھا بلکہ یہ حقیقی، مدلل اور جدلیاتی پرامیدی ہوتی تھی۔اس سے مل کر ساری ناامیدی، ساری مایوسی امید میں بدل جاتی تھی اور ایک نیا جذبہ لے کر پھر جدوجہد کے میدان میں کودنے کا انتظام ہوجاتا تھا۔

سماجی انقلاب کا یہ داعی ہر شخص کا بھلا چاہتا تھا، ہر شخص کا بھلا کرتا تھا۔دوستوں کی نجی زندگی تک کے مسائل میں ساتھ دیتا تھا۔وہ انقلاب کے نام پر تباہ کن مہم جوئی کو کبھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔نعرے بازی، طفلانہ مہم جوئی، شعلے، شہادتیں، اور خفیہ گیری سے دور بھاگتا تھا۔

اس سب کا اجرا سے اس طرح نصیب ہوا کہ وہ کبھی اقتدار کے قریب نہ گیا۔

اُس کی ایک بڑی خوبی اس کا تقویٰ تھی۔یہ شخص ایک صدی کی زندگی گزار کر بھی بے دھبہ، بے الزام رہا۔پاک۔صاف۔سُچا۔۔۔۔۔۔اس کا نامۂ اعمال غیبت، جھوٹ، سازش، لالچ، مردم آزاری اور بے وفائی سے مبرا ہے۔ایک مثالی خاکی انسان۔نہ لیڈری جتائی، نہ بزرگ العمری، نہ ولایت وتصوف، نہ عالمی معلّمی.....ایک مکمل انسان تھا وہ۔

سی آر اسلم بہت خوش طبعیت انسان تھا۔وہ اپنی باتوں میں زبردست چاشنی پیدا کرتا تھا۔خود اپنی جدوجہد میں سے لطیفے نکال نکال کر سناتا۔خوش خلق وملنسار انسان تھا۔ہنس مکھ ایسا کہ جیسے ذاتی زندگی میں کوئی مسئلہ کوئی تکلیف ہو ہی نہیں۔ایک سچے مارکسسٹ کی سی خوش مزاجی تھی اُس میں۔

سی آر نے خوب خوب غلطیاں کیں، مگر خود پہ ہنس کے غلطیاں تسلیم بھی کیں، اور انہیں دہرانے سے سختی کے ساتھ پرہیز بھی کیا۔وہ آپ کو لطیفے کے انداز میں اپنی غلطیاں بتاتا جاتا تھا تاکہ آپ انہیں نہ دہرائیں۔مگر جو لوگ اُس کی اپنی ہی سنائی ہوئی غلطیوں کو اُس ہی کے خلاف استعمال کرتے تھے وہ انہی غلطیوں کے شکار لازماً بن جاتے تھے۔جی ہاں، سی آر کی یہ کرامت میں نے بہت جگہ دیکھی!!

سی آر اسلم کو خوب علم تھا کہ دھائیوں سے سوشلزم کے نظریات کی بدنامی کی زبردست مہم

کامیابی سے چلائی جارہی تھی۔ اِن نظریات کے بارے میں عوام کے دلوں میں بہت سی کنفیوژنیں ڈال دی گئی تھیں۔ اسی لیے وہ ساری زندگی سوشلسٹ نظریات کی ترویج ومقبولیت میں لگا رہا۔ اور یہ معلوم بات تھی کہ کمیونزم یا کمیونسٹوں پر تنقید کے سامنے کوئی اور ٹھہرتا یا نہیں، سی آر اسلم دلیل ودماغ کے لیے میدان میں یقینی موجود ہوتا۔

اور جب آپ اُس سے زندگی کی حاصلات کا پوچھتے تو وہ پہلے کامیاب/ناکام زندگی کے بارے میں آپ کا concept بدل دیتا۔ یہ جو عام دنیاوی طور پر سیاست کو مال ومتال، جاہ و حشمت اور عہدہ ومنصب سے نتھی کرلیا جاتا ہے، سی آر اُس غلط تصور کو کھرچ کے دماغوں سے نکال پھینکتا۔ اس کے ہاں سیاست انسان کے صدیوں کے شعوری تصورات کی نمائندہ ہوتی ہے۔ سی آر کامیابی کو، سماجی انصاف اور انسانی برابری کی جدوجہد میں کامیابیوں ناکامیوں سے جوڑتا تھا۔ وہ سیاست کو جدلیاتی انداز میں حرکت پہ مجبور قرار دیتا تھا۔ وہ جوش کو ہوش کے تابع رکھتا تھا۔ ایسی روحانی قدر جو انسان کو صلہ وستائش سے بے نیاز کردیتی ہے۔ مایوسی سے اجنبی یہ شخص رجائیت، کمٹ منٹ اور جہدِ مسلسل کا نمونہ تھا۔.....مہذب انسان۔

لیڈر کی حیثیت سے وہ تنظیم میں آہنی ڈسپلن استعمال نہیں کرتا تھا۔ عمر بھر اس پہ دوستوں کی طرف سے بھی (اور مخالفین کی جانب سے بھی) یہ تنقید رہی کہ اس نے پارٹی ڈسپلن کو بہت ڈھیلا ڈھالا رکھا۔ مگر عجیب ہے کہ اُس کی موت کے بعد اُس کے ایک مخالف نے اس پہ تنقید کی کہ وہ ''ڈکٹیٹر'' تھا۔

سی آر اسلم کبھی بھی معاشی طور پر خوشحال نہ رہا۔ ہمیشہ تنگدستی میں رہا۔ اچھی وکالت کرتا تھا، مگر اُس کے پاس آتے ہی غریب غربا تھے جنہوں نے فیس کیا دینی تھی۔ اکثر جب اس کے پاس جو خاندانی جھگڑوں کے کیس آجاتے تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ عدالت تک جانے کی نوبت نہ آئے۔ اور خانگی فیصلہ ہو۔ کبھی کبھی تو وہ خود درمیان میں کود جاتا اور ثالث ضامن بن کر صلح صفائی کروالیتا۔ جس کے پاس عوام دوست سائنسی نظریہ ہو وہ ذاتی کمائی سے زیادہ انسانی بہبود کے ہی کام کرے گا۔

ایک کمال حرکت وہ اور بھی کرتا تھا۔ وہ باقاعدہ نکاح خوانی کرتا تھا۔ اس کی سیاسی پارٹی سے وابستہ، یا غیر وابستہ محبت میں مبتلا کوئی جوڑا کورٹ میرج کرنا چاہتا تو سی آر باقاعدہ ان کا نکاح پڑھواتا اور پھر عدالتی معاونت کرتا۔

1980 کے وسط میں اس کے بہت سارے ساتھی راہیِ ملک عدم ہوچکے تھے اور بعض رفقا اُس کا ساتھ چھوڑ گئے، پھر بھی پیرانہ سالی کے باوجود وہ اپنی راہ پر پورے عزم کے ساتھ گامزن رہا۔ یہ صرف بے وفائی کی بات نہ تھی۔ مخالفین کے مغلظات بھرے الفاظ وفقرے، بے تکریم رویے اور غیر سیاسی گھٹیا گیری کا عروج تھا۔ مگر اس کے باوجود سی آر اسلم اپنے یاران باوفا کے ساتھ ڈٹا رہا۔ اسی طرح سوویت یونین کے سیاسی انہدام کے بعد وہ بے ہوش نہ ہوا۔ شاید ایشیا میں سی آر اسلم وہ واحد شخص تھا جس نے بکھرے ٹوٹے سوویت یونین کے صدمے کے جواب میں بغیر بیانیہ تبدیل کیے انسانوں کو سوشلزم پہ ٹکے رہنے پہ قائل کیا۔ محکوموں مظلوموں کی سیاسی شناخت وآواز کو برقرار رکھنے کے لیے اُس بوڑھے شخص نے اپنے جسم میں گلوکوز کے آخری مالیکیول تک کو جھونک دیا۔

عالمگیر صداقتوں کیلئے کفن کندھے پہ رکھے وہ کام کرتا رہا۔ لُوٹ مار کے خلاف، استحصال کے خلاف، پابندیوں کے خلاف، جبر کے خلاف، نسل پرستی کے خلاف، فرقہ پرستی کے خلاف، ون یونٹ کے خلاف، سامراجیت کے خلاف.....وہ ضعیف کا ساتھ دیتا تھا۔ بے یاروں کا یار تھا، وہ مدد خواہ کی مدد، اُسے شعور کی دولت عطا کر کے کرتا تھا۔ کسان کو جاگیرداریت کی اصلیت بتاتا تھا، مزدور کو اس کی غربت کے اصل اسباب سمجھاتا تھا، عورتوں پہ ناروا ظلم کے ذمہ دار فیوڈل مردانہ سماج کی اصلیت واضح کرتا تھا۔ اور پھر اِن انقلابی طبقات یعنی مزدوروں کسانوں اور عورتوں کی تنظیمیں بنوا کر فیوڈل مخالف سیاست میں ان کی قیادت کرتا تھا۔ سی آر اسلم انسانی آزادیوں کی بڑی عمارت کا بنیادی اینٹ بھی ہے اور اس عمارت کا بالائی ڈھانچہ بھی۔۔۔۔۔۔ اس جدوجہد میں جتنے بھی لوگ کام کررہے ہیں۔ وہ سب کے سب کسی نہ کسی شکل میں سی آر اسلم کے فکر، اس کے علم کے متاثرین ہیں۔ سب کے سب اُس کے برخوردار ہیں، شاگرد ہیں، احسان مند ہیں۔ سب اسی کے رفیق ہیں۔ سب اُس کے بچھڑنے سے مغموم ہیں۔ اور یہی بڑے انسان کی نشانی ہوتی ہے۔

دو ہم عصروں کے تاثرات

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سی آر اسلم جتنے اچھے انسان کے کتنے زیادہ قریبی ساتھی ہوں گے ۔جس شخص نے 92 برس کی ساری زندگی کا سارا وقت انسانی فلاح کے لئے لگایا ہو اس کے تو بہت سارے رفیق ہوں گے ۔اور ان سب کا تذکرہ کیسے ممکن ہے۔اس کے جنازے پر جب بڑھاپے اور بیماریوں کے مارے ہوئے محمد علی بھارا کو موجود پایا تو اندازہ ہوا کہ سی آر اسلم کا کوئی بھی ساتھی معمولی آدمی نہیں ہے ۔ ہر ایک شخص استقلال ، جدوجہد اور علم و بصیرت کا سمندر ہے ۔ جب سی آر اسلم کے آخری دو برسوں کے خدمت گذار راجہ ولایت پہ نظر پڑی تو انسانیت پہ اعتماد دو چند ہوا ۔ ایسے اچھے لوگوں پر تو ایک اور کتاب ہونی چاہیے اور میں ایسا کروں گا۔

سوبھو گیان چندانی

سی آر اسلم عمر بھر سوشلسٹ تحریک میں ہمارے ساتھ رہے ۔1947 میں وہ ریلوے مین یونین کے سیکرٹری کی حیثیت سے کراچی میں مرزا ابراہیم کے ساتھ آیا تھا۔پہلی دفعہ جب وہ ہمارے کیمون میں آئے تو ہم نے ان کو دعوت دی کہ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں ۔کراچی کا کیمون کھانے پینے کے لحاظ سے بہت اچھا چلتا تھا اور کھانا پکانا کامریڈ بخاری شانتہ دیوی کا کام تھا۔ایک لڑکا شانتہ

کی مدد کے لئے رکھا ہوا تھا۔کھانا کھانے کے بعد تینوں پنجاب کے کامریڈز نے پیسے نکال کے کھانے کا بل ادا کرنا چاہا۔ میں نے ان کو کہا کہ ہمارے ہاں مہمانوں سے پیسہ لینے کی رسم نہیں ہے ۔انہوں نے ضد نہیں کی البتہ یہ کہا کہ ہم آپ کو لاہور کے کیمون میں مفت کھانا نہیں کھلا سکیں گے ۔

1952 میں جب میں جیل سے باہر آیا تو اکتوبر کے مہینے میں لاہور بلایا گیا۔تب وہاں پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ چل رہی تھی ۔میٹنگ کے بعد فیصلہ ہوا کہ میں اسلم کے گھر ٹھہروں گا۔ میٹنگ کے بعد ہم سب مل کر باہر چلنے لگے ۔اور سارے ساتھی میرے ساتھ گول دائرے میں چلنے لگے ۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ۔انہوں نے کہا کہ یہاں لاہور میں نان مسلم کامریڈز کو ہم اپنی حفاظت میں گھر لے جاتے ہیں ۔ چنانچہ جتنے دن میں لاہور میں رہا یہی طریقہ رہا۔

فین روڈ پر ان کا مکان تھا۔مکان کافی بڑا تھا اور کھانا پڑوس سے کسی عزیز کے گھر سے آتا ۔1956 تک ہم ایک ساتھ رہے ۔اس دوران انہوں نے شادی کر لی تھی ۔ اور دو جڑواں بچے ہوئے تھے ۔ میں بہت بار اُن سے باتیں کرتا رہا۔اور لاہور کے ان کامریڈز کے ساتھ جو راولپنڈی سازش کیس کے بعد بیٹھ گئے تھے ان کے ساتھ بھی مجھے ملوایا۔اسلم بہت پہلے سے ہی یہ تجویز دیتا رہا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کا نام بدل کر سوشلسٹ پارٹی رکھا جائے تا کہ حکمرانوں کی سختیاں کم ہوں اور عوام میں کام آسان ہو۔1954 میں مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں میں ظفر اللہ پوشنی اور محمد حسین عطا کے ساتھ ملتا رہا۔شاید 1956 میں، میں کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں جنرل اکبر خان کی بیوی سے ملاقات کروائی ۔بیگم صاحب کا کہنا تھا کہ جنرل اکبر اگر پاور میں آئے تو پہلا وار ہم کمیونسٹوں پر ہوگا ۔ان کا کہنا تھا کہ جنرل صاحب خوشامدی لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں اور جن کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے۔ان کا اشارہ غالباً خاکساروں کی طرف تھا۔

سی آر اسلم کے ساتھ میری آخری ملاقات 1988 کے الیکشن کے بعد ہوئی ۔ میں ان کے گھر گیا تھا۔سنا تھا کہ ان کے دونوں بیٹے تعلیم حاصل کر کے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی میں ملازم ہو گئے تھے اور وہ Election Officer بھی تھے ۔انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ فیصلے آرمی کا ایک Cell کرتا ہے اور آپ کے سارے کرتوت

ان کے آگے ہوں گے۔

سی آر اسلم بہت محنتی اور اچھے وکیل بھی تھے۔ان کی لائبریری سوشلسٹوں کے لئے بڑا سرمایہ تھی۔عمر میں وہ میرے سے ایک دو سال بڑے ہی ہونگے۔اور اس عمر میں بھی وہ خاصا دوڑ دھوپ کرتے تھے۔ہم اپنی عمر کے لحاظ سے مجبور ہو گئے ہیں کہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔اور غالباً سی آر کی بھی یہی حالت تھی۔

******

عبدالله جان جمالدینی

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شدبه عشق

ثبت است بر جریدهء عالم دوامِ ما

میری بدبختی کہ میں اپنی عمر کے اِس حصے تک اس عظیم انسان سے واقف نہیں ہوا تھا۔یہ تو اب شاہ محمد نے اُن سے تعارف کروادیا۔کئی برس قبل ایک اور بڑے انسان کو بھی وہی میرے گھر لے کر آئے تھے،اُن کو بھی میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا.....انیس ہاشمی۔ بعد میں جب ان کے بارے میں شاہ محمد سے سنا،اور پڑھا تو اندازہ ہوا کہ اِس کی کتنے اچھے انسانوں سے دوستی ہے۔سی آر اسلم تو بہت بڑے انسان تھے۔

مرزا محمد ابراہیم اور سید مطلبی فرید آبادی سے ڈاکٹر خدائیداد نے میری ملاقات کروائی تھی۔سی آر اسلم سے ایک بار فخر زمان کی جانب سے منعقد کردہ ادبی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ پریذیڈیم میں سی آر،ممتاز،اور میں بیٹھے تھے۔میں نے ان کی تقریر سنی اور انہوں نے میری باتیں ۔میں جب واپس اپنی نشست کی طرف آیا تو وہ میرے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

سی آر کو انسان سے محبت تھی،انقلاب سے محبت تھی،سوشلزم سے محبت تھی۔ان کی سوچ بہت اچھی تھی،وہ کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔اپنی تعریف نہیں کرتے تھے۔وہ جنگ کے خلاف

تھے۔ان کی نگاہ میں اچھا سماج وہ ہے جس میں فیوڈل ازم نہ ہو۔وہ مزدور،کسان،عورت ،دانشور،قلم کار اور فن کار کے اتحاد پہ زور دیتے تھے۔ان کا ایمان تھا کہ معاشرہ بہتر ہو سکتا ہے۔

سی آر اسلم صاحب کا عالمی نقطہِ نظر بھی اچھا تھا۔ وہ سامراج دشمن تھے، جنگ و جدل،اسلحہ سازی اور اسلحہ فروشی کو برا سمجھتے تھے۔وہ دنیا میں امن چاہتے تھے،وہ سائنس کو انسان کی بھلائی کیلئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

میری سوچ وہی ہے جو سی آر کی تھی۔کچھ فرق نہیں۔

من جان شدم تو تن شدی
من تو شدم تو من شدی
تا کس نہ گوید بعد ازین
من دیگرم تو دیگری

مجھے معلوم ہے کہ انہیں میری ضرورت نہیں تھی،وہ بہت عظیم آدمی تھے۔مگر میری خواہش ہے کہ اس کتاب میں جہاں سی آر اسلم اور شاہ محمد کا نام آتا ہے وہاں میرا بھی آجائے۔

عبداللہ جان جمالدینی۔

کوئٹہ

جنوری2007

******

(میں نے ماما عبداللہ جان سے 18 فروری 2007 کو لاہور جانے کی بات فون پر بتائی تو وہ مجھے یوں پیغام دے رہا تھا۔۔۔۔۔۔''میری طرف سے سی آر کے ہاتھ کو بوسہ دے دو۔اور کہو''آپ نے زندگی میں بہت اچھے کام کئے۔ مجھے دیر سے خبر ہوئی۔رسالہ سنگت میں شاہ محمد کے ساتھ آپکی خط و کتابت چھپنے کے بعد اندازہ ہوا۔پھر اب جب آپ کی''علم المعیشت''نامی کتاب دوبارہ چھپی تو میں نے پڑھ لی۔اس کتاب نے مجھے زبردست انداز میں گائیڈ کیا۔اُن کے ہاتھ کو چوم کر اُنہیں کہنا۔''(مصنف کا نوٹ)۔

وہ باب، جواَب چھپ نہیں سکتا!

سی آر اسلم پہ لکھی گئی میری یہ کتاب اُس کی زندگی میں مکمل ہوگئی تھی۔مگر اس سے قبل کہ کتاب چھپ جاتی چودھری صاحب نے اس فانی زندگانی کو خیر باد کہہ دیا۔ میں حیران کہ اب اس باب کا کیا کروں۔اسے کتاب سے نکال باہر کردوں یار ہنے دوں،عنوان تھا:

سی آر اسلم! تندرست رہیے!!

سی آر اسلم استواری کے ساتھ سوشلزم سے وفادار رہا۔ وہ لینن کی اس بات پہ پورا اترا کہ:''سوشلزم ایک عظیم کاز ہے۔ اور اس کاز کیلئے انسان کو اپنی پوری زندگی وقف کرنا چاہیے''.....سی آر اپنے نظریے سے وفادار رہا، اُس کی خاطر جور وجفا سہتا رہا، وہ سماجی جبر و تشدد کی وجوہات سے آگاہی رکھتا تھا۔اوراس نے زندگی بھر ظلم کے خلاف لڑنے پر اپنے آپ وقف کر رکھا تھا۔

لوگ ایک عظیم انسان کی طرح اس کی عزت کرتے تھے اور اسے پیار دیتے تھے۔اس نے کسی بھی شخصی مسرت کیلئے سودا بازی کیے بغیر جلا ڈالنے والے جوش اور بے لوث انہماک کے ساتھ عظیم مقصد کے لیے پوری زندگی بتادی۔

آخری چند برسوں میں زندگی کے دوام کا پیامبر سی آر بوڑھا ہو چکا۔ سماعت متاثر

ہوچکی، گھٹنوں کا گریس ختم ہوکر درد کی فیکٹری میں بدل چکا، ہڈیوں کے گودے تک میں بسیرا کرنے والی سردی اسے ہلاک کرتی جاتی۔لکھنے والی انگلیوں کی جنبش چابک دست نہ رہی، گفتگو کے تسلسل کا کورم بار بار طویل وقفوں میں ٹوٹ جاتا، ذرا سا فاصلہ طے کرنا ہوتب بھی ساتھ والے کے بازو میں بازو ڈال کر اس انداز میں چلتا ہے کہ کسی پہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نے سہارا لے رکھا ہے۔اور مختصر فاصلہ ہوتو دیوار کا سہارا اس انداز میں لیتا ہے کہ ساتھ والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ سہارا لیے چل رہا ہے۔اس کے لیے سیڑھیاں چڑھنا پاکستان میں انقلاب لانے کے مترادف ہو چکا۔یادداشت کے سنگِ میل جگہ جگہ سے اکھڑ چکے۔۔۔

اِن آخری برسوں کے میں تو اب وہ مجھے اپنا ساتھی نہیں لاہور ہائی کورٹ میں ملازم سمجھتا ہے۔ میں غلطی پکڑتا ہوں تو اسے اپنی مجروح یادداشت پہ عبداللہ جان کی طرح ہنسی نہیں آتی مگر جب میں کوئٹہ کے بجائے خود کو پشاور کا کہتا ہوں تو وہ پوچھتا ہے، وہاں کوئی کمیونسٹ ہے؟۔اور خود ہی کہتا ہے سب مرکھپ گئے ہیں۔بالآخر جب بتاتا ہوں کہ کوئٹہ سے ہوں تو کہتا ہے' وہاں تین کمیونسٹ ہیں۔عبداللہ جان جمالدینی کا نام وہ خود لے لیتا ہے بقیہ دو کا نام ہم دونوں نہیں لیتے (مجھے پتہ ہے کہ اور کوئی ہے نہیں اور اُسے کسی اور کا نام یاد نہیں)۔مگر پھر خود ہی راہنمائی کرتا ہے .....''خیر چھوڑو'' تین ہیں تو تین سو بن جائیں گے''۔اور میں یہی پیغام لے کر لوٹتا ہوں: ''تین ہیں تو تین سو بن جائیں گے''۔

اب اُس کی صرف ایک ڈیوٹی رہ گئی۔۔۔اپنی محنت سے اگائی گئی ہوئی فصل کو تیار ہوتے دیکھتے رہنا۔جمہوری تحریک کے اپنے شاگردوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلائے رکھنا۔اُن کی ہمت بڑھاتے رہنے کی خاطر زندہ رہنا۔تندرست رہنا، صحت مند رہنا۔۔۔۔اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسا کرے گا، ایک انقلابی فریضہ کے بطور!!!

ارے؟

مگر زندگی میں پہلی بار سی آر اسلم نے ایک زیادتی کی ۔۔۔اس نے بغیر پیغام بھیجے، مطلع کئے، خط لکھے، ٹیلیفون کیے دس جولائی 2007 شام سات بجے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند

کرلیں۔پہلی بار اس نے اپنے رفیق ملک محمد علی بھارا کے ذریعے ہنگامی طور پر مجھے لاہور بلوایا' اپنے جنازہ میں شرکت کے لئے ۔ چوہدری جی! قول کس نے توڑا، مجھ بلوچ نے یا آپ نے جس کی وفاداری کی میں قسمیں کھاتا ہوں۔کروڑ ڈیڑھ کروڑ کے لاہور شہر میں ہزاروں بنگلے کاروں والے تھے،ان میں انقلاب کا پٹہ پہنے دنیادار سگ بھی تھے مگر میری افتادطبع تم پر،ٹمپل روڈ پر تمھارے بے مالکن چھوٹے مکان پہ تھی،اسے بھی تم نے بند کرڈالا!!۔حساب وہیں کرلیں گے!!

******

تدفین کے روز سی آر اسلم کی قبر پر پھول نچھاور کرنے والوں میں شامل، میں یہ سوچ رہا تھا: سی آر اسلم کی قبر پر یوں تو انسانوں کی فلاح کے بے شمار پھول کھلیں گے ۔مگر سب سے اونچا، خوبصورت اور معطر پھول تو ایک ہوگا.....امید کا پھول۔وہ حوصلہ بانٹنے والا انسان تھا۔امید دینے والا۔

کسی نے بھی اس دنیا میں ابد تک نہیں رہنا۔اس لیے اس چہار روزہ زندگی میں اپنے انسان بھائی کی خدمت ہی کرتے رہنا چاہیے۔انسان کے راستے کے کانٹے روڑے ہٹاتے رہنے چاہییں۔اندھیروں میں روشنی بن کر' مصیبت میں ساتھی بن کر،ضرورت مند کا ساتھ دے کر،ظالم سے مصالحت نہ کرکے' جنگوں وباؤں اور آفات کی صورت انسان کے دشمنوں سے نبرد آزما ہوکر،معاشی ناہمواریوں،صنفی امتیازات،نسلی لسانی تعصّبات سے چھٹکارے کی راہیں تلاش کرکے اور مظلوم انسانوں اور قوموں کیلئے وسیع تر آزادیوں کے حصول کو ممکن بناتے زندگی گزارنی چاہیے۔

سی آر اسلم انہی اوصاف کا مجسم نمونہ تھا۔اسے کروٹ کروٹ آرام نصیب ہو۔

حوالہ جات

1۔خاکوانی،م۔ہ۔شخصیت۔روزنامہ ایکسپریس لاہور۔20 ستمبر 2006

2۔ایضاً

3۔ایضاً

4۔سرجیت،ہرکشن سنگھ''دی ہسٹری آف دی کسان سبھا''1995۔نیشنل بک ایجنسی کلکتہ۔صفحہ 46

5۔ہفت روزہ''عوامی جمہوریت''لاہور۔جلد 25۔1996۔صفحہ 4

6۔ایضاً

7۔میرزا'اسلم رحیل۔''پنجاب کے انقلابی راہنما''1995۔ایشین پبلشرز۔اردو بازار لاہور

8۔ملک،عبداللہ۔پرانی محفلیں یاد آرہی ہیں۔2001 تخلیقات۔لاہور۔صفحہ 208

9۔ اسلم،سی آر۔پاکستان میں سوشلسٹ تحریک کا ایک مختصر جائزہ''، پاکستان سوشلسٹ پارٹی5 میکلوڈ،لاہور،سال اشاعت نہ دارد۔صفحہ 6

10۔ایضاً

11۔زرعی رپورٹ،پاکستان سوشلسٹ پارٹی مارچ1986 صفحہ 8

12۔اسلم۔سی آر پاکستان میں سوشلزم کا راستہ۔سال اشاعت نہ دارد۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی۔5 میکلوڈ روڈ لاہور۔صفحہ 10-11

13۔ہفت روزہ عوامی جمہوریت لاہور۔9 ستمبر 1975 صفحہ 2

14۔ایضاً صفحہ 3

15۔تیسری سوشلسٹ کانفرنس کی سیاسی رپورٹ۔5-1986 میکلوڈ روڈ لاہور۔صفحہ 22

16۔تیسری سوشلسٹ کانفرنس کی سیاسی رپورٹ۔1986،5- میکلوڈ روڈ لاہور۔صفحہ 19

17۔زرعی رپورٹ،پاکستان سوشلسٹ پارٹی مارچ1986 صفحہ 26

18۔اسلم' سی آر'' کمیونزم زندہ ہے،زندہ رہے گا''۔عوامی جمہوریت پبلی کیشنز لاہور۔سال اشاعت ندارد۔صفحہ 15

19۔ایضاً،صفحہ 15

20۔اسلم۔سی آر۔عالم اسلام مبتلائے زوال کیوں ہے'1971۔میکلوڈ روڈ لاہور۔صفحہ 12
21 ۔اسلم ،سی آر۔اس عہد کی نئی حقیقتیں اور ان کے تقاضے۔سالِ اشاعت نہ دارد۔عوامی جمہوریت پبلی کیشنز لاہور۔صفحہ 11
22۔ایضاً
23۔مطلّبی ،فرید آبادی۔تعارف علم المعیشت ۔مصنف: سی آر اسلم۔2000۔سنگت اکیڈمی آف سائنسز۔صفحہ 13
24۔اسلم ،سی آر۔اس عہد کی نئی حقیقتیں۔صفحہ 11
25۔میرزا۔اسلم رحیل۔جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔2003۔مکتبہ نئی روشنی لاہور۔صفحہ نمبر 45۔
26۔مرزا صفحہ 58۔
27۔صفحہ 117۔

ضمیمہ جات

ضمیمہ:1

سیاسی رپورٹ

1973ء

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی پہلی ورکرز کانفرنس منعقدہ فروری 1972 میں جو سیاسی پروگرام منظور کیا گیا تھا اور قومی اور بین الاقوامی سیاسی معاملات کا جو تجزیہ کیا گیا تھا (جو پارٹی کے منشور اور متعدد قراردادوں کی شکل میں شائع ہوا) آج بھی بنیادی طور پر درست ہے۔ تجربے نے ثابت کیا ہے کہ عالمی طور پر یہ عہد تمام تر مشکلات اور پیچیدگیوں کے باوجود سامراج کی پسپائی اور شکست کا عہد ہے۔ ہند چینی میں عام طور پر اور ویت نام میں بالخصوص حریت پسند عوام کی پیہم جدو جہد کے سامنے اس عہد کے سب سے بڑے وحشی اور خونخوار امریکی سامراج کے قدم نہیں ٹھہر سکے۔ عرب دنیا میں جنوبی یمن کی عوامی جمہوریہ کا قدم بقدم مستحکم ہونا اور اس کے ساتھ ہی مشرق وسطےٰ کے دوسرے عرب اور غیر عرب ممالک میں اس تشدد کے باوجود جو وہاں کے رجعت پسند طبقوں اور ان کے زیر اثر حکومتوں اور ان سب کی پشت پناہی کرنے والے امریکی سامراج نے جاری کر رکھا ہے، وہاں کے آزاد خیال ترقی پسند اور انقلابی گروہوں اور جماعتوں کا مسلسل سامراج دشمن حکومتوں کے قیام، افریقی اتحاد کی تنظیم میں سامراج دشمن عناصر کی بڑھتی ہوئی طاقت، انگولا اور موزنبیق میں جدوجہد آزادی کا آگے بڑھنا بھی بتدریج سامراج کی پسپائی کا ثبوت ہے۔ لاطینی امریکہ میں کیوبا کی سوشلسٹ حکومت کا مستحکم ہونا، چلّی میں انتخابات میں ایک مارکسی رہنما کا ریاست کا صدر منتخب ہونا، اور اسمبلی میں بڑی تعداد میں ترقی پسند جماعتوں کے نمائندوں کا منتخب

ہونا، اور دوسرے ممالک میں سامراج دشمن تنظیموں کی سرگرمیوں میں اضافہ امریکی سامراج کے خلاف عوام کے محاذ کی بڑھتی ہوئی طاقت کا یقین دلاتا ہے۔ خود امریکہ کے اندر ایک طرف رائے عامہ کا اپنے ملک کے برسر اقتدار طبقوں کی سامراجی سیاست کے خلاف زیادہ سے زیادہ منظّم ہونا اور دوسری طرف امریکی معیشت اور ڈالر کے بحران میں دن بدن اضافہ امریکہ کی عالمی معاشی اور سیاسی بالادستی کے راستے میں رکاوٹیں بن رہا ہے۔

ایک طرف تو بین الاقوامی سامراجی نظام اور اس کا سرغنہ امریکی سامراج قدم بقدم پیچھے ہٹ رہا ہے اور دوسری طرف سوشلسٹ ممالک اپنی داخلی معیشت اور عالمی سیاست میں پہلے سے زیادہ منظّم اور مضبوط ہو رہے ہیں۔ عالمی سوشلسٹ نظام کی مضبوطی ہی کا نتیجہ ہے کہ مشرق و مغرب کے سوشلسٹ ممالک سرمایہ دار دنیا سے بالمقابل تجارت کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اور سرمایہ دار دنیا ان ممالک سے معاشی تعلقات استوار کرنے اور ان پر سے تجارتی اور سیاسی پابندیاں اٹھانے پر مجبور ہوئی ہے۔

ان تمام شہادتوں کے باوجود یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں انقلاب اپنا پرچم کھولے تیار کھڑا ہے اور ایک ہی عوامی کروٹ ان ممالک کو انقلاب سے ہمکنار کر دے گی۔ ان براعظموں کے اکثر ممالک میں ابھی منظّم عوامی قوتیں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور کئی ملک ابھی معاشی اور سماجی اور سیاسی اعتبار سے انقلاب سے دور ہیں۔ بعض ممالک ایسے بھی ہیں جہاں وقتی طور پر انقلاب کی قوتیں پسپا بھی ہوئی ہیں۔ ان براعظموں کے بہت سے حصوں میں آج سے چند سال پہلے قومی آزادی اور سامراج دشمن تحریکات جس تیزی سے ابھری تھیں ان میں سے اکثر قومی رجعتی عناصر کی حکومتوں کی صورت میں منتج ہوئی ہیں اور اب وہاں جدوجہد کی نئی شکلوں کا تقاضہ کرتی ہیں۔ اسی طرح یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں سماجی تبدیلی اور انقلاب کا عمل پیچیدہ ہو گیا ہے۔ نیم براعظیم ہندو پاک میں ہندوستان کی پسماندہ زرعی معیشت کے باوجود اس کی ترقی پذیر سرمایہ داری اس تمام علاقہ اور خود ہندوستان کے عوام اور ان کی جدو جہد انقلاب کے راستے میں پیچیدہ مسائل پیدا کرنے کا

باعث بنی ہے ۔۔۔۔ ان گوناگوں قومی علاقائی اور بین الاقوامی مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سوشلسٹ برادری کے دو رہنما ملکوں کے درمیان مسلسل کھچاؤ اور محاذ آرائی کے سلسلہ نے بھی انقلاب اور جدوجہد کے راستوں کو دشوار تر کر دیا ہے۔

پارٹی کے بنیادی منشور نے پاکستان کی قومی سیاست کی تاریخ اور ہم عصر سیاسی معاشی حالات کا جو تجزیہ کیا تھا، وہ بھی آج اُسی طرح درست ہے۔ ہمارے ملک کی معیشت بنیادی طور پر نیم نوآبادیاتی طرز کی ہے یعنی یہ کہ یہاں کی صنعتی اور تجارتی سرمایہ داری کا بڑا حصہ سامراج کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور اس کا محتاج ہے۔ یہاں کی معیشت کا بنیادی ڈھانچہ پسماندہ جاگیرداری زراعت پر مبنی ہے اور ہمارا ملک اب بھی خام مال کی منڈی کی معیشت رکھتا ہے۔ اس نیم نوآباد یاتی معاشی نظام پر جو سیاسی اور سماجی ڈھانچہ کھڑا ہے وہ انہی پس ماندہ رشتوں اور استحصالی طریقوں کی حفاظت کے لیے قائم ہوا ہے جس کا اظہار نوکر شاہی کے ظلم، فوج کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، جمہوریت کے فقدان تعلیمی نظام کی بے معنویت، مذہب کی رجعتی تاویلوں، عوام دشمن قوانین کے نفاذ، علم ادب فن اور نظریات میں قدیم وجدید رجعتی فلسفوں کو شعوری طور پر پھیلانے سے ہوتا ہے۔۔۔ بنیادی منشور کے ان الفاظ کی سچائی آج تجربے نے درست ثابت کی ہے کہ:

''جب تک ہمارے ملک کا نظام سامراجی قرضوں سے پلنے والی اجارہ دارانہ سرمایہ داری اور جاگیردارانہ معیشت پر مبنی رہے گا، یہاں نہ سچی جمہوریت قائم ہوسکتی ہے اور نہ علاقائی خودمختاری اور قومیتوں کے مسائل کا صحیح حل ممکن ہے۔

اسی تجزیئے کی روشنی میں بنیادی منشور نے سوشلسٹ تحریک کے لیے جو لائحہ عمل تجویز کیا تھا وہ قرضوں اور سامراج کے سیاسی، معاشی اور سماجی اثرات، جاگیرداری نظام اور سامراج کی کاسہ لیس بڑی صنعتی اور تجارتی سرمایہ داری اور اس کی نوکر شاہی کے خلاف مسلسل اور پیہم عملی اور نظری جدوجہد سے عبارت تھا۔ اس جدوجہد کے لیے تمام محبِّ وطن سامراج دشمن اور جاگیردار مخالف عناصر کے متحدہ محاذ کی تشکیل ایک بنیادی کام ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے

وقت سے ہی پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے یہ واضح موقف اختیار کیا تھا کہ ہمارا ملک پہلے سے بھی زیادہ سامراجی، معاشی اور سیاسی گرفت میں جکڑا جائے گا۔ پارٹی کا یہ موقف ملک کے معاشی حالات اور پیپلز پارٹی کی قیادت کے طبقاتی تجزیئے پر مبنی تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے ہمارے ملک کی سیاسی اور معاشی بنیادوں کو جس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، وہ خود اس بات کی طرف واضح اشارہ تھیں کہ پرانے نظامِ معیشت اور طریقِ سیاست ہی کو چلانے والے بڑے پیمانے پر عالمی سرمایہ داری نظام اور اس کے سرغنہ امریکی سامراج پر اور زیادہ انحصار کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔۔۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ پیپلز پارٹی جو اپنی اعلیٰ قیادت کے اعتبار سے ملک کے فرسودہ جاگیرداری زرعی نظام سے جڑی ہوئی ہے اور چھوٹی قیادت کے اعتبار سے پیٹی بورژوا موقع پرست اور بے ضمیر عناصر پر مشتمل ہے، ملک کی تعمیرِ نو کے نعروں اور اعلانات کے باوجود کوئی نیا راستہ اختیار نہیں کر سکتی۔۔۔ پاکستان کی تعمیرِ نو، سامراجی قرضوں پر مزید انحصار اور جاگیرداری نظام کے عوام دشمن ڈھانچہ کو قائم رکھتے ہوئے ناممکن ہے۔ تعمیرِ نو کے لیے نئی معاشی بنیادیں استوار کرنا ضروری ہیں اور ہمارے ملک میں سامراجی قرضوں اور دوسری سرمایہ کاری کو ضبط کر کے ان پر انحصار ختم کرنے، پبلک سیکٹر میں بنیادی صنعتیں قائم کرنے اور جاگیرداروں سے بلا معاوضہ زمین لے کر کسانوں میں تقسیم کرنے کے بغیر کوئی تعمیرِ نو ممکن نہیں۔ تعمیرِ نو فرسودہ نظام کو بیساکھیوں سے چند روز قائم رکھنے کا نام نہیں۔ یہ نام ہے ملکی معیشت اور سماجی رشتوں میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا۔ ایسی تبدیلیاں چونکہ مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کش عوام کی باشعور اور منظّم تحریک کی زبردست جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں اور چونکہ یہ تحریک اس صورت میں ہمارے ملک میں موجود نہیں تھی، اس لیے ہماری پارٹی نے اپنے ملک کے معاشی اور سیاسی حالات اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے بارے میں جو تجزیہ کیا تھا اس کی درستی کے بارے میں دورائے نہیں ہو سکتی تھیں۔ تاہم پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے اس موقف کے خلاف بہت سے نام نہاد انقلابی عناصر نے بڑی شدومد سے پراپگنڈہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے خلاف یہ مہم 1969-70 سے ہی جاری تھی۔ اُس وقت یہ کہا گیا تھا کہ ہماری قیادت محض اپنی لیڈرشپ محفوظ رکھنے کی خاطر

پیپلز پارٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے نالاں ہے ورنہ پی پی پی تو محنت کش عوام کا ایک سیلاب ہے ۔اور یہی تحریک مستقبل میں ایک بھرپور انقلابی تحریک کی شکل اختیار کرے گی۔اور اپنی اس پیٹی بورژوا موقعہ پرستی کو چھپانے کے لیے انقلابی الفاظ اور نعروں کا سہارا لیا گیا۔کہا گیا کہ سچا انقلابی وہ ہے جو ماؤزے تنگ کے الفاظ میں عوام سے سیکھتا ہے اور عوام کا ساتھ دیتا ہے۔اور چونکہ عوام اس وقت پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے اس لیے عوام سے سیکھنے اور ان کی ہمرکابی کے لیے پیپلز پارٹی کو مضبوط کرنا ضروری ہے۔۔۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی ماؤزے تنگ اور ان سے پہلے لینن اور مارکس کے فلسفہ انقلاب سے ناواقف نہ تھی۔وہ یہ جانتی تھی کہ عوام سے سیکھنے کے لیے ضروری نہیں کہ انقلابی کارکن سامراج نواز عوام دشمن طبقات پر مشتمل لیڈرشپ کو اپنے سروں پر مسلط کرلیں ۔محض اس لیے کہ یہ قیادت وقتی طور پر سچی انقلابی قوتوں کی کمزوری، محنت کش طبقات میں سیاسی شعور کی ناپختگی اور اپنے بے پناہ وسائل کی بنیاد پر عوام کے بڑے حصہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔عوام سے سیکھنے کے لیے ان کی طبقاتی جدوجہد سے اپنے آپ کو منسلک کرنا ضروری ہے لیکن اس جہالت پسماندگی اور شعوری بے چارگی کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہرگز ضروری نہیں جو صدیوں پرانے طبقاتی نظام اور اس کے جدید مبلغین نے ہمارے عوام میں پھیلا رکھی ہے ۔انقلابی کارکن عوام کی طبقاتی جدوجہد میں شریک ہوتا ہے، اس سے اپنے تجربے کو مالا مال کرتا ہے اور پھر اپنے سائنٹیفک شعور اور اس تجربے کا نچوڑ عوام میں تنظیمی اور شعوری سطحوں پر پھیلا دیتا ہے نہ کہ اپنے آپ کو بورژوا سامراج دوست قیادت کا پرچم بردار بنالیتا ہے۔اور اس دھوکے اور فریب کے جال کو انقلابی الفاظ کی مدد سے مضبوط تر کرتا ہے جو ان مفاد پرستوں نے عوام کو قابو کرنے کے لیے پھیلایا ہوتا ہے۔۔۔ ہمارے خلاف اس مہم نے اگرچہ ان نام نہاد انقلابیوں کی انقلاب پسندی کا بھرم کھول دیا ہے لیکن سچی سوشلسٹ تحریک اور سامراج دشمن محاذ کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔اگر ایک لمحہ کے لیے یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ نام نہاد انقلابی پیپلز پارٹی کی سیاسی یلغار اور اس کے سطحی انقلابی نعروں کی وجہ سے درست تجزیئے میں ناکام رہے تو پھر اس بات کا کیا جواز ہے کہ آج بھی یہ نام نہاد ترقی پسند اپنے اخباروں کے کالموں، ریڈیو، ٹیلی وژن، کالجوں،

یونیورسٹیوں اور اپنے سیاسی گروپوں میں موجودہ حکومت کی کھلی عوام دشمنی اور سامراج نوازی کے باوجود اسی کے نقارچیوں کا کام کر رہے ہیں؟۔۔۔ اور نہ صرف یہ بلکہ سوشلسٹ تحریک اور بالخصوص پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی کھل کر مخالفت کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ پارٹی اور اس کی سرگرمیوں کا ذکر کسی اخبار کے صفحات تک نہ پہنچے۔شاید یہ نام نہاد دانشور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی کرائے پر بکنے والی دانش کے بغیر سوشلزم کی تحریک آگے نہیں بڑھ پائے گی اور انقلاب کا قافلہ رک جائے گا۔ ہر رجعت پسند اپنے آپ کو پہاڑ سمجھتا ہے اور انقلابیوں کو چیونٹیاں ،لیکن انقلابی عمل کے دوران یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں اور انقلابی دانش رجعتی دانش کو شکست دے دیتی ہے۔ ہمارے سماج میں یہ عمل نظریاتی سطح پر مسلسل جاری ہے اور ہر قدم پر ان نام نہاد ترقی پسند دانشوروں کو ہزیمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔

پچھلے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بھٹو حکومت کی کارکردگی پر نظر ڈالیے۔پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے وقت جو مسائل ملک کو درپیش تھے ان میں نمایاں یہ تھے:

1۔جن اسباب نے پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ان کا تجزیہ اور ان کا ازالہ

2۔ملکی معیشت کے بحران کا تجزیہ اور اس بحران کو دور کرنے کے لیے اقدامات

3 پاکستان کے خارجہ تعلقات کی منصوبہ بندی۔ یہ تینوں معاملات ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کے دو حصوں کے درمیان کش مکش کی بنیاد درحقیقت اُس معاشی سیاسی نظام میں ہی مضمر تھی جس کی پرورش ہمارے ملک کے مفاد پرست طبقات نے آزادیِ وطن کے بعد بھی کی تھی۔جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے معاشی طور پر یہ نظام ایک ایسی زرعی معیشت پر مشتمل ہے جس میں چند ہزار خاندان ملک کی لاکھوں ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔کاشت کار ان بڑے مالکوں کے رحم وکرم پر ہے۔ پیداوار کا بڑا حصہ انہی جاگیرداروں کے قبضہ میں جاتا ہے جو ذخیرہ اندوزی، سمگلنگ اور چور بازاری کے نظام کی پرورش کرتا ہے اور ملک کو آئے دن قحط سالی کا شکار کرتا ہے۔کسانوں کا براہِ راست استحصال اور پورے ملک کی آبادی کا بالواسطہ استحصال اس جاگیردارانہ زرعی

معیشت کا خاصہ ہے۔ یہ جاگیردارانہ معیشت اپنی سخت ترین شکل میں مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان کی نسبت زیادہ شدت سے موجود تھی۔ چنانچہ ان مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور ان کی سیاسی جماعتوں کا اقتدار بھی مرکزی حکومت پر قائم رہا۔۔۔ اس معاشی نظام کا دوسرا رُخ سامراجی اور دوسرے قرضوں سے پیدا ہونے والی صنعتی اور تجاتی سرمایہ داری تھی۔ تاریخ اعتبار سے اس سرمایہ داری کو فروغ بھی مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں ہی ہوا، اس صنعتی اور تجارتی طبقہ نے بھی حکومت اور اس کی نوکر شاہی کے ذریعے اقتدار میں بالواسطہ اور براہِ راست حصہ حاصل کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صنعتی اور تجارتی طبقہ بڑی حد تک بڑی نوکر شاہی کا مرہونِ منت تھا اور خود نوکر شاہی کے بہت سے افراد اس طبقہ میں معاشی طور پر شامل ہوگئے تھے۔ بڑی نوکر شاہی کا غالب حصہ بھی مغربی پاکستان کے ملازمینِ سرکار پر مشتمل تھا۔ چنانچہ ریاستی اقتدار میں براہِ راست اور بالواسطہ مغربی پاکستانی جاگیرداروں اور صنعتی اور تجارتی سرمایہ داروں اور ان کی پروردہ نوکر شاہی کا حصہ رہا۔۔۔ مسلح افواج بھی مغربی پاکستان ہی کے علاقوں سے ترتیب دی گئیں اور اس طرح ملک کے دفاعی اخراجات جو ملکی بجٹ کے 70۔75 فیصد حصہ پر مشتمل تھے فی الحقیقت مغربی پاکستان ہی میں استعمال ہوئے۔۔۔ مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی اور تعلیم کی شرح بھی یہاں سے آگے۔۔۔ اس کے تعلیم یافتہ عناصر' مڈل کلاس اور چھوٹے موٹے تاجر اور صنعت پیشہ مشرقی پاکستانی پورے پاکستان میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے اور اس نفسانفسی کے نظام میں اپنا حصہ حاصل کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور دوسری طرف مغربی پاکستان کے جاگیردار اور اجارہ دار تاجر اور سرمایہ دار اور ان کی حفاظت کرنے والی سیاسی مشینری، مشرقی پاکستان سمیت سارے ملک پر حکمرانی اپنا حق سمجھتی تھی۔۔۔ اس تسلط کی مخالفت اس زمانے میں سالمیتِ وطن کی مخالفت سمجھی جاتی تھی، اور اس تسلط کو قائم رکھنا نظریہِ پاکستان اور سالمیت کے عین مطابق بیان کیا جاتا تھا۔۔۔ مشرقی پاکستانی میں زبان کی تحریک سے اس مغربی پاکستان مفاد پرست اقتدار کی مخالفت شروع ہوئی۔ کبھی مشرقی پاکستانی نمائندوں کے سمجھوتے کے نتیجہ میں یہ تحریک سست پڑگئی اور کبھی ان سمجھوتوں کے منطقی خاتموں کے بعد یہ تحریک زیادہ ابھری تا آنکہ

ایک طرف یہ تحریک آزاد بنگال کے نعروں کے ساتھ ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کرگئی اور بائیں بازو کی تحریکوں کی کمزوری اور نظریاتی الجھنوں کے باعث مشرقی پاکستان کے ابھرتے ہوئے تاجر، سرمایہ دار اور اوپری اور درمیانہ طبقہ کی قیادت کے پیچھے وہاں کی آبادی کی غالب اکثریت برسرِ پیکار ہوئی۔ اور دوسری طرف مغربی پاکستان میں سچی جمہوریت اور ترقی پسند تحریک کی پسماندگی کے باعث مفاد پرستوں کی مختلف جماعتوں اور ان کی حفاظت کرنے والی حکومت اور فوجی آمریت اور نوکر شاہی نے اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے سالمیت اور نظریہ پاکستان کا ڈھونگ رچا کر اپنے ہی ملک کے ایک حصہ پر ننگی جارحیت کا ارتکاب کیا۔۔۔ یہ بھی درست ہے کہ مشرقی پاکستان میں اس سیاسی کش مکش کی پشت پناہی سب سے اول بین الاقوامی طور پر امریکی سامراجیوں نے کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستانی مفاد پرست طبقات اور ان کی آمرانہ حکومت بھی سامراج کی کاسہ لیس تھی۔ دراصل امریکی سامراج ہر قیمت پر پاکستان کے دونوں حصوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا، چاہے یہ نتیجہ ایک سالم پاکستان میں حاصل ہو یا پاکستان کے ٹکڑے کرکے۔

جب علاقائی کشمکش کی یہ صورت ہو تو ہندوستان کی سرمایہ دار ریاست سے یہ امید کرنا کہ وہ اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے اس کشمکش پر اثر انداز نہ ہوگی عبث تھا۔۔۔ پاکستان کی 24۔25 سالہ سیاسی زندگی میں ہندو پاک نیم برعظیم میں جس طرح باہمی منافرت اور جنگ کی فضا قائم کی گئی اور مفاد پرست حکومتوں نے اپنے اپنے ملکوں کے عوام کے مسائل حل کرنے کی جگہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کی موجودگی میں ہندوستان کا کوئی دوسرا رویہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا موقف اول روز سے یہ تھا، کہ جب تک یہ مفاد پرستانہ نظام قائم ہے یہ علاقائی کش مکش اور بے چینی لازمی ہے۔ تاہم فوری طور پر مشرقی پاکستان کے مسئلہ کا حل سیاسی ہے نہ کہ فوجی کارروائی۔۔۔ اور جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کی بنیاد پر اسے طے کیا جانا چاہیے۔۔۔ ہمارے اس موقف کی بھی نام نہاد انقلابی حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ

حکومتِ پاکستان کا فوجی الیکشن درست ہے۔اور بعض نے تو اس ایکشن کو زبردست حبِ وطنی کا سرٹیفکیٹ بھی دیا۔۔۔ بہرحال ہم تاریخ کے شکرگزار ہیں کہ اس نے ہمارے موقف کو درست قرار دیا اور ان انقلابیوں کو موقعہ پرستی کو ننگا کر دیا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک بنگلہ دیش اب ایک آزاد مملکت ہے اور اسے تسلیم کر لینا سیاسی منطق کے عین مطابق ہے۔ بنگلہ دیش حکومت وہاں کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں اور بیٹی بورژوا عناصر سے مرتب ہوئی ہے۔سماج کا بورژوا نظام قائم رکھنے کے لیے وہ عالمی سرمایہ داری نظام پر انحصار کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہندوستان سے اس کا موجودہ رشتہ بھی اسی طبقاتی معاشرے کو قائم رکھنے کی خاطر ہے۔ بنگلہ دیش میں عوامی طاقتیں دوبارہ منظّم ہو رہی ہیں اور ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ جدوجہد سامراج دوست بورژوا حکومت اور طبقات اور عوام کے درمیان ہے۔ بورژوا حکومت کے قیام کے باوجود بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ترقی پسند قوتوں کے حق میں جاتا ہے اس لیے کہ نیم براعظم کے تینوں ملکوں کے برسرِ اقتدار طبقوں کے ہاتھوں میں عوام کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور عوامی جدوجہد میں ہم آہنگی روکنے کے لیے منافرت اور محاذ آرائی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہاں کی اجارہ دار صنعت کو دھچکا لگا اور اس استحصالی نظام کے کھوکھلے پن کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ بین الاقوامی سامراجیوں نے پاکستان کی معاشی امداد بند کر دی اور اس بات پر زور دیا کہ پاکستان اولاً بنگلہ دیش سے اپنے معاملات نبٹائے۔ یہ دباؤ بھی بڑھا کہ پاکستان اپنے روپے کی قیمت کم کرے تاکہ یہاں کا خام مال بین الاقوامی منڈی میں سستے داموں فروخت ہو سکے۔اور یہ مشورے بھی دیے گئے کہ اب آدھا پاکستان اپنی حیثیت کے مطابق رہے۔ اور سامراجیوں کے حاشیہ نشینوں کا حاشیہ نشین بن کر زندگی بسر کرے۔۔۔ اندرون ملک معاشی بحران مہنگائی اور بے روزگاری کی بدترین شکلوں میں ظاہر ہونے لگا۔۔۔ ایسے حالات میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے وہی راستہ اختیار کیا جو اسے اپنی قیادت کی طبقاتی ساخت اور اپنی کھوکھلی سیاست کے حوالے سے کرنا چاہیے تھا۔یعنی جاگیردارانہ نظام معیشت کو ختم کرنے کی بجائے چند سطحی زرعی اصلاحات سے آگے نہ بڑھی۔ سامراجی قرضوں اور ان کے

کروڑوں روپے سالانہ کے سُود کو یک قلم منسوخ تو کیا کرتی، حکومت نے مزید قرضوں کی تلاش میں چاروں طرف اپنے نمائندے دوڑا دئے۔ بین الاقوامی سرمایہ داروں کی خواہش کے مطابق اور ملکی بڑے سرمایہ داروں اور تاجروں کے مفادات کی نگہداشت کرتے ہوئے روپے کی قیمت میں زبردست کمی کا اعلان کر دیا۔ اندرونِ ملک ملازم پیشہ لوگوں اور مزدوروں کی مہنگائی کے خلاف آواز کو نئے پے سکیلوں کے اعلان سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں چند روپوں کا اضافہ تو آمدنیوں میں ضرور ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی قیمتوں میں کئی گنا اضافے نے تنخواہوں کے نئے سکیل بے معنی بنا دیے۔۔۔ اضافی تنخواہوں اور دوسرے غیر پیداواری منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے بے شمار کرنسی ملک میں پھیلا دی گئی۔ غلہ، گھی، خام مال حتّٰے کہ سبزی اور انڈے مرغی تک کی برآمد کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا کہ اندرونِ ملک اشیائے ضرورت کا قحط پیدا ہو گیا۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسی بوسیدہ نظامِ معیشت کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔۔۔ اس معاشی بحران مہنگائی بے روزگاری، افراطِ زر اور شہری اور دیہاتی محنت کشوں کی زندگی کی بڑھتی ہوئی مشکلات کا رخانے داروں کے تشدد اور جاگیرداروں کے استبداد کے خلاف اگر کسی نے چوں بھی کی تو عوامی حکومت کی نوکر شاہی، پولیس اور پالتو غنڈوں نے تشدد کا بازار گرم دیا۔ کسانوں کو بے دخل کیا گیا، مارا گیا اور ان کے گھروں کو جلایا گیا۔ مزدوروں کو گولیوں سے نوازا گیا اور سیاسی کارکنوں کی زندگی اجیرن کر دی گئی اور بعض کو قتل کروا دیا گیا۔۔۔ یہ کھلی اور ننگی فسطائیت صرف محنت کشوں اور ان کے ہم نواؤں پر ہی استعمال نہیں کی گئی بلکہ اس کا وار ایسے تمام سیاسی عناصر پر ہوا اور ہو رہا ہے جو خود بھی اسی طبقے کے مختلف حصوں کے نمائندہ ہیں یا ان کی وکالت کرتے ہیں جن سے موجودہ حکومت نے ترتیب پائی ہے۔ اپنے اس فاشسٹ عمل کو مضبوط تر کرنے کے لیے حکومت نے نیم فوجی تنظیموں کی بنیاد بھی ڈالی جن میں فیڈرل سیکورٹی فورس تو اب عرصہ سے استعمال کی جا رہی ہے لیکن نئی نام نہاد عوامی فوج ابھی اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں ہے۔۔۔ حکومت کی ان دھاندلیوں، غیر جمہوری اقدامات اور عوام کے خلاف ننگی معاشی اور سماجی جارحیت میں پیپلز پارٹی کے وہ کارکن بھی پیش پیش ہیں جن کو عوام کا نام دیتے ہوئے ہمارے نام

نہاد انقلابیوں کی زبان نہ تھکتی تھی۔ ان کارکنوں نے بلیک مارکیٹ، سفارش، بے ایمانی، رسہ گیری اور دوسری تمام بداخلاقیوں سے عوام کو ہراساں کیا اور ان حالات کے خلاف آواز بلند کرنے والے شہریوں کو اپنے تشدد کا نشانہ بنایا۔۔۔ پیپلز پارٹی اور اس کی حکومت کی اس عوام دشمن روش نے خود اسی پارٹی کے بعض عناصر کو بھی جواباً اسی تشدد کا شکار ہونا پڑا جو عوام کا مقدر بنا ہوا ہے۔

پاکستان کا داخلی نظام چونکہ انہی پرانی معاشی اور سماجی بنیادوں پر قائم رہا جو پیپلز پارٹی کے اقتدار سے پہلے موجود تھیں۔ اور چونکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سبب اس فرسودہ نظام کے کھوکھلے پن میں اور زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اس لیے لازم تھا کہ برسرِ اقتدار طبقہ بین الاقوامی سرمایہ داری پر اپنے انحصار کو اور زیادہ شدید کر دیتا۔ معاشی اعتبار سے اس طرف جو قدم اٹھائے گئے۔ ان کا تذکرہ پہلے ہوا ہے۔ سیاسی اعتبار سے سینٹو کو دوبارہ تیز تر کرنا اور مشرقی وسطیٰ کے رجعتی حکمرانوں سے اپنے آپ کو اور زیادہ جوڑنا اس کا دوسرا پہلو تھا۔ ویت نام کی جمہوریہ یا مشرقی جرمنی کو تسلیم کرنا، پاکستان کی حکومت کی بڑھتی ہوئی سامراج دوستی کو نہیں چھپا سکتا۔ کیونکہ ویت نام اور جرمنی کی حقیقتوں کو آج سامراجی دنیا بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

دسمبر 1970 کے انتخابات میں دو صوبوں یعنی بلوچستان اور سرحد میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہوئی تھی۔ بلوچستان میں تو اُس وقت اس پارٹی کا ایک نمائندہ بھی کامیاب نہ ہوا تھا۔ ان دونوں صوبوں میں دو سیاسی جماعتوں یعنی نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلماء اسلام کے نمائندوں نے آپس میں اتحاد کر لیا اور بلوچستان میں واضح اکثریت حاصل کر لی۔ اور سرحد میں بعض دوسرے عناصر کی حمایت سے اکثریتی گروپ بنالیا۔ مرکزی حکومت کے ساتھ کچھ محاذ آرائی کے بعد ان صوبوں میں ان جماعتوں کی مخلوط حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن سطحی راضی نامے کے باوجود مرکز اور ان صوبائی حکومتوں کے درمیان مکمل اشتراک عمل نہیں تھا۔ مرکز مسلسل اس کوشش میں تھا کہ ان حکومتوں کو برطرف کر کے ایسی حکومت قائم کی جائے جو پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت کو من وطن تسلیم کریں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے صوبہ سرحد میں ابھرتی ہوئی کسان تحریک اور اس کے بائیں بازو کے قائدین کو بھی استعمال کیا۔۔۔ افسوس تو اس بات کا ہے

کہ ہمارے یہ دوست پیپلز پارٹی اور مرکزی حکومت کے آلہ کار بنے۔۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت کی حکومت نہ تو کسی پہلو سے ترقی پسند حکومت تھی اور نہ ہی عوام دوست۔ نیشنل عوامی پارٹی کی بالائی قیادت کا بڑا حصہ (بالخصوص وہ جو صوبہ سرحد سے تعلق رکھتا ہے) جاگیردار سرمایہ دار طبقات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ پارٹی نہ تو ملک میں ہمہ گیر تبدیلیاں لانے کی اہل ہے اور نہ ہی اس کی طبقاتی ساخت کا یہ تقاضہ ہے۔ اس میں ویسے عناصر بھی موجود ہیں جو سیدھے سوشلسٹ دشمن ہیں۔ اپنے مختصر سے زمانہِ اقتدار میں اس مخلوط حکومت نے نہ صرف یہ کہ عوامی فلاح کا کوئی نمایاں کام نہیں کیا بلکہ کنبہ پروری اور اقربا نوازی کے ساتھ ساتھ رائج الوقت معاشی نظام کی پوری طرح معاونت کی۔۔۔ لیکن صوبہ سرحد کے مخصوص حالات اور پورے ملک کے سیاسی معاشی حالات کے پیش نظر بائیں بازو کے عناصر پر جو فریضہ عائد ہوتا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ وہ پیپلز پارٹی کی سرپرستی میں صوبائی مخلوط حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائیں گویا جاگیر دارانہ نظام، استحصال اور تشدد صوبائی حکومت کی حمایت سے قائم ہیں اور صوبائی حکومت کی برطرفی سے یہ سب معاملات حل ہو جائیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس جابرانہ نظامِ معیشت اور سیاست کو قائم رکھنے والی بنیادی طاقت تو اس وقت سیاسی طور پر پیپلز پارٹی کی حکومت ہے۔ چھوٹی اور صوبائی جماعتیں تو محض اس مفاد پرستانہ نظام میں حصہ دار بننے کی خواہش مند ہیں۔ اس لیے برسر اقتدار جماعتوں کی باہمی آویزش سے فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ایک کے خلاف دوسرے کا سرپرستی قبول کرنا تمام سائنٹیفک اصولوں کے خلاف ہے۔

ہمارے ان بائیں بازو کے دوستوں نے جو سرحد میں مرکزی حکومت کے آلہ کار بنے ان صوبائی حکومتوں کی برطرفی کے وقت جو بیانات جاری کیے وہ دلچسپ تھے۔ کہا گیا تھا کہ وحشت اور بربریت کا عہد ختم ہوا۔۔۔ گویا مرکزی سامراج نواز عوام دشمن حکومت کے اقدام سے صوبائی رجعت پسند حکومت کا خاتمہ وحشت اور بربریت کے عہد کے خاتمہ کے مترادف ہے۔ حالانکہ صاف ظاہر تھا کہ اب مرکزی بربریت براہ راست صوبوں میں بھی عمل پیرا ہوگی۔۔۔ ہمارے یہی دوست جواباً یہ کہتے ہیں کہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے ان حکومتوں کی برطرفی کے خلاف احتجاج

کر کے اوران صوبوں میں اکثریتی پارٹیوں کی حکومت کو بحال کرنے کے مطالبہ کی حمایت کر کے مارکسی لیننی نظریات اور ترقی پسند سیاست کی بے حرمتی کی ہے۔ مسائل کے موازنہ کرنے اوران کو پرکھنے کا اس سے زیادہ بھونڈا طریقہ ممکن نہیں ہے۔۔۔ منتخب صوبائی حکومتوں کی برطرفی کا فعل ایک طرف تو جمہوری طریقوں کو پسِ پشت ڈال کر کھلی آمریت کو مسلط کرنے کے مترادف تھا تو دوسری طرف اس کے مضمرات میں ایک ایسی محاذ آرائی کا آغاز بھی شامل تھا جس میں ملک کی رجعتی طاقتوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سازشوں اور کشمکش کے دروازے بھی کھل رہے تھے۔ عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحہ کی برآمدگی پر جو سیاست پھیلائی گئی وہ اس سازش کا ایک پہلو تھا۔۔۔ اور ایران کے توسط سے امریکی سامراج اپنے فوجی اڈوں اور سیاسی معاشی مفادات کی حفاظت کے لیے جو اقدامات کر رہا تھا وہ اس کا دوسرا پہلو تھا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک ہر وہ عمل جو مرکز کے رجعتی اقتدار کو مضبوط تر کرے، ادنیٰ جمہوری طریقوں کو پامال کر کے فسطائی رجحانات کی جڑیں مضبوط کرے، اور سینٹو، خلیج فارس اور مکران کے ساحلوں کے راستے امریکی سامراج کی گرفت کو ہمارے ملک اور اس تمام علاقے میں جو پاکستان اور اس کے سمندروں سے لے کر ترکی تک پھیلا ہوا ہے سخت تر کرے بائیں بازو کی طرف سے شدید ردعمل کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ مشرقِ وسطیٰ کا تیل یورپ، امریکہ اور ایشیا کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے لیے از حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس تیل کے ذخیرے کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اور تمام ایسی صورتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو اس تیل کی سپلائی میں رخنہ انداز ہوں یہ سرمایہ دار ملک اور بالخصوص امریکہ اس تمام علاقے میں اپنی سیاسی معاشی گرفت کو مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ خلیج فارس کا علاقہ اس صورت میں زبردست اہمیت کا مالک بن جاتا ہے۔ دوسری طرف بعض عرب ممالک میں تیل کو قومی ملکیت میں لینے کے واقعات اور بعض ترقی پسند حکومتوں کے قیام نے مفاد پرستوں کو پریشان کر دیا ہے۔ اس پس منظر میں ایران سامراجی مفادات کے مقامی محافظ کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ ایران میں بننے والے فوجی اڈوں کی بلوچستان اور اس کے ساحلوں سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ صوبائی حکومتوں کی برطرفی کا

مسئلہ محض نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی کے درمیان کسی ایک کو چننے کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ مسئلہ قومی اور بین الاقوامی سیاست کے مختلف پہلوؤں سے وابستہ تھا۔ اسی مرحلہ پر ہمارے بائیں بازو کے وہ دوست جو مرکزی حکومت کا آلہ کار بننے یہ نظری سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ کیا پاکستان سوشلسٹ پارٹی بورژوا جمہوریت کو قبول کرتی ہے اور عوامی جمہوریت کے راستے سے انکار کرتی ہے۔ اور اس ضمن میں شہری آزادیوں کے حق میں اور اکثریتی پارٹیوں کی صوبائی حکومتوں کی بحالی کے بارے میں پارٹی کے موقف کی مثال پیش کرتے ہیں۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی جدید نوآبادیتی نظام کے عہد میں پسماندہ معیشت کے ملکوں میں عام طور پر اور پاکستان میں خاص طور پر عوامی جمہوری انقلاب کے راستے کو درست قرار دیتی ہے۔ پارٹی کے منشور میں یہ بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔

''پاکستان میں ایسے سوشلسٹ معاشرے کا قیام جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو، ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کو ختم کر کے ہی ممکن ہے۔ اور یہ دو مرحلوں میں تکمیل پذیر ہوگا۔ پہلے مرحلے میں سامراجی اثرات سے نجات، اجارہ دار سرمایہ داری نظام کا خاتمہ اور جاگیرداری نظام کی مکمل بیخ کنی ہے۔ عوامی جمہوری انقلاب کی تکمیل اس مرحلے کو طے کیے بغیر نہیں ہو سکتی، اور یہ اہم کام مزدوروں، کسانوں اور انقلابی دانشوروں کی جدوجہد سے انجام پا سکتا ہے۔ اس انقلاب کے دوران سامراج کے حواریوں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو ریاستی اقتدار سے بے دخل کر کے ہی عوامی جمہوری ریاست قائم کی جا سکتی ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بائیں بازو کی سیاست میں عوامی جمہوری انقلاب کے اثبات اور بورژوا جمہوریت کی نفی کا مسئلہ تو آج سے چھ سال پہلے اسی پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی پیش رُو نیشنل عوامی پارٹی (سی آر اسلم) گروپ، نے اٹھایا تھا اور عملی جدوجہد میں متحدہ نیشنل عوامی پارٹی کی بورژوا قیادت کو رد کر کے مارکسی لیننی نظریات سے لیس قیادت کو قبول کرتے ہوئے ایک الگ تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وقت ہمارے یہی ناقدین متحدہ نیشنل عوامی پارٹی کے بورژوا سربراہوں کے ساتھ نتھی تھے۔ اور سی آر اسلم اور ان کے ساتھیوں پر نیپ کو توڑنے کا الزام دھرتے

تھے۔۔۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے اپنے منشور سے انحراف نہیں کیا۔ پارٹی کا موقف اب بھی یہی ہے کہ ہمارے ملک میں انقلاب کا راستہ عوامی جمہوریت کے راستے سے گزرتا ہے اور اس کے لیے بورژوا قومی جمہوریت کا قیام نہ تو ناگزیر ہے اور نہ ہی ممکن۔ لیکن عوامی جمہوری انقلاب تو مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کش طبقوں کے ایسے اتحاد کے بغیر ممکن نہیں جو ترقی پسند سیاست کے شعور سے مسلح ہوا، اور ایک دیرپا اور ثابت قدم جدوجہد کے لیے تیار۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی محنت کش طبقوں میں یہ شعور پھیلانے اور انہیں شعوری بنیادوں پر منظّم کرنے کا کام بھی کرتی ہے۔ اور ان طبقوں کی چھوٹی بڑی جدوجہد میں ان کی قیادت بھی کرتی ہے۔ تاہم پارٹی کے نزدیک ابھی ان طبقات کا منظّم طبقاتی شعور حقیقی انقلابی شعور کی سطح سے بہت پیچھے ہے۔ اور اس لیے ان کی جدوجہد ابھی صحیح معنوں میں انقلابی جدوجہد میں تبدیل نہیں ہوسکی۔۔۔ جہاں ان محنت کش طبقات کو شعور سے مسلح اور منظّم کر کے جدوجہد کی طرف لے جانے کا کام ضروری ہے وہیں برسراقتدار طبقوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی گرفت پر پے در پے حملے کرنے بھی ضروری ہیں۔ عام طور پر یہ حملہ سیدھی طبقاتی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ضرورت ہو خود برسراقتدار طبقوں کے ہی وضع کردہ ہتھیاروں سے بھی ان پر حملہ کیا جاتا ہے۔ بورژوا جمہوریت بورژوا قوانین، بورژوا عدالتیں، بورژوا اخلاقیات بے شک محنت کشوں کے لیے کھوکھلے اور بے مغز ہیں، اور درحقیقت محنت کش طبقات کو زیردست رکھنے کے مختلف ہتھیار۔ لیکن اپنی جدوجہد کے دوران مختلف سطحوں پر خود انہی ہتھیاروں سے برسراقتدار طبقوں کی وطن دشمنی، جمہوریت دشمنی اور بد اخلاقی کو عریاں بھی کیا جاتا ہے۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی منتخب جماعتوں کی صوبائی حکومتیں قائم کرنے کا مطالبہ اس لیے نہیں کرتی کہ اس سے سچی جمہوریت فروغ پائے گی بلکہ اس لیے کرتی ہے کہ اس سے بورژوا طبقات کی اپنی ہی سیاست کے کھوکھلے پن کا مظاہرہ کرنے اور ان طبقات کے درمیان آپس میں رسہ کشی سے ان کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اسی بحث میں یہ سوال بھی بار بار اٹھایا جاتا ہے کہ کیا پاکستان سوشلسٹ پارٹی انتخاب کے راستے کو تسلیم کرتی ہے، یا مسلح جدوجہد کے راستے کو؟۔ اور اس ضمن میں ماؤزے تنگ کا

''بندوق کی نالی'' والا مقولہ دہرایا جاتا ہے۔ ماؤزے تنگ کا یہ مقولہ مارکسزم لینن ازم کے ایک بنیادی اصول ہی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ طبقاتی سماج میں بالادست طبقات سے اقتدار زیردست طبقات صرف بزورِ طاقت ہی چھین سکتے ہیں۔۔۔ کوئی سیاسی جماعت جو مارکسزم، لینن ازم کو درست طبقاتی سائنس تسلیم کرتی ہو، اس بنیادی اصول سے انحراف نہیں کرسکتی۔ لیکن نہ مارکس، لینن اور نہ ہی ماؤزے تنگ بے شعور، غیر منظّم اور پس ماندہ سیاسی عناصر کے ہاتھ میں بندوق تھماتے ہیں۔ مسلح جدوجہد کے لیے جس اسلحہ کی اولاً ضرورت ہے وہ تو اعلیٰ شعور کا اسلحہ ہے۔ وہ بندوق جو بڑے زمینداروں کو نظر انداز کرے اور چھوٹے اور درمیانہ مالکوں سے نبرد آزما ہو۔ اور وہ اسلحہ جو رجعت کے مرکزی ڈھانچے کی پشت پناہی سے رجعت پسندوں کی باہمی رقابتوں میں ملوث ہوجائے۔۔۔ نہ تو انقلابی بندوق ہے اور نہ عوامی اسلحہ۔ کسی ملک کی مسلح جدوجہد آزادی کی تاریخ کسی دوسرے ملک کے انقلابیوں کے لیے پیش بہا تجربہ تو بن سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ تجربہ من وعن اپنے سیاق وسباق سے الگ کر کے دوہرا دیا جائے۔ سائنٹیفک سوشلزم کا علم ایک تخلیقی علم ہے۔ میکانکی نقالی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ جدوجہد کے طریق کا مسئلہ درحقیقت تحریک کی اپنی طاقت اور شکل اور خارجی حالات کے تقاضوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ کوئی شخص اس بات سے بے خبر کہ اس کی تحریک میں کون کون سے طبقات اور کس حد تک شامل ہیں، ان کے شعور کی سطح کیا ہے اور ان کی تنظیمی حالت کیا ہے۔ معروضی طور پر حالات کا نقشہ کیا ہے۔ دشمن طبقات کی طاقت کتنی ہے اور کہاں کہاں ہے۔ معاشی، سماجی بحران کی سطح کیا ہے، حکومت کی مسلح مشینری کی اپنی شکل کیا ہے۔ اور کیا اس میں کوئی شگاف ڈالنا ممکن ہے خلا میں مسلح جدوجہد کے نعرے بلند نہیں کرسکتا۔

ہمارے ملک میں پچھلے چند سال میں جو سیاسی معاشی اور سماجی افراتفری کا عالم پیدا ہوا ہے، اس میں مزدور طبقہ نے بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے آواز بلند کی ہے۔۔۔ پیپلز پارٹی نے اپنے انتخابی زمانے میں مزدوروں کی اس برہمی اور درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقوں میں سوشلسٹ خیالات کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے، روٹی، کپڑا، مکان کی قسم کے کئی نعروں کو استعمال کیا، اور چونکہ نہ تو مزدوروں میں اور نہ ہی دوسرے طبقات میں ایک ہمہ گیر منظّم سوشلسٹ تحریک کا

وجود تھا، جس کے بغیر سوشلزم اور طبقاتی جدوجہد کا گہرا شعور ممکن نہ تھا۔۔۔اس لیے یہ طبقات پیپلز پارٹی نے اقتدار میں آنے کے بعد پیپلز پارٹی کی بورژوا قیادت کی گرفت میں آ گئے۔اقتدار میں آنے کے بعد پیپلز پارٹی نے محنت کشوں کو نئے لیبر قوانین کا چکمہ دے کر اور چند روپے تنخواہوں کے اضافے کے بہانے خاموش کرنے کی کوشش کی۔لیکن تنخواہوں کا اضافہ افراطِ زر اور مہنگائی کی نذر ہو گیا۔اور لیبر قوانین اپنے عمل میں مزدوروں کے لیے پہلے سے زیادہ مشکلات لے کر آئے۔اس لیے مزدوروں میں بے چینی کم ہونے کی جگہ بڑھتی گئی۔اس بے چینی کو حکومت نے خود بھی بزورِ طاقت دبانے کی کوشش کی اور کارخانوں کی انتظامیہ اور ان کے غنڈوں کے ذریعہ بھی دبانا چاہا اور دوسری طرف پیچیدہ قانونی اور عدالتی کارروائیوں کے ذریعے مزدوروں کو ایک دوسرے ہی راستے لگا دیا۔اب مزدور زیادہ وقت لیبر کورٹوں، ریفرنڈموں اور لیبر افسروں کے ارد گرد گزارتے ہیں۔اس سب کے باوجود بھی بڑھتی ہوئی مشکلات کا ردعمل کہیں نہ کہیں نمودار ہو جاتا ہے۔۔۔اس وقت ملک بھر میں سینکڑوں ٹریڈ یونین فیڈریشنیں اور ہزاروں ٹریڈ یونینیں ہیں۔لیکن ان میں سے کتنی طبقاتی شعور سے مسلح قیادت کے زیر اثر ہیں اور کتنے اپنے ملک کی سیاست سے براہِ راست منسلک؟۔آج بھی لاہور میں یوم مئی پر سب سے بڑا جلوس حکومتی کارندوں اور ان کے پروردہ ٹریڈ یونین لیڈروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہی حال کسان تحریک کا ہے، پنجاب اور سندھ جہاں ملک کی سب سے بڑی زمینداریاں موجود ہیں ابھی ابتدائی کسان کمیٹیوں کی سطح تک بھی مکمل طور پر نہیں پہنچ سکے۔چہ جائیکہ یہاں کسان درہ خیبر سے درآمد کی ہوئی بندوقوں سے انقلاب برپا کر دیں۔خود صوبہ سرحد میں کسان تحریک اپنی تیز جدوجہد، اسلحہ کی فراوان اور بہت دنوں تک مرکزی حکومت کی پشت پناہی کے باجود ایک محدود علاقہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔۔۔اور ہمارے وہ دوست جو پنجاب میں یہ اعلانات کرتے تھے کہ ہم نے صوبہ سرحد کے بعض علاقوں کو آزاد کروالیا ہے اور عوامی انتظام مسلط کر دیا ہے خود سرحد میں دوسرے ہی لہجہ میں بات کرتے ہیں۔

شہر کے نچلے طبقوں کا یہ حال ہے کہ شدید مہنگائی بیروزگاری اور غنڈہ گردی کے باوجود

ابھی منظّم سیاست کی شکل اختیار نہیں کر سکے۔اور یہاں کے دانشوروں کی بڑی تعداد یا تو موقعہ پرستی کے راستے پر چلتے ہوئے ریڈیو، اخبار، ٹی وی اور سرکاری نوکریاں تلاش کرتی پھرتی ہے اور یا کافی ہاؤسوں میں مسلح جدوجہد پر تقریر کرنے سے زیادہ کوئی انقلابی کام کرنے کو تیار نہیں۔

وقت کا پہلا تقاضہ تو یہ ہے کہ ان مزدور انجمنوں میں سیاسی شعور سے مسلح کارکن پیدا کئے جائیں جو محنت کشوں کو ان کی معاشی جنگ کے ساتھ سیاسی طور پر منظّم کرنے کے کام بھی کر سکیں۔پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے کارکن چھوٹے بڑے پیمانے پر یہ کام کرتے ہیں۔دوسرا کام خود بائیں بازو کے مختلف گروہوں کا اتحاد قائم کرنے کا ہے جس کے بغیر ایک متحدہ اور منظّم جدوجہد کا راستہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔اور تیسرا کام باشعور محنت کشوں کی قیادت اور بائیں بازو کے متحدہ پرچم تلے مزدوروں، کسانوں طلب علموں اور نچلے طبقے کے شہریوں کا ایک وسیع متحدہ محاذ قائم کرنے کا ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی یہ تسلیم کرتی ہے کہ پچھلے پچیس سال میں یہاں کے سوشلسٹ عوام کو اس پیمانے پر منظّم نہیں کر سکے جس کی ضرورت تھی۔اور یہی وجہ ہے کہ مختلف مرحلوں پر عوام اور محنت کش طبقات کا وہ سیاسی اور طبقاتی ردِعمل نمودار نہیں ہوا حالات جس کا تقاضہ کرتے تھے۔۔۔اس میں سوشلسٹ تحریک سے وابستہ کارکنوں کے اپنے سیاسی عمل اور نظریئے کی کوتاہی بھی شامل ہے۔بالخصوص درمیانہ طبقہ کے ان دانشوروں نے تحریک کو بے اندازہ نقصان پہنچایا جو تنظیم کی پابندیاں اختیار کیے بغیر اور عمل میں تحریک کا ساتھ دیے بغیر اپنی اپنی مچانوں پر سے لائن صحیح کرنے اور انقلابی بننے کے مشورے دیتے رہتے ہیں۔۔۔مخلص سوشلسٹ کارکنوں کے عمل کا بڑا نقص یہی تھا کہ انہوں نے ان بیٹی بورژوا شہری عناصر کو جو اپنے تئیں دانش اور عمل کا پتلا سمجھتے ہیں، شعور کی روشنی دینے میں وقت ضائع کیا۔چاہیے تو یہ تھا کہ مزدوروں اور کسانوں میں پھیل کر یہی کام کیا جاتا۔

سوشلسٹ کارکنوں کے راستے میں اس ملک میں جو مشکلات ابتدا میں پیدا ہوئیں وہ اس عہد کے نام نہاد بائیں بازو کے انقلابیوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتیں۔یہ وہ دور تھا جب امریکہ کو سامراج کہنا قابلِ گرفتنی تھا، جب بیرونی قرضوں کی مخالفت کرنے والا وطن دشمن سمجھا جاتا تھا۔جب سوشلزم اور کمیونزم کے نام کا لفظ لینا خود بخود کفر کا فتویٰ اور اسلام دشمنی کا لیبل

چسپاں کروانے کے مترادف تھا اور جب سوشلسٹ لٹریچر رکھنا، پڑھنا اور بیچنا بڑا کٹھن کام تھا۔ جب صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں، اور مزدور طبقہ محدود تھا، جب پنجاب کا کسان خوشحال تھا۔ جب مہاجرین کی آبادکاری متروکہ جائیداد سے پیدا الجھنوں اور بے ایمانی سے زندگی کا بڑا حصہ عبارت تھا۔ جب تحریکِ پاکستان کے سیاسی پہلو، اس کے مثبت پہلوؤں کو چھپا کر پوری طاقت سے جلوہ گر تھے۔ جب پنجاب میں پاکستان کا مطلب کسی نہ کسی قسم کی مسلم لیگ کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔ جب حکومت کی دھاندلی کے ساتھ تمام ترقی پسند کارکن جیلوں میں بھیج دئے جاتے تھے۔۔۔ان مشکلات اور مسائل کے باوجود پاکستان کے سوشلسٹوں نے سامراج دشمن اور جاگیر دار مخالف سیاست کم از کم اس پیمانے پر ضرور کی تھی کہ 1947 کے بعد جو سیاسی جماعت بھی میدان میں اتری وہ بورژوا ہونے کے باوجود روٹی کپڑا مکان کے نعروں اور انقلابی لفاظی کے استعمال کے بغیر اپنی خیریت محسوس نہیں کرتی تھی۔

اس پس منظر میں سوشلسٹ کارکنوں کے سامنے جو کام ہے وہ بندوق کی نالی کی بحث میں الجھنے کا نہیں بلکہ عوام اور بالخصوص محنت کش طبقوں میں منظّم سیاسی بیداری پیدا کرنے اور قدم بقدم عوامی جمہوری انقلاب کی طرف لے جانے کا ہے۔ جو شخص اس سے روگردانی کرتا ہے وہ نہ تو انقلابی ہے اور نہ ہی محبِّ وطن۔

مرکزی اور صوبائی کمیٹیوں کے پچھلے مشترکہ اجلاس میں ایک سوال بالخصوص ابھر کر سامنے آیا تھا اور وہ یہ کہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی سوشلسٹ دنیا کی دو عظیم سوشلسٹ ریاستوں یعنی عوامی جمہوریہ چین اور سوویت یونین میں سے کس کے مسلک کو درست سمجھتی ہے۔ یہ سوال پارٹی سے باہر بھی اٹھایا جاتا ہے۔ پارٹی کے نزدیک مارکسزم لینن ازم کے اصول ایک عملی اور تحقیقی سائنس کے اصول ہیں اور ہر ملک کے اپنے مخصوص حالات کے مطابق ان اصولوں کا اطلاق کرنا ہر ملک کے سوشلسٹوں کا فرض ہے۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی اپنے ملک اور بین الاقوامی حالات کا تجزیہ انہی اصولوں کی روشنی میں کرتی ہے۔ سوویت انقلاب کی تاریخ کے کئی باب اس ضمن میں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ عوامی چین کئے انقلابیوں کی طویل جدوجہد، ان کی عوامی جنگ،

کسان تحریک اور عوامی جمہوریت کے تجربات ہمارے لیے مینارہِ روشن ہیں۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اسی طرح پارٹی اس جدید نوآبادیاتی نظام کے زمانے میں جو پچھلے 30 سال سے قائم ہے دنیا کے دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکوں سے بھی سبق حاصل کرتی ہے۔ تاہم پارٹی اپنے تجزیئے اور نظری اور عملی معاملات میں خودمختاری ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ ہر ملک کا انقلاب بنیادی طور پر وہیں کی انقلابی تحریک پر انحصار رکھتا ہے۔

ہم عصر زمانے میں پارٹی دونوں بڑے سوشلسٹ ملکوں کے بین الاقوامی رویوں کو جانچنے کے بعد ان کے بارے میں اپنے رویے متعین کرتی ہے اور ایسے حالات میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ بعض بین الاقوامی معاملات میں ایک سے، اور بعض میں دوسرے سے متفق ہو۔۔۔ اور ایسا درحقیقت ہوا ہے۔ تاہم پارٹی کسی بھی سوشلسٹ ملک کو اس اختلاف رائے کی بنیاد پر ہدف تنقید بنانا درست نہیں سمجھتی۔ پارٹی کے نزدیک اندورنِ ملک آج عوام کے سامنے سامراج کے معاشی اور سیاسی تسلط سے نجات حاصل کرنا، جاگیرداری اور بڑی سرمایہ داری کو توڑنا سب سے بڑے مسائل ہیں اور ان مسائل پر تمام بائیں بازو کی متحد جدوجہد بغیر اس بین الاقوامی سوشلسٹ تنازعے کو زیر بحث لائے ممکن ہے۔ اور درحقیقت وقت کا تقاضہ ہے۔ بین الاقوامی سوشلسٹ برادری کے ممالک کے موجودہ اختلافات کے بارے میں ہمارا رویہ وہی ہے جو 1970 میں حریت پسند ویت نام کی انڈوچائنا ورکرز پارٹی کی چالیسویں سالگرہ کے موقعہ پر پیش کی گئی کامریڈ لی دوآن کی رپورٹ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے:

''بین الاقوامی طور پر آج جو تیز اور سخت طبقاتی جدوجہد جاری ہے وہ اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ مارکسزم لینن ازم اور پرولتاریہ بین الاقوامیت کے اصولوں کے مطابق سوشلسٹ کیمپ اور بین الاقوامی کمیونسٹ اور مزدور تحریک کو دوبارہ متحد کیا جائے اور اسے مضبوط کیا جائے۔ صرف اسی صورت میں دنیا کی تمام انقلابی طاقتوں کو سامراج کے خلاف متحد کرنا ممکن ہوگا۔۔۔''

''صدر ہوچی منہ کی آخری خواہشات پر عمل کرتے ہوئے ہماری پارٹی ہمیشہ کی طرح اپنی تمام صلاحیتیں سوشلسٹ کیمپ میں اتحاد اور یک جہتی کو بروئے کار لانے اور تمام برادر پارٹیوں

کو مارکسزم لینن ازم اور پرولتاریہ بین الاقوامیت کے اصولوں پر متحد کرنے کی کوششیں جاری رکھے گی ہم اپنے ملک اور سوشلسٹ کیمپ کے ممالک بالخصوص سوویت یونین اور چین کے مابین نہ ٹوٹنے والی دوستی کے رشتہ کو اور زیادہ مضبوط کریں گے۔

ہماری پارٹی انڈو چائنا ورکرز پارٹی کی طرح بین الاقوامی سوشلسٹ کیمپ کے ممالک اور پارٹیوں پر اثر انداز ہونے کی حیثیت نہیں رکھتی تاہم وہ اپنے ملک میں اس اصول کی روشنی میں بائیں بازو کے اتحاد کی مسلسل کوشش کر رہی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، موجودہ حکمران طبقہ محنت کشوں اور کچلے ہوئے عوام کے حقوق کی تو کیا نگہداشت کرتا، خود بالائی طبقوں کے مفادات کی حفاظت کرنے والی پارٹیوں کو بورژوا سیاسی جمہوری حقوق دینے کا روادار نہیں ہے۔ بلوچستان، سرحد کی حکومتوں کی طرفی، دھونس، دھاندلی اور رشوت سے منتخب نمائندوں اور سیاسی کارکنوں کو خریدنا، شہری آزادیوں کا سلب کرنا، پولیس اور غنڈوں کے ذریعے مخالفین کو مروانا اس حکومت کے عام طریقوں میں شامل ہے۔ ایسے ہی حالات سے نپٹنے کے لیے بورژوا سیاسی پارٹیوں نے متحدہ جمہوری محاذ کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس میں نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور جمعیت سمیت آٹھ سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ تمام بورژوا سمجھوتوں کی طرح یہ اتحاد بھی اکثر متزلزل ہو جاتا ہے۔۔۔ حکومتی پارٹی کے تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے نیشنل عوامی پارٹی اور دوسری پارٹیاں جب اس اتحاد کو تشکیل دے رہی تھیں تو پاکستان سوشلسٹ پارٹی کو بھی غیر رسمی طور پر دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ پارٹی نے اس اتحاد میں شریک ہونا درست نہیں سمجھا۔ پارٹی کے نزدیک برسر اقتدار طبقات کی نمائندہ پارٹیوں کی باہمی جنگ میں سوشلسٹوں کا کسی ایک سے منسلک ہونا اور اس آویزش میں اپنی حیثیت کو بورژوا قیادت کی بالادستی میں گم کر دینا درست نہیں ہوتا۔ تاہم جس حد تک متحدہ محاذ کی اس جدوجہد کا تعلق ہے جو شہری آزادیوں اور جمہوری حقوق سے تعلق رکھتی ہے، پاکستان سوشلسٹ پارٹی متحدہ محاذ کی تشکیل سے پہلے بلکہ اُس وقت سے جب متحدہ محاذ کی بعض جماعتیں برسر اقتدار تھیں اور تشدد کا سیدھا وار بائیں بازو پر تھا۔۔۔ اپنی سیاست میں اس جدوجہد کو نمایاں مقام دیتی

ہے۔ اس اعتبار سے ایک محدود سطح پر پارٹی اور متحد محاذ کے سیاسی عمل میں ہم آہنگی نظر آئے گی۔ تاہم پارٹی متحدہ محاذ کی جماعتوں کو اجتماعی طور پر رجعت پسند سمجھتی ہے اور بالخصوص جماعت اسلامی کو عوام دشمن اور سامراج دوست جماعت سے اونچا درجہ نہیں دے سکتی۔ اس اتحاد میں نیشنل عوامی پارٹی ایک نسبتاً آزاد خیال بورژوا جماعت کا کردار ادا کرتی ہے جس میں بعض عناصر سامراج دشمن بھی ہیں اور نظری اعتبار سے بائیں بازو کی سیاست سے منسلک بھی۔

متحدہ محاذ کی موجودہ تحریک جن 11 نکات پر اٹھائی گئی ہے اصولاً ان سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مہنگائی بیروزگاری سیاسی غنڈہ گردی وغیرہ کے معاملات بورژوا قیادت میں چند لوگوں کی گرفتاری سے حل نہیں ہو سکتے۔ یہ مسائل کوئی بورژوا حکومت حل کر ہی نہیں سکتی۔ ان کا حل تو محنت کشوں کی شعوری سیاسی جدوجہد کے ذریعے موجودہ نظام کا تختہ الٹنے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے پاکستان سوشلسٹ پارٹی ان مسائل کے حل کے لیے اپنی آزادانہ جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔

متحدہ محاذ کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں تحریکِ استقلال اور اس کے رہنما اصغر خاں بھی تشدد کے اس دور میں بھٹو دشمن تحریک اور رہنما کے طور پر ابھرے ہیں۔ اس تحریک کو درمیانہ طبقہ کے ان نیم سیاسی عناصر کی حمایت حاصل ہوئی ہے جو پیپلز پارٹی کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ دار نہیں بن سکے، یا ایسے عناصر جو اپنی مشکلات کا حل محض بھٹو دشمنی میں تلاش کرتے ہیں اور جو اس معاشی سیاسی نظام کو بدلنے کا نہ تو شعور رکھتے ہیں اور نہ اس طرف متوجہ ہیں۔ اور پھر ایسے عناصر جو پیپلز پارٹی اور اس کی حکومت کے ہاتھوں تشدد اور دھاندلی کا نشانہ بنے ہیں۔ تحریکِ استقلال طبقاتی اعتبار سے موجودہ استحصالی نظام کی اس طرح بھی مخالفت نہیں کرتی جس طرح بھٹو اور پیپلز پارٹی نے ابتداء کی تھی۔ اس کا سیاسی مسلک اسی نظام کے چھپر چھاؤں تلے حکومت کرنا ہے اور بس۔ اصغر خاں کی سیاست کا تجزیہ پارٹی نے اُس وقت بھی کیا تھا جب، ایوب دشمن تحریک زوروں پر تھی۔ پارٹی اپنے اس تجزیے کو درست سمجھتی ہے۔ تاہم پیپلز پارٹی کی حکومت اور متحدہ محاذ، تحریک استقلال وغیرہ کے مابین چپقلش اور آویزش اس حد تک ہماری پارٹی کے لیے دل چسپی کا باعث

ہے جس حد تک یہ برسر اقتدار طبقوں کے مختلف حصوں کو کمزور کرتی ہے اور عوام کے سامنے ان کو عریاں کرتی ہے۔ لیکن جس حد تک ایسی کسی آویزش میں فوجی آمریت واپس لوٹ آنے کے مضمرات شامل ہوں گے، پاکستان سوشلسٹ پارٹی اس کی مخالفت کے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ بورژوا طبقوں کی سیاسی جماعتوں اور موجودہ حکومت کے مابین اس آویزش کے وقت بائیں بازو کے اتحاد اور متحدہ عمل کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ پاکستانی عوام جن مشکلات سے دوچار ہیں ان کا جواب صرف بایاں بازو ہی مہیا کرسکتا ہے، کوئی رجعت پسند جماعت نہیں۔ بائیں بازو کے وہ عناصر جو پی پی پی سے ابھی تک بالواسطہ یا براہِ راست منسلک میں اور وہ جو نیشنل عوامی پارٹی میں شریک ہیں اور دوسرے تمام گروہ جو مختلف ناموں سے چھوٹی بڑی سیاسی کارروائیوں میں مصروف ہیں ان سب کے لیے تاریخ نے یہ سوال اٹھا دیا ہے کہ وہ کب تک سامراج دشمن، جاگیردار اجارہ دار سرمایہ دار مخالف عوامی تحریک کو مضبوط کرنے کی بجائے تحریک میں رخنہ اندازی کرتے چلے جائیں گے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہر وہ شخص اور گروپ جو اس جمہوری جدوجہد کے بنیادی اصولوں سے متفق ہے ایک وسیع تر بائیں بازو کا محاذ قائم کرنے میں مدد دے۔ اس وقت جو لوگ فروعی اور الجھے ہوئے نظری مسائل اٹھا کر اس محاذ کے قیام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں وہ انقلاب کی کوئی خدمت نہیں کرتے بلکہ دشمنوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنے درست تجزیئے اور نظریات کے باوجود پاکستان سوشلسٹ پارٹی تنظیمی اعتبار سے محنت کش طبقات میں اس تیزی سے نہیں پھیل سکی جس کا تقاضہ وقت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پارٹی کے بہت سے ہمدردوں اور دوستوں میں آج بھی یہ غلط فہمی موجود ہے کہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی بھی اسی طرح کی ایک پارٹی ہے جیسی اس کی پیش رو نیشنل عوامی پارٹی۔۔۔ آج ہمارے دوست اس پارٹی کا موازنہ بورژوا سیاسی پارٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں اور اسی شہری درمیانہ طبقہ کی سیاست کی طرف زیادہ جھکے ہوئے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ شہری درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقہ کی سیاست میں حصہ لیے بغیر ان رجحانات اور عوام دشمن نظریات کی بیخ کنی نہیں کی جاسکتی جو آج اخبارات ادب اور دوسرے نظریاتی ہتھیاروں اور ذرائع

ابلاغ کے ذریعے سوشلزم اور انقلاب کی مخالفت میں استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن بنیادی حقیقت یہ ہے کہ مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کو درست سیاست کا شعور دے کر منظّم کئے بغیر ایک سچی انقلابی تحریک وجود میں نہیں آسکتی۔ ہمارے کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ محنت کش طبقات سے براہ راست رابطہ قائم کریں۔ اور مزدوروں، کسانوں اور دوسرے محنت کش لوگوں کی سیاست اور زندگی سے اپنے آپ کو منسلک کریں۔ کوئی پارٹی محض انقلابی نظریات کی بنیاد پر انقلابی نہیں کہلاسکتی۔ انقلاب نظریئے اور عمل کی ہم آہنگی کے بغیر جنم نہیں لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ محنت کشوں کی جدوجہد سے عملی وابستگی کے بغیر نظریے میں بھی پیچ وخم پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے پرانے کارکن جو مختلف طبقاتی محاذوں پر کام کرتے ہیں اپنی عملی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لائیں۔ اور ہمارے نئے کارکن شہری گپ بازی کے ماحول سے نکل کر مزدوروں کسانوں کی جدوجہد میں شریک ہوں۔

ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جہاں دوسرے ترقی پسند گروہوں نے ایک وسیع ترقی پسند سامراج دشمن انقلابی محاذ قائم کرنے میں پس وپیش سے کام لیا ہے وہیں ہمارے اپنے ساتھیوں نے بھی محض دوسروں پر تنقید کرنے پر اکتفا کی اور خود کو ارفع اعلیٰ سمجھ کر الگ کرلیا۔۔۔ تنقید سیاسی شعور بڑھانے کا ایک اچھا ہتھیار ہے، لیکن خود تنقیدی اس سے بھی زیادہ اہم ہتھیار۔۔۔ تنقیدی رویے میں بھی بہت سوچ بچار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان عناصر اور سیاسی گروہوں پر جو سیدھے عوام دشمن ہیں ہماری طرف سے سخت ترین تنقید ضروری ہے۔۔۔ اسی طرح وہ لوگ جو ترقی پسند الفاظ میں انقلاب کی بیخ کنی کرنے والے نظریات کا پرچار کرتے ہیں اس قابل ہیں کہ انہیں ہر قدم پر ننگا کر دیا جائے لیکن ایسے دوست اور عناصر جو سوشلسٹ ہیں لیکن عمل اور سوچ کے مختلف پہلوؤں پر ہم سے دیانتدارانہ اختلاف کرتے ہیں ہماری طرف سے ہمدردانہ تنقید کے مستحق ہیں۔

درست نظریات، مسلسل عمل، محنت کشوں سے اٹوٹ رشتہ اور ان کی جدوجہد میں ہردم شمولیت، تنقید اور خود تنقیدی کا راستہ اختیار کیا جائے تو جلد ہی پاکستان سوشلسٹ پارٹی ایک وسیع انقلابی تحریک بن سکتی ہے۔

ضمیمہ: 2

سیاسی رپورٹ

1986ء

1

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی دوسری کانفرنس 1975 میں ہوئی تھی۔ تیسری کانفرنس کے منعقد ہونے سے پہلے ہی 5 جولائی 1977 کو پاکستان میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا جس کے نتیجے میں سیاسی پارٹیوں کو ایک مختلف صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ جس کے باعث پارٹی کی کانفرنس کے انعقاد کا کام معرض التوا میں پڑ گیا۔ 1979 میں سیاسی پارٹیوں اور سیاسی عمل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جمہوریت کشی کا ایک اور پُرتشدد دور شروع ہوا۔ چنانچہ مارشل لا کے پورے عہد میں پارٹی کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ تاہم اس مشکل دور میں بھی پارٹی، اس کے مختلف یونٹ، پارٹی کارکن اور پارٹی کی مختلف عوامی تنظیمیں برسرِ عمل رہی ہیں۔ اور تمام تر دباؤ، الجھنوں اور مسائل کے باوجود پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی عمومی سیاست درست رہی ہے۔ اور اس نے اپنے تنظیمی ڈھانچوں کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی بھی کی ہے۔..... پارٹی کی یہ تیسری کانفرنس اسی پس منظر میں منعقد ہو رہی ہے۔

مرکزی کمیٹی کی طرف سے پارٹی کی یہ تیسری سیاسی رپورٹ ہے۔ پہلی سیاسی رپورٹ 1973 کی کانفرنس میں پیش کی گئی تھی اور دوسری 1975 کی کانفرنس میں موجودہ رپورٹ دس سال سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران میں اندرونِ ملک اور عالمی سطح پر اور بالخصوص پاکستان کے

اردگرد اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ مرکزی کمیٹی نے ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک رپورٹ کا مسودہ تیار کر کے پارٹی کے تمام یونٹوں کو بحث کے لیے بھیجا تھا۔ دو ماہ تک سیاسی رپورٹ کے مسودہ پر پارٹی کارکنوں اور تمام یونٹوں نے غور و خوض کیا۔ کئی یونٹوں نے اپنی تجاویز اور سوالات مرکز کو ارسال کئے۔ ان سب کی روشنی میں پارٹی کی یہ حتمی رپورٹ مرتب کی گئی ہے۔ مرکزی کمیٹی کو مسرت ہے کہ پارٹی کارکنوں اور کمیٹیوں نے اس رپورٹ کے بنانے میں خاصی دلچسپی لی ہے۔ مرکزی کمیٹی اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کرتی ہے کہ ہم عصر پیچیدہ حالات اور گنجلک سیاسی مسائل کی موجودگی کے باوجود پارٹی کے تمام کارکنوں میں ایک مشترکہ سوچ پہلے سے زیادہ نکھر کر ابھری ہے۔ جن معاملات میں کہیں کہیں ابھی تک ابہام پایا جاتا ہے۔ مرکزی کمیٹی کے نزدیک وہ اس رپورٹ، موجودہ کانفرنس اور پارٹی کے آئندہ طرزِ عمل کے ذریعے اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

پچھلے دس سال کے عرصہ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات اور خود پارٹی کارکنوں کے نظری اور عملی شعور میں پہلے کی نسبت زیادہ وضاحت اور پختگی پیدا ہونے کے باعث ضروری تھا کہ پارٹی کے منشور اور آئین میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں۔ چنانچہ مرکزی کمیٹی کے سیکرٹریٹ نے سیاسی رپورٹ پر بحث کی روشنی میں ایسی تبدیلیاں کی ہیں جو علیحدہ طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔

2

پچھلے دس سال کا عرصہ پاکستان سیاسی، سماجی اور آئینی زندگی کا تاریک ترین دَور ہے۔ آٹھ سال سے زائد عرصہ تک ملک طویل ترین مارشل لا، زبردست تشدد اور حد درجہ رجعتی سیاست کی گرفت میں رہا ہے۔ داخلی طور پر عوام کی لوٹ، مہنگائی، رشوت اور منافع خوری کی مکمل آزادی کے ذریعے استحصالی نظام کو پہلے سے زیادہ تحفظ دیا گیا۔ زرعی معیشت میں بڑے زمینداروں اور صنعتی اور تجارتی میدان میں اجارہ داروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کی گرفت مضبوط تر ہوئی۔ سرکاری طور پر یقین دلایا گیا کہ نہ مزید زرعی اصلاحات ہوں گی، نہ قومی ملکیت میں اضافہ کیا جائے گا بلکہ قومی ملکیت میں لی گئی صنعتوں اور اداروں کو واپس دینے کے اقدامات کیے گئے۔ سول اور فوجی نوکر شاہی کا استحصالی طبقات سے اور زیادہ گہرا رشتہ قائم ہوا۔ ان کی ساجھے داری میں اضافہ ہوا۔ بیرونی طور

پر پاکستان کا عالمی سرمایہ داری نظام اور سامراجی قرضوں پر انحصار پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اور اس وقت ہمارا وطن سولہ ارب ڈالر کا مقروض ہے۔ اس قرضہ کا سالانہ سود ادا کرنے کے لیے ہی اسے مستقلاً مزید قرضوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری خارجہ پالیسی مکمل طور پر امریکی سامراج کے تابع ہے۔ بلکہ ہمارے وطن کے اندرونی معاملات میں بھی سامراج کی دخل اندازی خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ ہماری معیشت عالمی بنک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے مقاصد کے ماتحت ہے۔ آٹھ سال تک آئین معطل رہا۔ مارشل لا کے ضابطے، فوجی عدالتیں، سنگین اور وحشیانہ سزائیں اور بغیر ثبوت کے سالہا سال کی قیدیں اس عہد کی خصوصیت ہیں۔ مارشل لا کے آغاز سے ہی محنت کشوں کو خاص طور پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان میں بے شمار محنت کشوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کوڑے، قید اور برطرفیاں اس عہد میں عام واقعات رہے ہیں۔ سیاسی مخالفین کے خلاف بھی یہ تمام حربے استعمال کیے گئے۔ ملکی عدالتوں کے وہ اعلیٰ اختیارات جن کے تحت وہ انتظامیہ کے بلا جواز اقدامات کو کالعدم قرار دے سکتی ہیں، مارشل لا کے ضمن میں سلب کر لیے گئے۔ بنیادی انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کا تصور اس عہد میں خواب بن گیا..... استحصالی نظام کی محافظ اس فوجی آمریت کو ایک نظریاتی لباس بھی مہیا کرنے کی کوشش کی گئی۔ نظریہ پاکستان اور اسلام کے نام پر مذہب کا رجعتی تصور پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ سیاست کو غیر اسلامی اور سیاسی جماعتوں کو بدعت ثابت کیا گیا۔ فرقہ واریت کو ہوا دی گئی اور مذہبی اقلیتوں کی آزادیاں سلب کی گئیں، مذہب کے نام پر قوانین میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں جن سے عورتوں کے حقوق پامال ہوئے۔ سائنسی شعور، عقلیت، روشن خیالی کو معتوب قرار دیا گیا۔ آرٹ، موسیقی، فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن غرضیکہ تہذیب وثقافت کے تمام مظاہر کی شکل مسخ کر دی گئی۔ درسگاہوں اور جامعات میں خوف ہراس پھیلایا گیا۔ نصابِ تعلیم پر رجعت کی چھاپ مسلط کر دی گئی اور طلبا اور اساتذہ کو ایک مخصوص رجعتی اور فسطائی نقطہ نظر کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی..... یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا گیا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ امریکی نظریات، سامراجی فلسفے اور سرمایہ دارانہ نظام کی کھوکھلی ثقافت بھی ہمارے معاشرے پر مسلط رکھی گئی۔ ہمارے نوجوانوں کی زندگیاں جس بے معنویت اور بے مقصدیت کا آج شکار ہیں

شاید پہلے کبھی نہ تھیں۔

اِس فسطائی طرزِ حکومت اور رجعتی نظریاتی یلغار کے لیے ریاستی ادارے تو استعمال کیے ہی گئے لیکن سماج کے ایسے مذہبی عناصر کو جو پاکستان کی عام تعلیمی اور تہذیبی پسماندگی کے باوجود کبھی بھی عوام میں پذیرائی حاصل نہیں کر سکے تھے، بھی بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا، ان میں سب سے منظّم اور مالی اعتبار سے سب سے مضبوط عنصر جماعت اسلامی کا ہے، جس کے لیے ریاست کا یہ مذہبی فسطائی رُوپ زبردست فائدہ مند ثابت ہوا۔ مارشل لا کے ان آٹھ سالوں میں حکومت کی اعانت سے تعلیمی اداروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات اور ٹریڈ یونین میں جماعت اسلامی کو پھیلانے کی زبردست کوششیں کی گئی ہیں۔ اور اس کے عوض اس جماعت نے اول دن سے حکومت کی حمایت اور تائید کی ہے..... جماعت اسلامی کے علاوہ مسلم لیگ پگاڑا جواب سرکاری مسلم لیگ بن گئی ہے، نے بھی حکومت کی حمایت میں سیاست کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ اس تیسرے مارشل لا کا ایک اجمالی سا نقشہ ہے، تاہم اس مارشل لا اور اس سے پہلے کے مارشل لاؤں کا نفاذ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔ اس کا گہرا تعلق ہمارے وطن کے مخصوص معاشی، سماجی اور سیاسی حالات سے ہے۔

3

ہمارے ملک کی عام سیاست کی بنیاد کبھی بھی صحیح بورژوا جمہوری طریقوں پر نہیں پڑی۔ بالخصوص مغربی پاکستان میں جہاں چاروں صوبوں میں سماجی اور سیاسی اثر بڑے زمینداروں کے قبضے میں رہا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت بھی تحریک پاکستان کے بڑے راہنماؤں میں جاگیرداروں نوابوں اور انگریز کے پرانے کاسہ لیسوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہی لوگ پہلی آئین ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ فیوڈل طرز زندگی جمہوری طرزِ زندگی کی ضد ہے۔ بورژوا جمہوری تحریکوں کی کامیابی دنیا کے مختلف ممالک میں فیوڈل سسٹم کو توڑ کر ہی ممکن ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں آزادی کے وقت فیوڈل سسٹم ملک کی 80 فیصد آبادی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مزدور طبقہ عددی اور سیاسی دونوں اعتبار سے انتہائی کمزور تھا۔ تاجر طبقہ اندرونی اور بیرونی

تجارت سے منسلک تھا لیکن فیوڈل سماج میں وہ سیاسی طور پر بے حیثیت تھا۔ زمیندار سیاست دان طبقاتی طور پر سامراج مخالف نہ تھے چنانچہ آزادی کے کئی سال بعد تاج برطانیہ سے وابستگی اور انگریز کے معاشی مفادات کی حفاظت ان کے لیے ذرہ بھر بھی باعث شرم نہ تھی۔ 1956 تک آئین سازی کا کام مکمل نہ ہوسکا۔ اور اس دوران گورنر جنرل نے اپنے اختیارات کو اس طرح استعمال کیا کہ محدود جمہوری طرز زندگی بھی سخت طریقے سے مجروح ہوئی۔ گورنر جنرل خود نوکر شاہی سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک سے زائد ایسے وزراء حکومت میں شامل کیے گئے جو نوکر شاہی سے متعلق تھے۔ فوج کا کمانڈ انچیف بھی کابینہ کا رکن بن گیا اور اس طرح ملکی سیاست زمیندار، سیاست دانوں، نوکر شاہی اور فوج کے گٹھ جوڑ کا نام ہوگیا۔ 1950 کی دہائی ہی سے پاکستان کی داخلی اور خارجی سیاست پر امریکی سامراج کی گرفت مضبوط ہونے لگی تھی۔ امریکی سامراج جو جنگ عظیم کے بعد سے عالمی سرمایہ داری نظام کا بڑا لیڈر بن چکا تھا جگہ جگہ دوسرے سامراجی ممالک کی جگہ اپنے قدم مضبوط کر رہا تھا، پاکستان پر بھی امریکی تسلط کا آغاز ہوا۔ چنانچہ دوطرفہ سمجھوتوں کے علاوہ پاکستان سیٹو اور سنٹو میں شامل ہوا۔ اور اس طرح امریکی فوجی اور سیاسی حکمت عملی کا حصہ بن گیا۔ ان سامراجی اثرات، تقسیم ہند کے وقت سے بھارت کے ساتھ غیر دوستانہ فضا اور کشمیر کی جنگ کا نتیجہ تھا کہ داخلی سیاست میں غیر جمہوری عنصر مضبوط ہوتا گیا۔ اس جمہوریت شکن نظام کا پہلا وار بائیں بازو پر ہوا۔ اور 1954ء میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی اور اس کی عوامی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

سامراجی امریکی اور مقامی جاگیرداروں دونوں کا مفاد اسی بات میں ہے کہ ہمارا وطن ترقی یافتہ نہ بن سکے۔ صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بڑے تاجروں کا دارومدار درآمد اور برآمد کی سیاست پر تھا۔ چنانچہ ہماری معیشت عالمی سرمایہ داری نظام کا حصہ بن گئی۔ پاکستان مصنوعات کی منڈی بن گیا۔ اور خام مال کا برآمدی ملک۔ ایسی پس ماندہ معیشت کے ذریعے ایک بڑی اور ترقی یافتہ فوج، نوکر شاہی اور دوسرے غیر پیداوری سلسلے قائم رکھنے ناممکن تھے۔ اس لئے سامراجی قرضوں پر مکمل انحصار پاکستان کا مقدر بن گیا۔ اور پاکستان معاشی اور سیاسی اعتبار سے ایسے طبقات

اور گروہوں کی گرفت میں آ گیا جو نہ تو ملک میں آزاد اور خود کفیل معیشت کی تعمیر سے دلچسپی رکھتے تھے نہ جمہوری طرزِ سیاست ان کے لئے قابلِ قبول تھی۔ چنانچہ ہر سیاسی تحریک جس میں عوام نے سیاسی آزادیوں کے حصول اور معاشی محرومیوں سے نجات کے لئے حصہ لیا، کا نتیجہ مارشل لا کے نفاذ کی صورت میں نکلا۔ 1958 کا پہلا مارشل لا اس وقت نافذ ہوا تھا جب پاکستان میں پہلی مرتبہ آزادی کے نو سال بعد بننے والے پہلے آئین (1956) کے تحت عام انتخابات کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ یعنی پہلی بار پاکستان کے عوام اپنی منتخب حکومت بنانے کا حق حاصل کرنیوالے تھے۔ اسی طرح ایوب خان کے صدارتی آئین (1962) کے خلاف ایک زبردست تحریک کے آغاز کے بعد جب ایک طرف پارلیمانی جمہوری آئین کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور دوسری طرف عوام کے مختلف حصے بالخصوص محنت کش طبقات بھی سیاسی طور پر متحرک ہونے لگے تو 1969ء کا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ تیسرے مارشل لا کے نفاذ کی داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے تمام عوامی نعروں کو پس پشت ڈالتے ہوئے ایک طرف تو ہر صوبے کے مستند جاگیردار خاندانوں سے رشتہ جوڑا اور دوسری طرف نوکر شاہی، نیم فوجی تنظیم ایف ایس۔ ایف اور افواج پر اپنا انحصار بڑھا دیا اور اپنی سیاسی پارٹی کو مضبوط کرنے کی جگہ اس پر غیر جمہوری طرزِ فکر والے اور فاشسٹ عناصر کو مسلط کر دیا۔ کئی مفاد پرست، پرمٹ حاصل کرنیوالے، مقامی پولیس اور نوکر شاہی سے مل کر سماجی اور معاشی مفادات حاصل کرنے والے لوگوں کو پارٹی کے نام پر کھل کھیلنے کا موقع دیا گیا۔ 1972 میں زرعی اصلاحات کا قانون نافذ کیا گیا لیکن عملاً اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ بینک اور بعض صنعتی ادارے سرکاری ملکیت میں لئے گئے لیکن ملکی معیشت کو آزاد اور خود کفیل بنانے کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ سرکاری خزانے میں اضافے اور انتظامی اختیارات کو وسیع کرنے کے لئے۔ غیر ملکی بنک اور ادارے اپنے استحصالی مقاصد کے لئے آزاد چھوڑ دئے گئے۔ محنت کشوں کی تنظیموں کو سرکاری مداخلت کے ذریعے اپنی پارٹی کے زیر اثر کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مزدوروں کی تحریک مہم پسندوں، موقع پرستوں اور سرکاری کارپردازوں کی گرفت میں آ گئی۔ اسی پس منظر میں کراچی کے مزدوروں پر زبردست تشدد کیا گیا اور سینکڑوں محنت

کش مار دیئے گئے۔ ایک طرف تو نوکر شاہی پر انحصار بڑھا اور دوسری طرف اعلیٰ سطح کی نوکر شاہی کے آئینی تحفظات ختم کر دئے گئے۔ شہری تاجر اور صنعتکار بنکوں اور چند صنعتی اداروں کو قومی ملکیت میں لینے کے اقدامات سے بدظن ہو گئے تھے۔ بڑی نوکر شاہی اپنی مراعات اور تحفظات سے محرومی کی وجہ سے نالاں تھی۔ افراطِ زر اور مہنگائی نے عام شہری اور خاص طور پر تنخواہ دار ملازمین کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ محنت کشوں کی طرف دوغلی پالیسی نے اس طبقے کی اُس زبردست حمایت کو ٹھنڈا کر دیا جو ابتداء میں حکومت کو حاصل تھی۔ مذہبی عناصر اور ان کی سیاسی جماعتوں کا بڑا حصہ روزِ اول ہی سے پیپلز پارٹی سے بدظن تھا۔ نیپ اور جمعیت کی حکومتوں کے غیر جمہوری خاتمے پر اور نیپ پر پابندی نے دو صوبوں میں سیاسی بحران پیدا کر دیا تھا۔ بلوچستان میں تو مرکزی حکومت کو باقاعدہ لشکر کشی کے ذریعے سیاسی مزاحمت کو کچلنا پڑا۔

بھٹو حکومت کا ایک بڑا کارنامہ 1973ء کا متفقہ آئین تیار کرنا تھا۔ جس میں ایک محدود حد تک صوبائی خودمختاری کا مسئلہ بھی طے کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم بلوچستان کی حکومت توڑنے اور سرحد اور بلوچستان میں اقلیتی پیپلز پارٹی کی حکومت بزورِ بازو قائم کرنے سے 1973 کے آئین پر اعتماد ٹوٹا اور صوبائی خودمختاری کا مسئلہ اور شدت سے ابھرا۔ آئین 1973 کے نفاذ کے باوجود ایمرجنسی کے نفاذ اور بنیادی حقوق کی معطّلی نے بھی سیاسی مزاحمت کا جذبہ پیدا کیا۔ خارجہ سیاست میں مسٹر بھٹو نے امریکی مفادات سے عام وابستگی کے باوجود اس علاقے میں امریکی سامراج کے اہم مُہرے شاہ ایران کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اپنی اہمیت میں اضافہ اور عالمِ اسلام میں نمایاں ہونے کے لیے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی مہم جاری کی۔ چنانچہ امریکی سامراج کے لیے بھی پیپلز پارٹی کی حکومت ضروری نہیں رہی تھی۔ اسی پس منظر میں پاکستان نیشنل الائنس مذہبی نعروں اور مذہبی عناصر کی گرفت میں چلا گیا۔ جس کا سب سے زیادہ فائدہ رجعتی امریکہ نواز سیاسی عناصر اور بالخصوص جماعت اسلامی نے اٹھایا۔ تاجر اور صنعت کار اس الائنس کے زبردست حمایتی تھے۔ حکومت نے اس سیاسی تحریک کا سیاسی طریقوں سے مقابلہ کیا ہی نہیں۔ عوام کے مختلف طبقوں کو متحرک کرنے کی بجائے نوکر شاہی، فیڈرل سیکورٹی فورس اور فوج کی قوت پر

انحصار کیا۔ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا گیا۔ اور پی این اے جو انتخابات کے دوران ایک سیاسی تحریک بن کر ابھرا تھا ایک مزاحمتی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ حکومت نے اس کے جواب میں لاہور، کراچی اور حیدرآباد کے شہروں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ چنانچہ عالمی سامراج اور یہاں کے رجعتی اور استحصالی طبقات کے لیے ایک مرتبہ پھر اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ وہ جس قدر بھی آئینی اور جمہوری صورت موجود تھی اُسے ختم کر دیں۔ چنانچہ 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء الحق کی سرکردگی میں ملک میں تیسرا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

اگرچہ مارشل لا لگاتے وقت یہ کہا گیا تھا کہ یہ عارضی ہے اور محض نئے انتخابات منعقد کروانے کے لیے نافذ کیا گیا ہے تاہم افواج نے ملک پر اپنی گرفت بتدریج مضبوط کر لی۔ اور انتخابات کا وعدہ پسِ پشت ڈال دیا اور بالآخر سیاسی جماعتوں، سیاسی اور ٹریڈ یونین عمل پر پابندی عائد کر دی۔

4

مارشل لا انتظامیہ اور ان کا بین الاقوامی حمایتی امریکی سامراج 1983 کے اوائل سے ہی انتقالِ اقتدار اور کبھی ''اشتراکِ اقتدار'' کا ذکر کرنے لگے تھے۔ پاکستان کے اندر مسلسل سیاسی مزاحمت، پاکستانی عوام کی بڑی اکثریت کی مارشل لا سے نفرت، اور بیرون ملک پاکستان میں مسلسل مارشل لا کے نفاذ کے نتیجے میں ایک ایسے گروہ کی نمو جو مختلف حوالوں سے مارشل لا ہٹانے جانے کی حمایت کرتا تھا ان سب کی وجہ سے حکومت مارشل لا کو کم از کم بظاہر اُٹھانے پر مجبور ہوئی۔ مگر فوج اور نوکر شاہی اور ان کے داخلی و خارجی حمایتی کسی جمہوری طرزِ زندگی کے احیا کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت کا احیاء اس عمل کا نقطۂ آغاز ہوگا جو اس سماج کو اور پاکستان کے داخلی و خارجی روابط کو بنیادی طور پر بدل دینے کی طرف لے جائے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ جمہوری طرزِ حیات میں اب امریکہ کی کاسہ لیسی کی سیاست اور بڑے زمینداروں، نوکر شاہی، فوج اور گماشتہ سرمایہ داروں کی بالادستی کے خلاف زبردست تحریک پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ چنانچہ اگست 1983 کا فارمولا ایجاد کیا گیا جس کا مقصد فوج کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے اقتدار

میں شرکت کے ذریعہ ایک سول حکومت کا قیام تھا۔ دسمبر 1984 میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر نے اپنے لیے اعتماد کا ریفرنڈم کرایا۔ اس میں آٹھ دس فی فیصد سے زیادہ ووٹ نہ ڈالے گئے۔ حالانکہ ریفرنڈم میں جو سوال اٹھایا گیا تھا اس کا براہِ راست تعلق حکومت کی آٹھ سالہ ''اسلامی اور نظریاتی'' خدمات کے ساتھ تھا۔ حکومت نے ریفرنڈم کے نتائج کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور پھر عام انتخابات غیر جماعتی اور غیر سیاسی بنیادوں پر کروائے گئے۔ پگاڑا لیگ اور جماعت اسلامی نے ان انتخابات میں اپنے امیدوار نامزد کیے۔ ایم آر ڈی نے ان انتخابات کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ تاہم پیپلز پارٹی اور دوسری کئی پارٹیوں سے متعلق رکھنے والے لوگوں نے ان انتخابات میں حصہ لیا اور کم وبیش 50 فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ جس سے یہ ظاہر ہوا کہ عوام مارشل لا ہٹانے اور کسی نہ کسی طرح ایک نمائندہ حکومت کے قیام کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ اس انتخاب کے نتیجے میں غیر جماعتی مرکزی اسمبلی اور سینٹ اور صوبائی اسمبلیاں قائم ہوئیں۔ اس انتخاب کے نتیجے میں مرکز اور صوبوں میں منتخب ہونے والے اراکین کی تقریباً ساٹھ فیصد تعداد بڑے زمیندار خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ گو کچھ صنعت کار اور تاجر بھی منتخب ہوئے ہیں۔ اسی پارلیمنٹ سے حکومت نے آٹھویں ترمیم منظور کروائی ہے جس کے ذریعے مارشل لا کے عہد کے تمام قوانین اور اقدامات کو جائز قرار دے دیا گیا۔ اور اب یہی پارلیمنٹ ایک نویں ترمیم کا مسودہ منظور کرنے والی ہے جس کا مقصد ریاستی قوانین کو ایک مخصوص مذہبی طرزِ فکر کے ماتحت کر کے ان کی موجودہ نسبتاً ترقی یافتہ شکل کو مسخ کرنا ہے۔ آئین 1973 تبدیل کر کے صدر کو وسیع اختیارات سونپے گئے۔ ان ترمیمی اقدامات سے آئین کا پارلیمانی اور وفاقی کردار سخت مجروح ہوا۔ چھوٹے صوبوں میں ان کے حقوق کی پامالی کے خلاف جذبات اور شدت سے ابھرے۔ اس اسمبلی میں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ان تمام ترمیمی اقدامات کو تسلیم کر لیا جو مارشل لا کی حکومت نے 1979 میں کی تھیں بلکہ کچھ مزید ترمیمات بھی کر دیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے تحت تمام پارٹیوں کو رجسٹرڈ کروانے کا قانون منظور ہوا۔ اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جمہوری اور سیاسی عمل پابند رہے۔ غیر سیاسی انتخابات کے باوجود نئی اسمبلیوں میں ایک سیاسی عمل کا آغاز ہوا۔ خود حکومت کو ایک سیاسی پارٹی کی

تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ یکم جنوری 1986 سے مارشل لا کے خاتمہ کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں بڑے پیمانے پر سیاسی عمل کا آغاز ہو گیا۔

یہ اجمالی بیان ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے وطن میں مارشل لاؤں کے نفاذ اور حکومتوں کی تبدیلیوں میں غیر ملکی سامراج کا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ عوام اور بالخصوص محنت کش طبقات کی منظّم تحریک، جو جمہوری تحریکوں کا ہراول دستہ ہوتی ہے، پاکستان میں کمزور رہی ہے، بورژوا سیاسی جماعتوں کی اکثریت سامراج مخالف نہیں بلکہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے سامراج ہی پر انحصار کرتی ہے۔ انہی جماعتوں کو ان جمہوری تحریکوں پر بھی کنٹرول حاصل ہوتا ہے جو دراصل عوام اپنے مطالبات کی بنیاد پر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب تک ملک میں سامراج مخالف جمہوری قوتوں کا اتحاد مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا اور اس اتحاد کے نمایاں اور اہم جزو کے طور پر محنت کشوں کے نظریئے اور سائنٹفک سوشلزم کے اصولوں سے لیس سیاسی پارٹی ایک مضبوط قوت کے طور پر نہیں ابھرتی سچی جمہوری تحریک اور پائیدار جمہوری جدوجہد کی بنیادیں وسیع پیمانے پر استوار نہیں ہو سکتیں۔

5

پچھلے دس سال کے عرصے میں معاشی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان پہلے کی طرح جدید نوآبادیاتی نظام ہی کا شکار ہے، بلکہ اس نظام کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہوئی ہے۔ آزادی کے 39 برسوں کے بعد پاکستان کی معاشی صورتِ حال یہ ہے کہ یہ ملک امریکی سامراج کے قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اور ان قرضوں کے سالانہ سود کی ادائیگی کی سکت بھی نہیں رکھتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ ان قرضوں کے سالانہ سود کی ادائیگی کے لیے مزید قرضے لینے پر مجبور ہے۔ سامراجی قرضوں کے طفیل پاکستان اپنی بیرونی تجارت میں عالمی سرمایہ دار منڈی سے وابستہ ہے۔ اس منڈی میں اسے خام مال کے دام کم ملتے ہیں اور مصنوعات اور ٹیکنالوجی مہنگے داموں ملتی ہیں۔ اس طرح اس کے وسائل کا دوہرا استحصال ہو رہا ہے۔ سامراجی قرضوں کے سود کی ادائیگی کے بعد اس کے پاس ملک کی ترقی کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ چونکہ سامراجی قرضے کا حصول دشوار ہو گیا ہے۔ اس لیے پاکستان میں سرمایہ کاری رک گئی ہے اور ملک کی صنعت افراتفری کا شکار ہو گئی ہے۔ اور

نئے روزگار کے حصول کے لیے جو لاکھوں مزدور اور کارکن باہر کے ملکوں میں گئے ہوئے ہیں ان کے بھیجے ہوئے زرمبادلہ روپے اور سامان کے ذریعے مصنوعی خوشحالی بھی آئی ہے اور سرکاری خزانے کو فائدہ بھی پہنچا ہے۔ تاہم اس سے افراطِ زر میں اضافہ بھی ہوا ہے اور اب جبکہ یہ کارکن واپس آنے لگے ہیں تو ہمارا وطن بے روزگاری اور معاشی بحران کے ایک نئے چکر سے دوچار ہونے والا ہے۔

پاکستان کے فیوڈل سسٹم میں ان 38 برسوں میں بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ دیہات میں جہاں ملک کی ستر فی صد آبادی رہتی ہے جاگیرداری زرعی نظام بدستور موجود ہے اور ملک کی معاشی ترقی اور عوام کی خوشحالی اور جمہوریت کے فروغ کے راستے میں حائل ہے۔ دیہات کے عوام کی بھاری اکثریت کھیت مزدوروں اور چھوٹے مالک کسانوں کی ہے جنہیں بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی میسر آتی ہے۔

دیہات میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب ٹریکٹرز زیر استعمال ہیں۔ ان کے استعمال میں آنے سے مزارعوں کی بڑی تعداد کھیت مزدور بن گئی ہے۔ اس تبدیلی سے زمین پر قائم پیداواری رشتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ مزارعوں کے کھیت مزدور بن جانے سے ان کی غربت ضرور بڑھ گئی ہے۔ اس طرح مصنوعی کھاد اور کرم کش ادویات اور ترقی دادہ بیجوں کے استعمال سے فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ غیر ملکی سرمایہ دار کمپنیوں اور گماشتہ تاجروں کی لوٹ میں اضافہ ضرور ہو گیا ہے۔ چونکہ جاگیرداروں کی ملکیت جوں کی توں قائم ہے اس لیے ان کا سماجی اثر اور نوکر شاہی سے ان کا گٹھ جوڑ بدستور قائم ہے۔ اور وہی ملک کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔ ملک کی معاشی ترقی کے لیے امریکی سامراج کے قرضوں سے نجات ان کے سود کی دائیگی سے انکار اور بیرونی تجارت میں عالمی سرمایہ دار منڈی سے وابستگی کا خاتمہ، جاگیرداری زرعی نظام کا خاتمہ اور زرعی اراضی کو قومی ملکیت میں لے کر اس کی مزارعوں اور کھیت مزدوروں اور چھوٹے مالک کسانوں میں از سرِ نو تقسیم لازمی اقدامات ہیں۔

آج دنیا میں صرف سرمایہ داری نظام ہی نہیں ہے بلکہ ایک مستحکم سوشلسٹ نظام بھی موجود ہے۔ جس سے باہمی فائدے کی بنیاد پر تجارت کی جاسکتی ہے اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کی

جاسکتی ہے۔ اس لیے پاکستان سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں سے تجارت کر کے سائنس اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کر سکتا ہے جو اس کی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

6

مارشل لا کے نفاذ سے قبل ہی پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے اس بات کی کوشش شروع کر دی تھی کہ ملک میں بائیں بازو کے سیاسی گروپوں اور پارٹیوں کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ پارٹی کے نزدیک پی این اے کی تحریک کا ایک عنصر اگرچہ جمہوری اقدار کی بحالی کا مطالبہ کرتا تھا اس کے باوجود عمومی طور پر یہ تحریک رجعتی اور سامراج نواز عناصر کی گرفت میں تھی جو عوام کے مذہبی جذبات کو ابھارنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے اقتدار کے پانچ سالوں کے دوران تمام تر دعووں کے باوجود نہ تو عوام کے مسائل حل کرنے کی طرف کوئی قدم بڑھایا تھا اور نہ ہی جمہوری قدروں اور آئین کی پاسداری کی تھی۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک حکومتی پارٹی اور اس کی مخالف بالائی طبقات کی نمائندہ جماعتیں پاکستان کے بنیادی مسائل جو سامراجی شکنجے سے آزادی، جاگیرداری نظام کے خاتمے اور گماشتہ سرمایہ داروں سے نجات حاصل کر کے خود کفیل معیشت کی بنیاد پر ایک جمہوری پاکستان کی تشکیل پر مشتمل ہیں پر کوئی موقف اختیار کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ بائیں بازو کے عناصر متحد ہو کر عوام کے سامنے صحیح سیاست، درست لائحہ عمل پیش کریں۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی کوششوں سے جولائی 1977 سے قبل ملک کی مختلف ترقی پسند تنظیموں کے درمیان رابطہ ممکن ہوا تھا۔ کچھ ابتدائی میٹنگیں بھی ہوئیں تاہم پہلی باضابطہ میٹنگ اگست 1978 میں لاہور میں پارٹی کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ اس اجلاس میں ملک کی تقریباً تمام ترقی پسند اور بائیں بازو کی تنظیمیں شامل ہوئیں۔ طویل بحث کے بعد ایک اعلان نامہ منظور کیا گیا۔ لیکن تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل پر اختلاف کی وجہ سے یہ اجلاس دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی، مزدور کسان پارٹی (بنگش گروپ) عوامی جمہوری پارٹی اور مزدور مجلس عمل پر مشتمل ایک اتحاد ''عوامی جمہوری اتحاد'' کے نام پر تشکیل پایا۔ بعد ازاں دوسرے گروہ نے جس میں سندھ

عوامی تحریک، قومی محاذ آزادی، نیشنل پروگریسو پارٹی اور کچھ دوسرے عناصر شامل تھے، نے ایک الگ اتحاد قائم کیا۔

ہماری پارٹی اور عوامی جمہوری اتحاد کا نقطہ نظر یہ تھا کہ پاکستان کو امریکی سامراج اور عالمی سرمایہ داری نظام کی گرفت سے آزاد کر کے اور جاگیرداری ختم کر کے ایک جمہوری معاشرے کی داغ بیل ڈالنا ضروری ہے۔ جمہوری معاشرہ ایک طرف تو افراد کے جمہوری حقوق اور بالخصوص محنت کش طبقات کے جمہوری حقوق کی ضمانت دے گا اور دوسری طرف پاکستان کی تمام قومیتوں کے معاشی، سماجی اور سیاسی حقوق کو برابری کی سطح پر تسلیم کرتے ہوئے تحفظ دے گا اور ایک قومیت کی دوسری قومیت پر بالادستی کے تمام راستے بند کر دے گا۔ فوری مقاصد میں مارشل لا کے خاتمے اور آئین 1973 کی بحالی کی تحریک کو وسیع تر اور مضبوط بنانا شامل تھا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے خیال کے مطابق فوجی حکومت کا قیام اور تسلسل عالمی سامراجی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ اس لیے اس کا خاتمہ اور آئینی حکومت کا قیام پاکستانی عوام کی اس جدوجہد کا لازمی اور فوری جزو تھا جو وہ آزاد جمہوری اور خوشحال پاکستان کے لیے کر رہے تھے۔

پارٹی اور عوامی جمہوری اتحاد کے فیصلوں کے مطابق 80-1979 میں ان سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر جو براہِ راست مارشل لا کی حمایت کر رہی تھیں بالخصوص جماعت اسلامی اور پگارا مسلم لیگ، باقی تمام جماعتوں سے رابطہ قائم کیا گیا تا کہ مارشل لا مخالف تمام سیاسی عناصر کو ایک وسیع تر محاذ میں شامل کیا جا سکے۔ جون 1980 میں اس ضمن میں لاہور میں وکلا کا کل پاکستان مارشل لا مخالف کنونشن منعقد ہوا۔ اس کنونشن کے انعقاد کو زیادہ تر بائیں بازو کے وکلا جن میں پارٹی کے وکلا پیش پیش تھے نے ممکن بنایا۔ ایسا ہی ایک کنونشن کراچی میں بھی منعقد ہوا جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وکلا کے نمائندے سیاسی جماعتوں سے رابطہ کریں۔ دسمبر 1980 میں ہی وکیلوں کا تیسرا کنونشن پشاور میں منعقد ہوا۔ وکلا کی اس جمہوری جدوجہد میں پارٹی کے وکلا کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ نتیجتاً سیاسی جماعتوں کے راہنما ملے اور ایم آر ڈی کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ جس کے مقاصد مارشل لا کا خاتمہ، 1973 کے آئین کی بحالی، عام انتخابات اور انتقال اقتدار تھے۔ سوشلسٹ پارٹی نے ایم آر

ڈی کے نام ایک خط کے ذریعے ان کے 4 نکاتی پروگرام کی حمایت کا اعلان کیا۔ مزدور کسان پارٹی (بنگش گروپ) ایم آر ڈی کی تشکیل کے وقت علیحدہ ہوگئی جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ عوامی جمہوری اتحاد کو وسیع اور مضبوط کرنے کے لیے بائیں بازو کی دوسری جماعتوں سے از سر نو رابطہ قائم کیا جائے۔ مزدور کسان پارٹی بنگش گروپ کی دلیل یہ تھی کہ ایم آر ڈی کی موجودگی میں بائیں بازو کے علیحدہ اتحاد کی ضرورت نہیں بلکہ انہوں نے اسے ایم آر ڈی کے مخالفت اور مارشل لا کی حمایت میں رویے کا نام دیا۔۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی اس وقت اور اب بھی مختلف نقطہ نظر رکھتی ہے۔ پارٹی کے نزدیک خود مارشل لا مخالف جدوجہد کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور تحریک بحالی جمہوریت میں پائیداری پیدا کرنے کے لیے بائیں بازو اور جمہوری نظریات رکھنے والی پارٹیوں کے درمیان قریبی رابطہ اور اتحادِ عمل از حد ضروری ہے۔ کیونکہ جدید نوآبادیاتی نظام میں بورژوا اور فیوڈل پارٹیاں بنیادی طور پر جمہوریت پسند نہیں ہیں۔ اور اگرچہ وقتی طور پر وہ مارشل لا سے انتقال اقتدار کی خاطر ایک وسیع پلیٹ فارم بنانے پر مجبور ہوئی ہیں تاہم وہ اس عمل میں بیرونِ ملک امریکہ اور اندرونِ ملک خود فوج کے مختلف حصوں سے جوڑ توڑ کرنے پر انحصار کرتی رہیں اور سچی جمہوری تحریک بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔..... بائیں بازو اور جمہوری قوتوں کا ترقی پسند اتحاد کسی صورت بھی مارشل لا مخالف تحریک اور ایم آر ڈی سے متصادم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پارٹی نے نہ تو بائیں بازو کی کسی پارٹی کے ایم آر ڈی میں شامل ہونے کی مخالفت کی اور نہ ہی خود ایم آر ڈی میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ البتہ پارٹی کو ایم آر ڈی میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے جہاں بعض رجعتی جماعتوں نے کوشش کی وہاں مزدور کسان پارٹی نے بھی مخالفت میں پوری قوت صرف کی اور دلیل میں ہمارے اخبار ''عوامی جمہوریت'' کا ایک مضمون پیش کیا گیا جس میں ایم آر ڈی کے بعض عناصر کو جو مارشل لا مخالف متحدہ محاذ میں شامل ہونے کے بعد اپنا ترقی پسند اور طبقاتی کردار فراموش کر دیتے ہیں ''شامل باجہ'' کہا گیا تھا۔۔ عوامی جمہوریت ہی میں درجنوں مضامین بیانات اور تقاریر کے ایسے حوالے موجود تھے جو پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے سیاسی موقف کا اظہار کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ فوری سیاسی جدوجہد کے طور پر مارشل لا مخالف محاذ کو مضبوط کرنا اور سچی جمہوری سیاست کے پھیلاؤ کی خاطر

بائیں بازو اور ترقی پسند قوتوں کا محاذ تیار کرنا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی مارشل لا مخالف وسیع سیاسی محاذ ایم آر ڈی میں شامل ان عناصر سے بے خبر نہیں تھی جو نام جمہوریت کا لیتے ہیں اور تعلقات جمہوریت کی دشمن کے طاقتوں کے سربراہ امریکی سامراج سے رکھنا چاہتے ہیں۔ پارٹی ان عناصر کے خلاف اپنے حق تنقید سے دست بردار نہیں ہوسکتی، اور عوام کے اس شعور کو جو سالہا سال کے تجربے کے بعد سامراج کے ہتھکنڈوں کو پہچاننے لگا ہے کند کرنے کا کردار ادا نہیں کرسکتی۔ لیکن مزدور کسان پارٹی کے لیڈروں نے جان بوجھ کر ان سب حقائق سے چشم پوشی کی جو سراسر موقعہ پرستانہ اور بددیانتی پر مبنی رویہ تھا۔ اس لیڈر شپ کی موقعہ پرستی ہی کا نتیجہ ہے کہ عوامی جمہوری اتحاد سے وہ الگ ہوگئے۔ ایم کے پی کے کئی حصے ہوگئے اور خود ایم کے پی کی ٹریڈ یونین کا حصہ شدید بحران کا شکار ہوگیا ہے اور اس کا اہم حصہ ان سے الگ ہوگیا۔

بہرحال پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے مارشل لا مخالف اور سامراج دشمن جمہوری سیاست کی درست پالیسی کے تحت مسلسل جدوجہد جاری رکھی۔ اسی عملی جدوجہد کی وجہ سے 1981 کے فروری اور مارچ کے مہینوں میں جب مارشل لا انتظامیہ نے سیاسی تشدد کا حربہ استعمال کرتے ہوئے گرفتاریاں شروع کیں تو پارٹی کے تمام چیدہ راہنما اور کارکن گرفتار کرلیے گئے اور بے شمار دوسروں کے خلاف گرفتاریوں کی غرض سے چھاپے مارے گئے۔ لیکن وہ سرکار کے ہاتھ نہ آئے۔ پارٹی کے کئی ساتھی اس دوران قلعہ لاہور میں بھی مقید رہے اور ہر طرح کا تشدد برداشت کیا۔

پارٹی کے کچھ ساتھیوں کو لمبے عرصہ تک نظر بند رکھنے کے بعد ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور انہیں سزائیں دی گئیں۔ نظر بندیوں کے اس زمانے میں ہمارے ساتھیوں نے جیل خانوں کے اندر صحیح انقلابی کردار کا نمونہ پیش کیا۔ معافی نامے بھرنے سے انکار کیا اور دوسرے مقید سیاسی کارکنوں کے ساتھ رفیقانہ تعلق قائم کرنے کے علاوہ ان کی اور اپنی سیاسی تعلیم کا کام بھی حتی المقدور جاری رکھا۔ اس دوران پارٹی تنظیم کو چلانے، اخبار ''عوامی جمہوریت'' کو جاری رکھنے، نظر بند ساتھیوں اور ان کے اہل خانہ کی نگہداشت کرنے کے مشکل کام بھی کئے۔ البتہ ''عوامی جمہوریت'' کو سنسر کی پابندیوں اور پریس ایکٹ کے دوہرے قوانین کی زد سے بچانے کی غرض سے

کبھی کبھی مکمل بات کہنے میں دشواری بھی پیدا ہوئی اور اس سے ابہام بھی پیدا ہوا۔

''عوامی جمہوریت'' پر حکومتی تشدد کے وار ہوتے رہے۔ 1984 کے تین پرچوں میں شائع شدہ مضامین جن کا تعلق افغانستان، امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور مذہبی اقلیتوں کے مسائل سے تھا پر اعتراض کیا گیا اور حکومت پنجاب نے اخبار کے ایڈیٹر اور پبلشر کو زرضمانت جمع کروانے کا حکم دیا۔ یہ معاملہ ہائیکورٹ میں چیلنج کیا گیا اور ابھی زیر سماعت ہے۔ ''عوامی جمہوریت'' کے کئی دوسرے پرچوں کو ضبط کرنے کے احکامات جاری ہوئے اور مضامین نظم ونثر کے بارے میں جواب طلبی کی گئی۔ ان تمام مشکلات اور پابندیوں کے باوجود اخبار ''عوامی جمہوریت'' کی مسلسل اشاعت پارٹی کے ساتھیوں کا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اس اخبار کے ذریعے ترقی پسند سیاسی کارکنوں کی سیاسی تربیت بھی ہوتی ہے اور باہمی رابطہ قائم رہتا ہے۔ بائیں بازو کی دوسری پارٹیوں کے کارکن بھی ہمارے اخبار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے مضامین ان کے زیر بحث رہتے ہیں۔

1981 کی گرفتاریوں اور تشدد کے نتیجہ میں مارشل لا مخالف جدوجہد وقتی طور پر مدہم پڑ گئی۔ تاہم 1982 میں ایک مرتبہ پھر وکلا ہی کے پلیٹ فارم سے اس جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس وقت پارٹی کے جنرل سیکرٹری کو لاہور ہائیکورٹ بار کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ کسی سوشلسٹ کا ایک ایسے ادارے کا سربراہ چنا جانا جو بورژوا طرز زندگی میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ایک طرف تو پارٹی کی درست سیاست کی نشاندہی کرتا ہے جس کی وجہ سے بائیں بازو اور جمہوری قوتوں کے اتحاد کا مظاہرہ ہوا۔ اور دوسری طرف وکلا میں مارشل لا سے شدید نفرت اور آئین کی بحالی کی خواہش کا بھی اظہار ہے۔ اسی سال کل پاکستان وکلا رابطہ کمیٹی بنی جس کی سربراہی کے لئے بھی پارٹی کے جنرل سیکرٹری کو چنا گیا۔

یہی سال تھا جس میں لاہور کراچی میں وکلا کنونشن منعقد ہوئے۔ جن میں پارٹی سے تعلق رکھنے والے وکلا نے دوسرے جمہوریت پسند وکلا کے ساتھ مل کر نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ اسی جمہوری جدوجہد کے ضمن میں اکتوبر 1983 میں پارٹی کے جنرل سیکرٹری کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ وکلا کی

اس جدوجہد کے پہلو بہ پہلو 14 اگست 1982 سے ایم آر ڈی نے بھی بحالی جمہوریت کی جدوجہد کا عملی آغاز کیا جس کے نتیجے میں تمام صوبوں میں ایم آر ڈی کے سیاسی کارکنوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ مارشل لا کے خلاف ایم آر ڈی کا یہ سب سے بڑا عمل تھا۔ تمام تر تنظیمی کمزوریوں کے باوجود اس تحریک نے جمہوری جدوجہد کو پہلے سے زیادہ نمایاں بنایا۔ یہ تحریک بالخصوص سندھ کے اندرون بعض علاقوں میں تیزی سے پھیل گئی۔ مارشل لا انتظامیہ نے بھرپور تشدد کے ذریعے اس تحریک کو کچلا ۔ بے شمار معصوم کسان اور سیاسی کارکن مارے گئے، سینکڑوں گرفتار ہوئے اور یہ سلسلہ چار ماہ تک جاری رہا۔

مارشل لا مخالف اور آئین کی واپسی کی جدوجہد میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے اپنا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی سیاست کے بنیادی عنصر محنت کشوں کو طبقاتی اور سیاسی طور پر منظّم کرنے اور جدوجہد میں ڈالنے کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مارشل لا کے عہد میں محنت کشوں نے چھوٹی چھوٹی کئی لڑائیاں لڑیں لیکن دو بڑے مظاہرے کراچی شپ یارڈ اور واہ آرڈیننس فیکٹری کے مزدوروں کی ہڑتالیں تھیں۔ کراچی شپ یارڈ کے کم وبیش چھ ہزار مزدوروں کی مکمل ہڑتال جو 1979 میں تقریباً اڑھائی ماہ تک جاری رہی مزدوروں کی یک جہتی اور تنظیم کی شاندار مثال تھی۔ شپ یارڈ کی نمائندہ یونین پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن سے منسلک تھی اور اس کے اہم کارکن اور مزدور راہنما پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ مارشل لا حکومت نے اس ہڑتال کے دوران کوئی دو سو مزدور برطرف کئے۔ درجنوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ تمام عہدیداروں کے خلاف مقدمات درج کئے اور یونین پر تین سال کے لیے پابندی عائد کر دی گئی۔ لیکن تین سال کے بعد یونین بحال ہوتے ہی دوبارہ سودا کاری ایجنٹ منتخب ہوگئی۔ اور جماعت اسلامی اور حکومت کو شکست ہوئی۔ اس ہڑتال کے دوران مزدوروں نے کراچی شہر میں کئی جلوس نکالے اور اپنے مطالبات کے ساتھ ساتھ مارشل لا کے خاتمے اور آئین کی بحالی کے مطالبات بھی پیش کئے۔

1985 میں واہ آرڈیننس فیکٹری کے قریب پچیس ہزار مزدوروں نے اپنے مطالبات کے لئے ہڑتال کی۔ اس ہڑتال کی ہر منزل پر ہمارے کارکن اور ساتھی جو بڑی تعداد میں ان

مزدوروں میں موجود ہیں اس جدوجہد میں شامل رہے۔ اور بعد ازاں تادیبی کارروائی کا شکار ہوئے ۔ پارٹی کے نزدیک محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہد فوجی آمریت کے خلاف جمہوری جدوجہد کا ایک اہم جزو ہے۔

اسی عہد میں پارٹی نے پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے تحت کوئٹہ، کراچی اور لاہور میں تین لیبر کانفرنسیں منعقد کیں۔ یہ کانفرنسیں محض مزدوروں کے فوری مسائل تک محدود نہ تھیں بلکہ پورے طور پر ہم عصر سیاست اور طبقاتی سیاسی شعور کا اظہار تھیں۔ مارشل لا کے خاتمہ اور آئین کی بحالی سے لے کر قومی معیشت پر سامراجی اور جاگیردارانہ گرفت تک تمام فوری مسائل اور امریکی سامراج کی جنگباز پالیسی کی مخالفت سے لے کر افغانستان کے انقلاب کی مکمل حمایت تک تمام موضوعات ان کانفرنسوں میں زیر بحث آئے اور انہی پر اہم قراردادیں منظور کی گئیں۔ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن ہی کی پیش قدمی کے نتیجہ میں 1983 میں کراچی میں گیارہ مزدور فیڈریشنوں کا ''لیبر الائنس'' وجود میں آیا۔ جس نے مارشل لا مخالف جمہوری جدوجہد کی حمایت کا اعلان کیا اور محنت کشوں کے مسائل پر متحدہ آواز بلند کی۔

اسی طرح پاکستان کسان کمیٹی نے کافی عرصے کے بعد 1985 میں کبیر والا کے مقام پر ایک بڑی کسان کانفرنس منعقد کی۔ کراچی میں پاکستان یوتھ ایک لیگ کے زیر اہتمام دو بڑی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ دوسرے شہروں میں بھی اجتماعات کر کے یوتھ لیگ کے پروگرام کو روشناس کرایا گیا۔ پارٹی کی طالب تنظیم جس کا پہلا نام سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن تھا اور اب پروگریسو سٹوڈنٹس آرگنائزیشن ہے نے دوسری ترقی پسند تنظیموں کے اشتراک کے ساتھ پروگریسو سٹوڈنٹس الائنس کے نام سے اتحاد قائم کیا اور بالخصوص کراچی اور کوئٹہ میں عملی جدوجہد کی قیادت کی۔ بلوچستان میں ہمارے طالب علم کارکن اس جدوجہد کے ضمن میں پابند سلاسل ہوئے۔

ان تمام طبقاتی اور عوامی تنظیموں کی عملی جدوجہد ایک طرف تو فوجی آمریت کے خلاف تھی اور دوسری طرف پاکستان کی معیشت اور سیاست کے بنیادی مسائل یعنی اس کے جدید نوآبادیاتی کردار، سامراج کی گرفت، جاگیرداری کی لعنت اور لوٹ کے نظام کو عوام کے سامنے ننگا کرنے کے

لئے تھی۔ آج اگر زمیندارہ تسلط، امریکی سامراج کی پاکستان کی داخلی اور خارجہ حکمت عملی پر گرفت اور سامراجی قرضوں سے چلنے والی معیشت اور مارشل لا اور نوکر شاہی کے تسلط کے درمیان واضح تعلق اور اشتراک عمل کا پردہ چاک ہو رہا ہے اور یہ باتیں عوام کے شعور کا حصہ بنتی جاری ہیں تو یہ دراصل عوام کے اپنے تجربات کے علاوہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی اور اس کی عوامی تنظیموں کی مستقل مزاجی سے کام کرنے ہی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ لوگ جو کل تک خود کو انقلابی کہتے نہیں تھکتے تھے اور ہماری پارٹی پر یہ تہمت دھرا کرتے تھے کہ انہیں ہر بات میں سامراج ہی نظر آتا ہے آج یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ پاکستان جیسے جدید نو آبادیاتی ملک میں جمہوریت کی کوئی جدوجہد اس وقت تک پر معنی اور دقیع بن ہی نہیں سکتی جب تک سامراج اور اس کے مقامی جمہوریت دشمن ہمنواؤں کے خلاف مسلسل جدوجہد نہ کی جائے۔

پارٹی نے اپنے اس فیصلے کے مطابق کہ بائیں بازو اور جمہوری سیاسی قوتوں کے درمیان اتحاد ہی دراصل وہ فیصلہ کن عنصر ہے جو ہمارے ملک کو بورژوا سیاست اور قیادت کی گرفت سے نکال سکتا ہے۔ سچی جمہوری جدوجہد کو قیادت فراہم کر سکتا ہے۔ اور ایک جمہوری انقلاب کی داغ بیل ڈال سکتا ہے۔ کئی اقدامات کئے ہیں۔

اولاً تو ملک کے دوسرے مارکسسٹ گروہوں سے قریبی رابطہ قائم کرنے میں پہل کی۔ چنانچہ 1984 اور 1985 کے درمیان پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے نمائندوں سے کئی میٹنگیں ہوئیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے ان دوستوں نے ابھی تک اس ضمن میں کوئی مناسب ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ دونوں پارٹیوں کے درمیان اکثر معاملات میں نظریاتی ہم آہنگی کو تسلیم کرنے کے باوجود سیاسی سطح پر اتحادِ عمل سے گریزاں ہیں۔ وہ سیاسی اتحادِ عمل و تنظیم کے بغیر محض الفاظ کے ذریعے تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہاں بھی دیانت سے کام نہیں لیتے کیونکہ ہماری پارٹی کے خلاف منفی پراپیگنڈہ بھی جاری رکھتے ہیں۔ ہماری پارٹی نے مزدور کسان پارٹی کے اس حصے سے بھی قریبی رابطہ قائم کیا جو اسحاق محمد مرحوم، کی قیادت میں کام کرتا تھا۔ یہ رابطہ مسلسل قائم ہے اور اس کے مزید مضبوط ہونے کا امکان ہے۔ اس طرح سندھ میں بعض دوستوں کے ساتھ ہماری پارٹی کے قریبی

تعلقات استوار ہونے کے امکانات روشن ہیں۔

مزدور کسان پارٹی کا دوسرا حصہ داخلی انتشار کا شکار ہے۔ اس گروپ کے سربراہ فضل بنگش کئی سال سے یورپ میں مقیم ہیں اور اس وقت سندھ، بلوچستان، پشتون فرنٹ اور کنفیڈریشن کی سیاست کے ساتھ منسلک ہیں۔ جبکہ پاکستان میں ان کی پارٹی سرکاری طور پر اس سیاست کی حمایت نہیں کرتی۔ موقعہ پرستی اس گروپ کے رہنماؤں کا شعار ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ مکمل طور پر پیپلز پارٹی سے اتحاد پر زور دیتے تھے۔ پھر پی این اے (قومی اتحاد) کی تحریک کے دنوں میں اس بات پر مصر ہوئے کہ بائیں بازو کی محنت کش تنظیمیں بھی قومی اتحاد کی ''پہیہ جام'' تحریک کا ساتھ دیں۔ اس گروپ کا ایک دوسرا حصہ مہم جوئی کی پرانی روش ہی پر گامزن ہے۔ البتہ ان سب کا مشترکہ رجحان بائیں بازو کے اتحاد کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا اور دسری تنظیموں پر کیچڑ اچھالنا ہے۔

بہر حال پاکستان سوشلسٹ پارٹی ایسے تمام سیاسی گروہوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے جو محنت کشوں کے فلسفہ کی بنیاد پر سائنٹیفک سوشلزم کا نظریہ اپناتے ہیں۔ ایک متحدہ تنظیم بنانے کی خواہش رکھتے ہیں اور باہمی اختلافات کو تبادلہ خیال کے ذریعے حل کرتے ہوئے عملی جدوجہد اتحاد کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے جمہوری اور ترقی پسند جماعتوں سے بھی اتحادِ عمل کے اقدامات کئے ہیں۔ چنانچہ 1983 میں پاکستان نیشنل پارٹی اور ہماری پارٹی کے درمیان اتحادِ عمل کا ایک سمجھوتہ ہوا۔ اس وقت پی این پی ابھی ایم آر ڈی میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے اس موقف کے بھی خلاف تھی جو اس نے ایم آر ڈی کے 4 نکاتی پروگرام کی حمایت میں اختیار کیا تھا۔ تاہم خود پی این پی بعد ازاں ایم آر ڈی میں شامل ہوگئی۔ اور ہماری دونوں پارٹیوں کے درمیان اتحادِ عمل کا سمجھوتہ پس منظر میں چلا گیا۔ یہ رابطہ از سر نو 1985 میں شروع کیا گیا تو پی این پی کی قیادت نے موقف اختیار کیا کہ سوشلسٹ پارٹی کو ان کی پارٹی میں ضم کر دیا جائے۔ وہ محض اتحاد کے خواہش مند نہیں تھے۔ یہی سوال اس وقت بھی پیدا ہوا جب

1986 کے آغاز میں مختلف ترقی پسند اور جمہوری پارٹیوں کو سامراج دشمن، جمہوری پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی اس ضمن میں اپنا موقف ایک مرتبہ پھر واضح کرنا چاہتی ہے۔ پارٹی کا موقف اول روز سے یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوری جدوجہد کی تین سطحیں ہیں۔ ایک تو وسیع تر تحریک جو پہلے براہِ راست مارشل لا کے خلاف تھی اور اب آئینی ترامیم کو ختم کرانے، فوج کے سول اور سیاسی معاملات میں مداخلت کے خلاف، پولیٹکل پارٹیز ایکٹ کی منسوخی اور سیاسی بنیادوں پر انتخابات کے انعقاد کے لئے، دوسرے ان تمام ترقی پسند جماعتوں کا اتحاد جو سامراجی تسلط سے نجات کے ذریعے مکمل قومی آزادی اور جاگیرداری نظام کو توڑ کر، تمام عوام اور قومیتوں کے جمہوری حقوق کی بنیاد پر تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کے لیے تیار ہیں۔ اور تیسرے ان قوتوں اور عناصر کے درمیان اتحاد اور بالآخر مکمل تنظیمی یکجہتی جو محنت کشوں کی طبقاتی سیاست کے نظریات کی بنیاد پر بالآخر سماجی انقلاب اور سوشلسٹ معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی اس بات کو تو تسلیم کرتی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو مختلف وجوہ کی بنیاد پر سامراج دشمن کردار بھی ادا کر رہے ہیں اور جمہوری معاشرے کی تعمیر کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک مکمل قومی آزادی اور جمہوریت کی جدوجہد ہمارے ملک کے مخصوص حالات اور جدید نوآبادیاتی نظام کے اس تسلط کے باعث جو یہاں قائم ہے۔ اس وقت تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی جب تک محنت کش طبقات کو منظّم نہیں کیا جاتا۔ اور ان کی منظّم اور مضبوط سیاسی جماعت کو جمہوری جدوجہد میں نمایاں کردار حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے وطن میں کوئی دوسرا معاشی طبقہ سامراج دشمنی کا کردار استقامت سے ادا نہیں کر سکتا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک ہمارے ملک میں جدید نوآبادیاتی نظام سے آزادی، جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور جمہوری معاشرے کی تشکیل کا کام سوشلسٹ انقلاب کا پہلا مرحلہ تو ضرور ہے لیکن یہ دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کی صورتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ اس سلسلہ کو اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچانے کے لیے محنت کشوں کی پارٹی اور اس کے وسیع عوامی بنیاد کی تشکیل بنیادی شرط ہے۔ ایسی پارٹی کی تشکیل اور وسیع سامراج دشمن محاذ کی تشکیل متضاد عمل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے موافق عمل

ہیں۔ اور بیک وقت ہونے چاہئیں۔ اسی نظریاتی تجزیئے کی بنیاد پر پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے ایک طرف تو این ڈی پی اور پی این پی کے راہنماؤں سے مسلسل رابطہ قائم کیا تاکہ وسیع سامراج دشمن، جاگیردار مخالف جمہوری محاذ از سرِ نو تشکیل ہو۔ اور دوسری طرف محنت کشوں کی سیاسی جماعت کی تعمیر پر زور دیا۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی سمجھتی ہے کہ وہ سیاسی جماعتیں جن کا سیاسی منتہائے مقصود ڈیموکریسی ہے اگر ایک نئی پارٹی بنانے پر اتفاق کر لیں تو یہ وسیع محاذ کی تشکیل کے لئے سودمند ہوگا۔ ایسی پارٹی یا پارٹیوں کے ساتھ سوشلسٹ پارٹی ہر وقت متحدہ محاذ بنانے کے لئے تیار ہے۔ یہی طریقہ کار ہے جس سے کم سے کم باہمی تضادات پیدا ہوں گے اور عوام کے سیاسی شعور کو بلند اور منظّم کرنے میں مدد ملے گی۔ ہم الناد دوستوں سے متفق نہیں جو وسیع محاذ کے نام پر محنت کشوں کی سیاسی جماعت کا کام کل پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

7

''پاکستان کئی قوموں کا ملک ہے۔ ہر قومیت کی اپنی تہذیب و تمدن زبان و ثقافت ہے۔ یہ قومیتیں ملک کے مختلف حصوں میں بستی ہیں۔ پنجاب میں بسنے والے اپنی آبادی کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی قومیت ہیں۔ اپنی آبادی اور زرخیز اراضی کے باعث پنجاب کو دوسری قومیتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ پاکستان کی فوج اور نوکر شاہی میں بھی پنجاب کو برتری حاصل ہے۔ نیم سرمایہ دارانہ اور جاگیرداری طرزِ معیشت کی بدولت تمام علاقوں اور قومیتوں کی برابر ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بلوچستان اور اندرون سندھ کے بعض علاقے تو انتہائی پچھڑے ہوئے اور پسماندہ ہیں۔ ان علاقوں میں نوآباد زرعی اراضی کا بڑا حصہ ان بڑے سرکاری افسروں اور فوجی جرنیلوں کو حاصل ہوا ہے جو نہ تو وہاں کے رہنے والے ہیں اور نہ ہی خود کاشت کرتے ہیں۔ بلوچستان سے گیس حاصل ہوتی ہے مگر اس گیس کا مفاد زیادہ تر بلوچستان سے باہر کے علاقوں نے اٹھایا ہے۔ یوں تو پاکستان بھر میں صنعتی ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم جس قدر صنعتی ادارے قائم ہوئے ہیں وہ زیادہ تر پہلے سے ترقی یافتہ علاقوں یعنی پنجاب اور کراچی وغیرہ میں قائم ہوئے ہیں۔ اس معاشی اور سماجی صورتِ حاصل پر جو سیاسی ڈھانچہ استوار ہوا ہے اس میں بھی بالادستی نسبتاً ترقی یافتہ

قومیتوں ہی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ ہمارے ملک کا ایک اہم مسئلہ قومیتوں کے معاشی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کا بھی ہے۔

''قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ پہلی مرتبہ اس وقت سنگین شکل اختیار کر گیا جب مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی گئی۔ مختلف علاقوں میں بسنے والی قومیتوں کے حقوق کی پامالی کا نتیجہ تھا کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ہو گیا۔ دوسری مرتبہ یہ مسئلہ اس وقت شدید صورت میں ابھرا جب 1973 میں بلوچستان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور اس طرح صوبائی خودمختاری کی وہ محدود شکل جو 1973ء کے آئین میں طے کی گئی تھی خود آئین بنانے والوں نے ختم کر دی اور اب آٹھ سالہ مارشل لاء کے تحت مرکزی متشددانہ اختیار کے استعمال کے ذریعے اور پھر آئین میں ترامیم کے ذریعے وفاق کے رہے سہے تصور کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ یہی حالات ہیں جو کنفیڈریشن اور خودمختاری کے تصورات کو ابھارنے کا باعث ہیں۔

''پاکستان سوشلسٹ پارٹی تمام قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اس کے نزدیک پاکستان میں بسنے والی ہر قومیت کو معاشی اور سیاسی سطح پر برابر کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں اور اس کے لیے آئینی اور سیاسی تحفظات کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر قومیتوں کو متحد رکھنے کا دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے بغیر ملک کے ہر حصے اور ہر قومیت کو خودمختار اور ترقی یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ فوری طور پر ضروری ہے کہ فیڈریشن کی بنیاد ایک ایسے پارلیمانی آئین پر رکھی جائے جس پر مرکز کو صرف دفاع، امور خارجہ بشمول خارجہ تجارت اور کرنسی کے اور کوئی اختیار نہ ہو۔ تاہم پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک قومیتوں کے حقوق کی جدوجہد پاکستان کے موجودہ استحصالی جدید نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی جدوجہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جو امریکی سامراج، مقامی نوکر شاہی، جرنیل شاہی، جاگیردار، وڈیرے اور سردار اور غیر ملکی سرمائے سے وابستہ سرمایہ داروں کے مفاد ہی کی پرورش کر سکتا ہے۔ قومیتوں کا استحصال اور پس ماندگی اس نظام کا حصہ ہے۔ قومیتوں کے حقوق کا معاملہ محض آئینی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا حل جاگیرداروں اور اوپری طبقات کی قیادت میں لڑی جانے والی کسی تحریک سے ممکن ہے۔ ایسی تحریکات سامراج کے دخل میں اضافہ

کرتی ہیں اور عوام کے وسیع تر اتحاد کو توڑنے کا باعث بنتی ہیں۔

''پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک سامراج اور جاگیرداری مخالف جمہوری جدوجہد کا ایک لازمی عنصر قومیتوں کے حقوق کی جدوجہد بھی ہے۔ یہ جدوجہد پورے پاکستان کے محنت کشوں اور جمہوریت پسند عوام اور سیاسی عناصر کے اشتراک ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے''۔

8

اور اب پاکستان کے آس پاس اور بعض عالمی معاملات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اپریل 1978 میں افغانستان میں انقلاب برپا ہوا وہاں داؤد کی رجعتی حکومت کی جگہ عوامی جمہوری پارٹی کی حکومت قائم ہوئی جس نے افغانستان میں قائم صدیوں پرانے فیوڈل اور قبائلی سماج میں بنیادی اصلاحات کا آغاز کیا ہے۔ اس انقلاب کا استحکام پاکستان پر گہرے اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی سامراج کو افغانستان میں یہ تبدیلی اپنے مفادات کے خلاف نظر آئی۔ اور اس نے افغانستان کے اندر مداخلت اور جارحیت کا پروگرام بنایا۔ پاکستان کی سرزمین پر افغان مہاجروں کو انقلاب دشمن سرگرمیوں اور توڑ پھوڑ اور سبوتاژ کی تربیت کے لئے اڈے قائم کئے اور ان میں ڈالر اور اسلحہ تقسیم کرنے لگا۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے اسے ہر قسم کی سہولت فراہم کی تاکہ افغانستان کے انقلاب کو مستحکم ہونے سے روکا جائے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے پہلے ہی دن سے افغانستان کے انقلاب کی حمایت کی اور اس سے یک جہتی کا اظہار کیا۔ اور پاکستان کے عوام کو اس انقلاب کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا موقف یہ ہے کہ پاکستان افغانستان کی موجودہ انقلابی حکومت سے براہ راست مذاکرات کر کے افغانستان کے مہاجروں کی واپسی کا سیاسی حل تلاش کرے اور افغانستان کی حکومت سے دوستی اور تعاون کی بنیاد پر تعلقات قائم کرے تاکہ اس خطے کو امریکی سامراج کی سازشوں سے نجات حاصل ہو۔

اس خطے میں دوسری اہم تبدیلی ایران کا سامراج دشمن اور شاہ مخالف انقلاب تھا جو افغانستان کے انقلاب کے ایک سال بعد رونما ہوا۔ ایران سے بادشاہت اور امریکی سامراج کے

خاتمے نے اس خطے میں امریکی سامراج کے مفادات پر کاری ضرب لگائی ہے۔ سنٹو نامی اس کا فوجی معاہدہ اور اس کا قابلِ اعتماد دوست شہنشاہ ایران دونوں ختم ہو گئے۔ ایران کا انقلاب گو مشکلات میں گھرا ہوا ہے لیکن رجعتی مُلا اس کے سامراج دشمن کردار کو تبدیل نہیں کر سکے ہیں۔

اس خطے میں ایک اور تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ اس خطے کے سات ملکوں کی ''سارک'' نامی تنظیم کا قیام ہے۔ اس میں اس خطے کے سات ممالک پاکستان، بھارت، نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور مالدیپ شامل ہیں۔ یہ ممالک اپنے مسائل باہمی مذاکرات اور تعاون سے حل کرنے پر رضامند ہوئے ہیں۔ ان ممالک کے مل بیٹھنے اور اپنے مسائل مذاکرات سے طے کرنے سے ان کے مابین موجود شکوک وشبہات دور ہوں گے اور ان کا آپس میں اعتماد بڑھے گا۔ اس صورت حال میں امریکی سامراج کو ان کے درمیان کشیدگی اور بدگمانی پیدا کرنے کے کم مواقع ملیں گے۔ اور اس خطے میں امن کی فضا عالمی امن کو تقویت دے گی۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سامراجی دخل اندازی، ریشہ دوانیوں اور معاشی اور سیاسی تسلط کی ایک بنیاد نو آزاد اور پس ماندہ ممالک کے مابین تنازعات ہیں جن کو ان ممالک کے برسرِ اقتدار گروہ اپنے مفادات کی خاطر جاری رکھتے ہیں۔ اس نیم برعظیم کے ممالک کے درمیان ایسے تنازعات موجود ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی وجہ سے دو جنگیں بھی ہو چکی ہیں۔ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ یہ دونوں ملک اسلحہ کی دوڑ میں مبتلا ہیں۔ پاکستان میں فوج کی بالادستی کا ان حالات سے بھی گہرا تعلق ہے۔ پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان اور دوسرے ہمسایہ ممالک یعنی افغانستان اور سوویت

یونین سے تعلقات بہتر بنائے۔ سامراجی مقاصد کے لئے اپنی سرزمین کو استعمال کئے جانے کے خلاف مضبوط مزاحمت کرے۔ اور ''فرنٹ لائن'' کے نظریئے کو رد کر دے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس نظریاتی اور سیاسی پراپیگنڈہ کا بھرپور جواب دینے کی ضرورت ہے جو رجعتی عناصر اور سامراجی ادارے مسلسل جاری کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے رجعتی اور متعصب عناصر،

مفاد پرست قوتوں اور سامراجی ایجنٹوں کے خلاف مضبوط محاذ قائم کریں۔ اس نیم برعظیم کے ممالک کے پرامن عوام ہی کی قوت سے امن اور آشتی کی فضا قائم ہو سکتی ہے جو کسی بھی بڑی سماجی تبدیلی کے لئے ضروری ہے۔

9

دنیا میں موجود کشیدگیوں جارحیتوں اور اسلحہ کی دوڑ کا ذمہ دار امریکی سامراج ہے جو عالمی سرمایہ داری نظام کا سربراہ بنا ہوا ہے۔ امریکی سامراج اپنے سرمایہ داری نظام کی حفاظت اور ٹرانس نیشنل کمپنیوں کے منافعوں کے اضافے کی خاطر کشیدگی قائم رکھنے اور اسلحہ فروخت کرنے کا سوداگر بن گیا ہے۔ اس کے اسلحہ کے خریدار تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک اور تیسری دنیا کے ممالک ہیں۔ اپنے ہتھیاروں کی فروخت کی خاطر وہ دنیا میں کشیدگی پیدا کرتا ہے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے درمیان موجود کشیدگی سرحدی تنازعات اور اختلافات کی وجہ سے ہیں اور یہ اختلافات سامراجی ممالک جان بوجھ کر پیدا کر گئے ہیں تاکہ انہیں مداخلت کا موقع میسر رہے۔ ان کے درمیان کشیدگی کی دوسری وجہ امریکی سامراج کی سازش اور جارحیت ہے۔ کیونکہ امریکہ ان ممالک میں ہر اس تحریک کا دشمن ہے جو آزادی، استحکام اور عوام کی خوشحالی، سماجی ومعاشی ترقی کے لیے ہو، اور جس کی قیادت عوام کے ہاتھ میں ہو جو ان ملکوں میں معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

امریکہ میں ریگن حکومت کے برسراقتدار آنے سے جارحیت، اسلحہ سازی اور مداخلتِ بے جا کی پالیسی میں شدت آ گئی ہے۔ دیتانت کا جو سلسلہ سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان 70 کی دہائی میں چلا تھا اس کو منجمد کر دیا گیا۔ اسلحہ کے بارے میں معاہدات کو آگے بڑھانے کی بجائے امریکہ نے ان سے روگردانی کی۔ یورپ میں ایٹمی میزائل نصب کرنے کے فیصلے پر عمل درآمد شروع کیا گیا حتیٰ کہ فضا جس پر تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ حق ہے۔ اور جو قبل ازیں جنگی منصوبہ بندی سے آزاد تھی کو بھی جنگی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی گئی اور اس مقصد کے لئے کھربوں روپے کا بجٹ تیار کیا گیا اور وہاں امریکی فوج نے

ڈیرے ڈال دئے۔ ایلسیلوا ڈور کی عوام دشمن حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف جمہوری قوتوں کو کچلنے کے لئے اقدامات کئے گئے۔ چلی کی ترقی پسند جمہوری حکومت کا تختہ الٹوا کر فوجی آمریت کے ذریعے دہشت کا بازار گرم کیا گیا۔ نکاراگوا کی آزاد جمہوری ترقی پسند اور آئینی طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے رجعتی عناصر کو مسلح کر کے مسلسل مداخلت کی گئی۔ افریقہ میں جنوبی افریقہ کی گورے قابضوں کی فاشسٹ حکومت کو ہر قسم کی مدد دی گئی تا کہ وہاں کے افریقی عوام کی جدوجہد آزادی کو کچل سکے۔ نمیبیا کی جدوجہد آزادی کو بھی اسی طرح دبایا جا رہا ہے۔ موزمبیق اور انگولا کی آزاد حکومتوں کو ہراساں کرنے کے لیے کرائے پر حاصل کیے گئے رجعتی عناصر اور ساؤتھ افریقہ کی حکومت کی مدد سے مسلسل کارروائیاں جاری رکھی گئیں۔ افغانستان کے جمہوری انقلاب کو کمزور کرنے کے لئے مسلح مداخلت کا تمام سامان اور حکمت عملی مہیا کی گئی۔ فلسطین کے عوام کو اپنے وطن کے حق سے مسلسل محروم رکھا گیا۔

صدر ریگن نے اپنی صدارت کے ابتدا میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا تھا کہ سوشلسٹ دنیا اور بالخصوص سوویت سے تعلقات بہتر کرنا تو الگ رہا سوشلسٹ کا خاتمہ ان کا مشن ہے۔ وہ محدود پیمانے پر ایٹمی جنگ کو بھی خارج از امکان نہیں سمجھتے تھے۔ اس مہم جو جنگی پالیسی کا دنیا بھر کے امن پسند عوام پر زبردست ردعمل ہوا۔ خود امریکہ میں اور پورے یورپ میں بالخصوص جنگ اور ایٹمی اسلحہ کے خلاف زبردست تحریکیں پیدا ہوئیں۔ بالآخر ریگن، گورباچوف ملاقات کا بندوبست ہوا۔ اور جنیوا مذاکرات میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ایٹمی جنگ سوائے تباہی کے اور کسی طرف نہیں پہنچا سکتی۔ اور امن کے قیام کے لیے مزید مذاکرات ضروری ہیں۔ تاہم امریکی جنگباز گروہ امن کی طرف اس پیش رفت کو ناکام بنانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی امریکی سامراج اور اس کے حواریوں کی طرف سے کسی بھی ملک کے اندر مداخلت اور جارحیت کی مخالفت کرتی ہے۔ وہ عوام کی آزادی، خوش حالی، ترقی اور امن کی جدوجہد کے ساتھ ہے۔ وہ لاطینی امریکہ، وسطی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں امریکی

سامراج کی مداخلت اور جارحیت کی مخالفت کرتی ہے اور ان ملکوں کے عوام سے یک جہتی کا اظہار کرتی ہے۔

وہ ایران عراق جنگ کے خلاف ہے اور اس جنگ کے خاتمے کے لئے ایرانی اور عراقی عوام کی جنگ بند کرانے کی جدوجہد کی حمایت کرتی ہے۔

وہ لبنان کی خودمختاری اور فلسطینیوں کے آزاد وطن کے قیام کی حمایت کرتی ہے۔

وہ عرب صحرائی جمہوریہ کی حمایت کرتی ہے۔ نمیبیا کی آزادی کی جدوجہد میں اس کے عوام کے ساتھ ہے۔ وہ جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے مظالم کی شدید مذمت کرتی ہے اور سیاہ فام اکثریتی آبادی کے جمہوری حقوق کے حصول کی جدوجہد کی حمایت کرتی ہے۔ جہاں اور جس طرح بھی نسل پرستی موجود ہے اس کی مخالفت کرتی ہے۔

وہ نکاراگوا کے انقلاب کی حمایت کرتی ہے اور السلواڈور کے حریت پسندوں کی جدوجہد کے ساتھ ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی امریکہ کے جنگی منصوبوں، ایٹمی ہتھیاروں میں اضافے اور سٹار وار پروگرام کی شدید مخالفت کرتی ہے۔ پارٹی کے نزدیک سوویت یونین اور سوشلسٹ دنیا جنگ کے خلاف ہیں۔ اسلحہ سازی ان کے لئے منافع اور کاروبار کا ذریعہ نہیں بلکہ مجبوری ہے اور اس کے لئے انہیں اپنے عوام کی خوشحالی کے پروگراموں میں کمی کرنا پڑتی ہے۔ اسی لئے دنیا بھر کے سوشلسٹ امن کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے عملی جدوجہد کرتے ہیں۔ اور آج اس جدوجہد میں کروڑوں عوام جو سوشلسٹ نہیں ہیں تندہی سے شریک ہیں۔ پاکستان سوشلسٹ پارٹی سوویت یونین کی امن تجاویز کا خیر مقدم کرتی ہے اور ان کو وقت کے تقاضوں کے عین مطابق قرار دیتی ہے۔

10

اس رپورٹ کی بنیاد پر پاکستان سوشلسٹ پارٹی جو کام تجویز کرتی ہے وہ یہ ہیں:۔

1۔ پاکستان میں فوری طور پر آئین کی مکمل بحالی، مکمل سیاسی آزادی اور سیاسی بنیادوں پر فی الفور انتخابات کی جدوجہد کو تیز تر کرنا۔

2۔ پاکستان سے سامراجی قرضوں اور دوسرے اثرات، جاگیرداری نظام اور اجارہ دار سرمایہ داری کے خاتمہ کے لئے اور ایک جمہوری معاشرے کی تشکیل، کے لیے جدوجہد کو تیز کرنا، اور اس مقصد کے لیے تمام سامراج دشمن، جمہوری پارٹیوں اور عناصر کا متحدہ محاذ بنانا۔

3۔ پاکستان کو ایک سچی وفاقی ریاست بنانے کے لیے تمام قومیتوں کے حق خود اختیاری کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے آئین میں قومیتوں کے سیاسی، معاشی اور سماجی حقوق کے تحفظ کا بندوبست کرنا۔

4۔ پاکستان کے پڑوسی ملکوں سے بہتر اور خوشگوار تعلقات اور نوآبادیاتی نظام کی مخالف آزاد خارجہ پالیسی کے لیے جدوجہد کرنا، ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی خودمختاری، قومی آزادی اور سماجی اور سیاسی جبر کے خلاف تحریکوں کی حمایت کرنا۔

5۔ عالمی سوشلسٹ اتحاد اور عالمی سوشلسٹ تحریک سے یک جہتی کے لئے جدوجہد کرنا

6۔ پاکستان کو قومی طور پر سامراج سے آزاد کروانے اور جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد صحیح جمہوری ریاست میں تبدیل کرتے ہوئے سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر کی طرف گامزن ہونا، اور اس مقصد کے لئے تمام ایسے عناصر کے اتحاد کی کوشش کرنا جو محنت کشوں کے فلسفہ اور سائنسی سوشلزم کی بنیاد پر سیاست کرتے ہیں۔

7۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے اپنی پارٹی کو نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے مضبوط تر کرنا، عوام میں اس کی جڑوں کو پھیلانا، مزدوروں، کسانوں اور تمام محنت کش طبقات کو طبقاتی تنظیموں میں منظّم کرنا، طلباء خواتین، اساتذہ اور دوسرے نچلے اور درمیانہ طبقے کے شہریوں اور دانشوروں کو سماجی اور سیاسی بنیادوں پر منظّم کرنا اور ان سب کو رجعتی تصورات اور سماجی اور سیاسی نظریات سے آزاد کر کے ترقی پسند خیالات سے لیس کرنا۔

عشاق کے قافلے سیریز کی دستیاب کتابیں

1۔مزدک	300روپے
2۔شاہ عنایت	100روپے
3۔شاہ لطیف	200روپے
4۔تھامس پین	300روپے
5۔مستیں توکلی	500روپے
6۔یوسف عزیز مگسی	500روپے
7۔عبدالعزیز کرد	300روپے
8۔ماؤزے تنگ	زیرطبع، دوم
9۔ہوچی منہ	زیرطبع، دوم
10۔فیڈل کاسٹرو	400روپے
11۔بابو شورش	زیرطبع، دوم
12۔گل خان نصیر	زیرطبع، سوم
13۔سی آر اسلم	300روپے
14۔بابا بزنجو	200روپے
15۔عبداللہ جان جمالدینی	300روپے
16۔سائیں کمال خان شیرانی	300روپے
17۔سوبھو گیانچندانی	زیرطبع، سوم
18۔ڈاکٹر امیر الدین	300روپے